انتساب

جبل پور (مدھیہ پردیش) کے اس گمنام کارکن کے نام جو دن میں ٹھیلے پر سبزی بیچتا پھرتا ہے اور رات میں واپس آکر تحریک اسلامی کا کام کرتا ہے، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

"نیک متقی اور چھپ کر رہنے والے لوگ جو غائب ہو جائیں تو ان کی تلاش نہ ہو اور اگر موجود ہوں تو پہچانے نہ جائیں۔"

عبید اللہ فہد فلاحی

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

ہندوستان میں دعوت دین اور اشاعت اسلام کی کوششوں کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ اس سرزمین نے اسلام کا جس جوش و جذبے سے استقبال کیا، اگر بھگتی تحریک نے اس لہر کو نہ دبایا ہوتا، تو ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لئے ہندو پاک کی تاریخ پر گہری نگاہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس کتاب میں سلاطین اسلام، صوفیاء و مشائخ، مجددین و داعیان دین، تحریکات و تنظیمات اور بیسویں صدی کی منفرد و ممتاز شخصیتوں کے کارناموں پر گفتگو کی گئی ہے، خاص طور پر ڈاکٹر اقبال، تحریک تبلیغ اور جماعت اسلامی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے کیونکہ یہ اس صدی کا حاصل ہیں اور انہیں کی کوششوں اور مبارک مساعی کی یہ برکت ہے کہ ہندوستان میں دعوت دین اور اقامت دین کی لہر کو کافی تقویت ملی ہے اور آج کا نوجوان طبقہ اسلام کی طرف پلٹ رہا ہے اور اس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رہا ہے۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے دین کے نئے تصور اور ایک جدید فلسفہ کو پروان چڑھایا ہے اور اسلام کا سیاسی و حاکمانہ نقطۂ نظر ان کے اپنے ذہن کی اُپج ہے جس کا تاریخ سے کوئی تعلق ہے نہ ماضی کے واقعات و حالات اس کی شہادت دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ مولانا مودودیؒ کی کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" پر سب سے بڑا اعتراض یہی کیا گیا ہے کہ یہ کتاب قدیم مصلحین و مفکرین کی مساعی سے ہٹ کر ایک نیا فکر اور ان اصطلاحات کا ایک نیا مفہوم پیش کرتی ہے، لیکن قارئین کرام اس کتاب کے مطالعے سے اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہ رہیں گے کہ غلبۂ دین اور اقامت دین کا یہ تصور ہرگز

نیا نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے پس منظر میں اگر گفتگو کی جائے تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہر دور میں اس کے لئے انفرادی یا اجتماعی کوششیں کی گئی ہیں اور دین کو غالب دیکھنے کی تمنا اور آرزو ہر مسلمان کے دل میں ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مساعی بار آور نہ ہوئی ہوں، ظلمتوں کی تیرہ شبی میں انہیں ڈھانک دیا گیا ہو، وہ تحریکیں اپنے اصل مقصد سے بعد میں منحرف ہوگئی ہوں یا مقصد تو صحیح رہا ہو لیکن طریقہ کار میں خامی پائی جاتی رہی ہو یا انفرادی کوششوں میں غیر اسلامی وغیر شرعی رنگ بھی شامل ہو گیا ہو، آپ ان ساری جہتوں سے کتاب و سُنّت کو میزان بنا کر ان پر تنقید کر سکتے ہیں اور ان کا کھرا کھوٹا ہونا ثابت کر سکتے ہیں، لیکن اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا کا مطمح نظر مسلمانوں سے کبھی اوجھل نہ ہوا تھا اور وہ اس سفر کو جاری رکھے ہوئے تھے مولانا مودودیؒ کا کمال یا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان انفرادی و اجتماعی کوششوں کا جائزہ لیا خوبیوں اور خامیوں پر گہری نظر ڈالی، تجدید و احیائے دین کی ان کڑیوں کو مربوط کیا اور ان تمام مساعی کی روشنی میں تحریکِ اسلامی کی بنیاد ڈالی جس نے ماضی کی تمام خوبیوں کو اپنانے کی کوشش کی۔ قدیم تجربات سے فائدہ اُٹھایا اور ماضی کی غلطیوں کو دہرانے سے بچی رہی۔

ماضی کی تحریکات کا جائزہ لینے کی طرف یہ ایک ابتدائی قدم ہے۔ ضرورت ہے کہ ان تمام کوششوں پر تفصیلی اور بالاستیعاب نگاہ ڈالی جائے اور تاریخ کے اوراق میں پوشیدہ موتیوں کو سامنے لایا جائے۔

اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ اس کتاب کو بھی قبولیتِ عام سے نوازے گا تحریکِ اسلامی کو اس سے فائدہ پہنچائے گا اور مُصنّف، ناشر اور جملہ معاونین کو اپنی رضا سے بہرہ ور کرے گا آمین یا ربّ العالمین۔

پیش لفظ

مولانا سید جلال الدین عمری

سکریٹری ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

ہمارے اس برصغیر کو اپنے رقبہ، آبادی اور بعض دوسرے پہلوؤں برعظیم کہنا شاید غلط نہ ہوگا، اس میں بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کا اسلام سے اتنا گہرا اور مضبوط رشتہ ہے اور اس کے ایک ایک خطہ پر اس کے اتنے وسیع اور دور رس اثرات ہیں کہ ان سے صرف نظر کر کے برصغیر کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس برصغیر نے اسلام کا جس بڑے پیمانے پر استقبال کیا ہے اور اس کے ماننے والوں نے جو وسیع اور متنوع خدمات انجام دی ہیں وہ اسلامی تاریخ کا اتنا اہم اور نمایاں حصہ بن چکی ہیں کہ ان کو الگ کر دیا جائے تو اسلامی تاریخ بھی ادھوری اور نامکمل رہ جائے گی۔ اس طرح برصغیر کی اسلامی تاریخ کے مطالعہ کے بغیر صرف یہی نہیں کہ اس کی تاریخ کا حق ادا نہیں ہو سکتا بلکہ خود اسلامی تاریخ کا مطالعہ بھی ناقص اور نامکمل رہ جائے گا۔ برصغیر کی اسلامی تاریخ گوناگوں پہلو رکھتی ہے اور مختلف زاویوں سے اس کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

صحیح رُخ سے مطالعہ

سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ اس کا صحیح رُخ سے مطالعہ کیا جائے غلط رخ سے مطالعہ ہوگا تو نتائج بھی غلط ہی اخذ کیے جائیں گے۔ آئیے ذرا دیکھیں کہ مطالعہ کا غلط رخ آدمی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے

برصغیر اسلامی علوم کا ایک بڑا مرکز رہا ہے اسلامی علوم میں معقولات اور منقولات دونوں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں قرآن، حدیث، فقہ، سیرت، تاریخ اور ادب ہی نہیں منطق، فلسفہ، ریاضی اور طب وغیرہ پر جو کام ہوا ہے اس نے ان علوم کو ایک عرصہ تک جبکہ اسلامی ممالک میں یہ روبہ زوال تھے زندہ رکھا اور اسے آگے بڑھایا۔ اس سلسلہ میں یہاں ایسی علمی خدمات انجام پائیں کہ اسلامی دنیا انہیں نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہاں جو علمی و فکری کوششیں ہوئیں ان میں سے بعض کتاب و سنت کے مطابق نہیں تھ

لہ اس وقت برصغیر کے تین ممالک، ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش پیش نظر ہیں۔

بعض پر ہندی اور عجمی فلسفہ کا اثر تھا، جب ان دونوں کے درمیان فرق نہیں کیا جاتا تو غلط سے غلط اور باطل سے باطل خیالات کو بھی، جن کی اسلام صراحت کے ساتھ تردید کرتا ہے 'اسلامی فلسفہ' قرار دے دیا جاتا ہے اور ان کے علمبردار اسلامی فلاسفہ اور حکماء تصور کیے جانے لگتے ہیں اس لیے اس پورے علمی کام کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لینا چاہیئے کہ اس میں خالص اسلامی رنگ کس حد تک ہے اور کہاں یہ رنگ دھندلا پڑ گیا یا ختم ہو گیا۔ اس کے بغیر ان کی اسلامی قدر و قیمت متعین نہیں کی جا سکتی۔

جس طرح اسلام کے ماننے والوں سے فکری لغزشیں ہو سکتی ہیں اسی طرح ان سے سیرت و کردار اور عمل کی غلطیوں کا بھی امکان ہے اسلام نے عبادات اور اخلاق سے لے کر معاشرت اور تہذیب و سیاست تک پوری زندگی کو ایک خاص رخ عطا کیا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کے ماننے والے اسی رخ پر چلیں ان کی روش اس کے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے ان کے جس رویہ کی اسلام تائید کرے تو بلاشبہ وہ اسلامی ہو گا لیکن جو رویہ اسلام سے ہم آہنگ نہ ہو اور جسے اسلامی تعلیمات سند جواز نہ دے رہی ہوں اسے کسی طرح اسلام سے جوڑا نہیں جا سکتا۔ لیکن کبھی کبھی اسلام اور مسلمانوں کے عمل کو ایک سمجھ لیا جاتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مسلمانوں کا عمل آگے آگے اور اسلام پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہے یہ غلط انداز فکر اس شخص کو عابد و زاہد بلکہ ولی قرار دے سکتا ہے جو عبادات کو سرے سے چھوڑ کر احوال و مقامات طے کر رہا ہو یا عبادت کے لئے جنگلوں یا غاروں میں جا بیٹھا ہو، حالانکہ نہ ترک عبادت اسلام ہے اور نہ گوشہ گیری اور رہبانیت۔ وہ دونوں ہی کے خلاف ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ رقص و موسیقی کو اسلامی تہذیب کی حیثیت دے دی جاتی ہے اور خالص غیر اسلامی رسوم و رواج کو بھی اسلامی معاشرت کا مقام حاصل ہو جاتا ہے اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ جو فرد سیاسی، سماجی اور معاشرتی پہلو سے جتنا ممتاز ہو اگر وہ اسلام کا نام لے رہا ہے تو اسلام کا اتنا ہی بڑا نمائندہ بن جاتا ہے اور اس کے غلط فیصلے اور غلط اقدامات بآسانی اسلام کی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں حالانکہ یہ بڑی ناانصافی اور علمی بد دیانتی ہے کہ جن اعمال کے مٹانے کے لئے اسلام آیا ہے اور جن سے برات کا وہ بار بار اعلان کرتا ہے انہیں اسلامی اعمال کی حیثیت سے پیش کیا جائے اور جو لوگ ان کا ارتکاب کریں ان کو اسلام کا ہیرو سمجھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو عمل اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق اور ان کے قائم کردہ حدود میں ہو گا وہ اسلامی ہو گا اور اسلامی تاریخ کا جز ہو گا اور جو ان حدود سے خارج ہو گا اسے دنیا چاہے کوئی عظیم کارنامہ ہی کیوں نہ قرار دے اسے کسی طرح اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔

اعتراضات اور غلط فہمیوں کا ازالہ

برصغیر کی اسلامی تاریخ کے بارے میں بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے اس پر بعض

شدید اعتراضات کئے جاتے ہیں انہیں دور ہونا چاہئے اس کی وضاحت دو ایک مثالوں سے ہو سکتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کو یہاں کی بہت بڑی آبادی نے قبول کیا بعض بعض خطے پورے کے پورے حلقہ بگوش ہو گئے اور جہاں یہ صورت پیدا نہیں ہوئی وہاں کی بھی قابل لحاظ آبادی نے اسے اپنا لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام اس طرح اپنی خوبیوں کی وجہ سے نہیں پھیلا بلکہ مسلمانوں، خاص طور پر ان کے حکمرانوں کے جور وظلم سے ڈر کر اسے اختیار کر لیا گیا۔ یہاں کی آبادی نے برضا و رغبت اسلام کو سینے سے نہیں لگایا بلکہ جبر و تشدد کے ذریعہ سے ان پر مسلط کیا گیا، مسلمانوں نے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر اس قدر ظلم کیا کہ ان کے لئے اپنے دین و مذہب پر باقی رہنا مشکل ہو گیا اس کے باوجود جنہوں نے ہمت کی ان کے مذہب اور دھرم کو تحریص اور لالچ کے ذریعہ خرید لیا گیا۔ یہ اعتراض کئی وجوہ سے سراسر بے بنیاد اور غلط ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا کہ مسلمانوں نے جبر و تشدد سے اسلام کو قبول کرنے پر کسی کو مجبور کیا ہو

دوسری بات یہ کہ اس اعتراض کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اسلام کو صرف ان خطوں میں پھیلنا چاہئے جہاں مسلمان برسر اقتدار تھے اور ان علاقوں کے لوگوں کو اسے قبول نہیں کرنا چاہئے جہاں مسلمانوں کا اقتدار نہیں تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح شمالی بھارت میں پھیلا، جہاں کہ مسلمانوں کی حکومت تھی، اسی طرح کیرالہ اور مشرقی ساحل کے ان علاقوں میں بھی پھیلا جو مسلمانوں کے حدود اقتدار سے باہر تھے پھر ایک خاص بات ہے کہ جو مسلم علاقے مرکزی حکومت سے جتنا دور تھے جیسے مغرب میں پنجاب اور مشرق میں بنگال اور آسام وہاں اسے اتنا ہی زیادہ فروغ ملا۔

تیسری بات یہ کہ یہ کہنا بھی سراسر زیادتی ہے کہ یہاں کے باشندوں کے لئے اسلام میں کوئی کشش نہیں تھی یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو اسلام اور اس وقت کے برصغیر کے حالات دونوں سے ناواقف ہو اسلام نے توحید، آخرت، مساوات، تقویٰ، طہارت اور پاکیزہ اخلاق و اطوار کا جو تصور پیش کیا ہے اسے یہاں کی سسکتی، بلکتی، طبقاتی کشمکش اور رسوم و رواج کی ماری ہوئی آبادی نے اپنے لئے آب حیات سمجھا اسے اسلام کے سایۂ عاطفت میں وہ سکون اور امن ملا جس کی اسے تلاش تھی اور جس کے بغیر زندگی اس کے لئے وبال بنی ہوئی تھی۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اس اعتراض میں یہاں کے علماء صوفیا، تاجروں اور بیشمار خدا کے نیک بندوں کی ان کوششوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو انہوں نے اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں انجام دی ہیں۔ ان کے پاس نہ تو سیاسی طاقت تھی اور نہ تحریص اور لالچ کا سامان۔ البتہ ان کی زندگیاں اسلام کا نمونہ تھیں اور ان میں وہ مقناطیسیت تھی کہ جب وہ اسلام کو لے کر برصغیر کے ایک ایک گوشہ میں پہنچے اور لوگوں نے ان کے اندر تقویٰ، اخلاق، محبت اور ہمدردیوں کو دیکھا تو بے اختیار ان کی طرف کھنچ پڑے۔

پانچویں اور آخری بات یہ کہ انسان کو اپنا مذہب اور دھرم، جان، مال اور دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوتا ہے

اس کے لئے وہ ہر طرح کی قربانیاں دے سکتا ہے اور دیتا ہے اگر ہم کسی فرد کے بارے میں تھوڑی دیر کے لئے یہ تصور بھی کر لیں کہ اس نے خوف یا لالچ کی بنا پر اپنا دھرم چھوڑ دیا تو برصغیر کی اتنی بڑی آبادی کے بارے میں یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ اس نے کسی مجبوری میں اس طرح کا اقدام کیا ہوگا یہ بات بھی بعید از قیاس ہے کہ کسی قوم کے مذہب کو زبردستی بدلا جائے اور وہ اس معاملے میں کسی قسم کی مزاحمت اور کشمکش نہ کرے پھر اس سے بھی زیادہ ناممکن بات یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح دھرم بدلیں وہ اس نئے دھرم کے مخلص اور وفادار بن جائیں حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر سے ایسے مخلص اور وفادار مسلمان اُبھرے اور انہوں نے اسلام کی خاطر اتنی زبردست قربانیاں دیں کہ اسلامی تاریخ ان پر فخر کر سکتی ہے۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ مسلمان غیر ملکی ہیں انہوں نے اسے اپنا وطن نہیں سمجھا چنانچہ ابھی تک وطن سے ان کے تعلق کو چیلنج کیا جاتا رہتا ہے۔ حالانکہ اگر مسلمانوں کو اس بنیاد پر غیر ملکی کہا جائے کہ وہ عرب یا ایران یا افغانستان سے آئے تھے تو ہندوستان کی آرین نسل کو بھی غیر ملکی ہی کہا جائے گا جو کہ وسط ایشیا سے آئے اور یہاں کی دراوڑ آبادی کو جنوب کی طرف دھکیل کر خود آباد ہوئے لیکن اگر غیر ملکی اس معنیٰ میں کہا جائے کہ مسلمانوں نے اس ملک کو اپنا وطن نہیں سمجھا اور دوسرے کسی ملک سے ان کی ذہنی وابستگی رہی تو یہ بھی سراسر غلط ہے اس لئے کہ مسلمانوں نے برصغیر کو اس طرح اپنا وطن بنایا کہ جن علاقوں سے وہ آئے تھے ان کی یاد بھی شاید ان کے ذہنوں سے نکل گئی اور بالآخر یہیں کی خاک کے پیوند ہو گئے۔

کبھی کہا جاتا ہے کہ مسلمان حملہ آور ہیں انہوں نے برصغیر کی دولت و ثروت کو لوٹنے کے لئے اس پر حملے کئے یہاں کی آبادی کا استحصال کیا اور اسے تاراج اور برباد کیا، حالانکہ اگر مسلمانوں کا مقصد لوٹ مار ہوتا تو انہیں یہاں کی دولت ان ممالک کو منتقل کرنی چاہیئے تھی جہاں سے وہ آئے تھے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے یہاں جو کچھ حاصل کیا اسے اسی سرزمین کی فلاح و بہبود پر صرف کیا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی طرح یہاں کی دولت سمیٹ کر نہیں لے گئے۔ اور اسے برباد کر کے کسی دوسرے ملک کو ترقی نہیں دی۔

مسلم حکمرانوں سے شکایت کی حقیقت

اس ذیل میں مسلمانوں کے دور حکومت اور خاص طور پر مسلم حکمرانوں سے یہ شکایت کی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے مذہب کے مخالفین کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ناانصافی کی، اس سلسلے میں بعض بڑی بھیانک کہانیاں بیان کی جاتی ہیں اور بعض اوقات اسے اسلام سے جوڑ ہی دیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں اسلامی نقطۂ نظر سے بہت سی خامیاں تھیں یہاں کا سیاسی نظام کبھی خالص اسلامی نظام نہیں تھا اس لئے اس کی

کسی بھی غلطی کو اسلام کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ برصغیر کے مسلم حکمراں نہ اسلام کے مکمل نمائندے تھے اور نہ انہوں نے کبھی اس کا دعویٰ ہی کیا ان میں اچھے بُرے ہر طرح کے حکمراں تھے یہاں کے غیر مسلم حکمرانوں سے بھی ان کی جنگیں ہوئیں اور وہ آپس میں بھی برسرپیکار رہے۔ انہوں نے اپنے سیاسی مصالح کے تحت ایسے اقدامات بھی کیے جنہیں ہم کسی طرح اسلامی نہیں کہہ سکتے۔

تیسری بات یہ کہ مسلم حکمرانوں کے ظلم و زیادتی کی جو داستانیں بیان کی جاتی ہیں ان کا تعلق زیادہ تر ان کے سیاسی حریفوں سے ہے اس سے قطع نظر کہ وہ مسلم تھے یا غیر مسلم ورنہ انہوں نے دیگر مذاہب کے ساتھ جو رواداری برتی اور ان کے ماننے والوں کے ساتھ جو حُسنِ سلوک کیا اور انہیں جس طرح دولت اور جاگیروں سے نوازا اس کی مثالیں مشکل ہی سے کسی دوسری جگہ مل سکتی ہیں اگر مسلم حکمرانوں کی سیاسی غلطیوں کو بھی اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو ہمیں فراخدلی سے یہ بھی اعتراف کرنا چاہیے اور یہ اعتراف ایک حقیقت کا اعتراف ہوگا کہ ان میں جو خوبیاں تھیں وہ بھی اسلام کی بدولت تھیں حقیقت یہ ہے کہ اسلام ان تمام خوبیوں کی ترغیب اور تعلیم دیتا ہے جو انسان کے لئے سربلندی اور افتخار کا ذریعہ ہیں اور ان تمام بُرائیوں سے روکتا ہے جو اس کے لئے باعث ننگ ہو سکتی ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلم حکمرانوں میں جو خوبیاں تھیں وہ اسلام ہی نے پیدا کیں اور ان میں جو کمزوریاں تھیں وہ اسلام سے انحراف کا نتیجہ تھیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ جن حکمرانوں کی زیادتی کا اس قدر شکوہ یا چرچا کیا جاتا ہے اور جس کی بنیاد پر مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ اسلام کو بھی لعنت ملامت کا مستحق گردانا جاتا ہے ان کی وجہ سے اس ملک کو جو عروج اور ترقی نصیب ہوئی اس سے اس ملک کی تاریخ خالی نظر آتی ہے، انہوں نے یہاں کی زراعت، صنعت، تجارت اور معیشت کو غیر معمولی ترقی دی زبردست رفاہی خدمات انجام دیں۔ مدارس، شفاخانے، سڑکیں اور قلعے اور مسافرخانے تعمیر کیے اس کے ساتھ اس پورے علاقہ کو پہلی مرتبہ سیاسی طور پر متحد و منظم کرنے کی کوشش کی اور اسے صاف ستھری تہذیب اور اعلیٰ تمدن عطا کیا۔ اس طرح مختلف پہلوؤں سے اس ملک کو آگے بڑھایا اور عروج پر پہنچایا، افسوس کہ مسلم حکمرانوں کی زیادتیوں کا ذکر کرنے والے ان احسانات کو بالکل بھول جاتے ہیں بلکہ ان کا تذکرہ بھی انہیں بار گزرتا ہے۔ بہرحال برصغیر کی مسلم تاریخ کا یہ وہ پہلو ہے جس پر مزید تحقیق اور وضاحت کی ضرورت ہے۔

اُمت کے داخلی مسائل اور ان کا حل

پوری دُنیا کی تقریباً ایک چوتھائی مسلم آبادی برصغیر سے تعلق رکھتی ہے اس کے بیشمار تعلیمی، معاشی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل رہے ہیں۔ ان مسائل کو ہمیشہ اس نے اپنے داخلی مسائل سمجھا اور انہیں حل کرنے کی اپنی سی کوشش بھی کرتی رہی یہاں بعض کوششوں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

(۱) اسلام نے زندگی کا ایک خاص تصور دیا ہے جو اپنے ماننے والوں کو انفرادیت عطا کرتا ہے برصغیر کے مسلمان جب کبھی کسی غیر اسلامی فلسفہ سے متاثر ہوئے یا ان کی تہذیب، معاشرت اور طور طریقوں میں غیر اسلامی عناصر داخل ہوئے تو اس کی اصلاح کی بھی مسلسل کوششیں ہوتی رہیں۔

(۲) یہاں ہر دور میں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور ذہنی و فکری نشو و نما کے لئے مکاتب و مدارس اور علمی و تحقیقی شعبے وجود میں آئے سماجی فلاح و بہبود کے بہت سے کام ہوئے یتیم خانے ہسپتال مسافرخانے اور اسی نوعیت کے دیگر رفاہی ادارے قائم ہوئے صنعت و حرفت کے مراکز تشکیل پائے یہ سب کام اتنے بڑے پیمانے پر ہوتے ہیں کہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا نمایاں حصہ بن چکے ہیں۔

(۳) برصغیر میں دعوت و تبلیغ کا کام بھی ہوتا رہا اور اس بات کی بھی کوشش ہوتی رہی کہ اللہ کا دین غالب آئے اور پوری زندگی اس کے تابع ہو جائے اس کے لئے انفرادی طور پر بھی جدوجہد کی گئی۔ انجمن، ادارے اور تنظیمیں بھی وجود میں آئیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے اندر ہونے والے ان تمام کاموں کا خالص اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ یہ ٹھیک اسلامی خطوط پر ہوا یا اس میں کہیں فکری و عملی انحراف بھی پایا گیا، پھر یہ کہ یہ سارے کام کن حالات میں انجام دیتے گئے ان حالات میں وہ کس حد تک موزوں تھے اور ان کے کیا نتائج نکلے اگر مطلوبہ نتائج نہیں نکل سکے تو اس کے کیا اسباب تھے یہ جائزہ اس انداز سے ہونا چاہیئے کہ وہ مستقبل کے لئے ایک نیا لائحہ عمل بن سکے۔

اس میں شک نہیں کہ برصغیر کی اسلامی تاریخ کے بعض پہلوؤں پر بڑا اچھا کام ہوا ہے جو اپنی تلاش اور محنت کے لحاظ سے بڑا قابل قدر ہے لیکن اس پر بالعموم غیر اسلامی نقطۂ نظر غالب ہے جن لوگوں نے اسلامی نقطۂ نظر سے یہ کام کیا ہے ان کے اندر ماضی کا تنقیدی جائزہ لینے کی ہمت اور صلاحیت کی کمی محسوس ہوتی ہے، برصغیر کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ ابھی اس پہلو سے باقی ہے کہ اسلام جس فکر و عمل کو حق کہے اسے حق کہا جائے اور جسے باطل کہے اسے باطل کہا جائے۔ غلط فہمیوں کو دُور کیا جائے، اعتراضات کا جواب دیا جائے اس کے ساتھ حقیقی کوتاہیوں کو تسلیم کرنے میں تامل بھی نہ کیا جائے۔

برادرم جناب عبیداللہ فہد فلاحی اب تک ہمارے سامنے ایک مترجم کی حیثیت سے آتے رہے ہیں اور وہ کئی ایک قابل قدر کتابوں کا عربی سے اردو میں ترجمہ کر چکے ہیں یہ ان کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے جس میں انہوں نے برصغیر کی تبلیغی اور اصلاحی کوششوں کا جائزہ لیا ہے ان کا نقطۂ نظر خالص اسلامی ہے اور انہوں نے کسی جانب داری اور تعصب کے بغیر برصغیر کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے مطالعہ کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کر دیا ہے انہیں ہمدردی اور دلچسپی اپنے موضوع سے ہے اس لئے انہوں نے کسی فرد یا گروہ کی نہ تو بے جا حمایت کی ہے اور نہ اندھی مخالفت، بلکہ جہاں کہیں اپنے موضوع سے متعلق مواد ملا ہے اسے انہوں نے بلا تکلف لے لیا ہے ان کی اس کوشش میں ہو سکتا ہے کمیاں بھی ہوں لیکن اس کے باوجود خوشی ہے کہ ان کا سمت سفر صحیح ہے۔ امید ہے وہ اس پر چل کر اور بہتر چیزیں پیش کر سکیں گے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت سے نوازے اور اس کے اجر و ثواب سے ان سطروں کے لکھنے والے کو بھی محروم نہ رکھے۔

(مولانا) سید جلال الدین عمری

تعارف

ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، تنگ نظر مخالفین نے بھی لکھا ہے اور فراخ دل موافقین نے بھی، سلاطین و امراء کے حالات بھی قلم بند کئے گئے ہیں اور صوفیاء و مشائخ کے تذکرے بھی، واقعات و حوادث بھی جمع کئے گئے ہیں اور جنگ و جدل کے کارنامے بھی، غرض تہذیب و تمدن کے تمام پہلوؤں پر قلم اُٹھایا گیا ہے لیکن اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ ہندوستان کی تاریخ کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے اور قرآن و حدیث کے تابناک اصولوں کی روشنی میں کھرے اور کھوٹے کو الگ کیا جائے نری جذباتیت اور بے جا عقیدت سے پرہیز کیا جائے اور اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ دعوتِ دین اور اشاعت اسلام کے نقطۂ نظر سے کتنا کام ہوا ہے اور کتنا کرنا ہے۔ جو کچھ کام ہوا ہے وہ کس حد تک صحیح ہوا ہے اور غلطی و کوتاہ بینی کا بھی اس میں دخل تھا یا نہیں، الغرض غیر جانب داری سے کام لے کر تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالنا وقت کی اہم ضرورت تھی تاکہ ہندوستان میں دعوت دین کے ماضی، حال اور مستقبل پر صحیح پس منظر میں غور کیا جا سکے، ماضی کی غلطیوں سے بچا جا سکے اور مستقبل کے سلسلے میں صحیح منصوبہ بندی کی جا سکے۔

زیر نظر کتاب اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ترتیب دی گئی ہے، مصنف اس میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے اس کا فیصلہ تو قارئین کریں گے البتہ اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ یہ کتاب تحقیق و تنقید کے اصولوں کو ملحوظ رکھ کر لکھی گئی ہے اور حتی الامکان ایمانداری اور دیانت داری سے کام لیا گیا ہے۔ تاریخ کی ترتیب میں کسی قسم کے تعصب، جانب داری یا جھکاؤ کا دخل نہیں ہو سکا ہے۔ برادر عزیز عبید اللہ فہد فلاحی ایک نوجوان مترجم کی حیثیت سے کافی معروف ہیں۔ اب تک اُن کے عربی کی دس بارہ کتابوں کے سلیس اردو ترجمے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ عربی، انگریزی اور فارسی زبانوں پر کامل دستگاہ حاصل ہونے کی وجہ سے انہوں نے اصل ماخذ و مراجع سے استفادہ کیا ہے اور اس سے کتاب

کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کے مطالعہ سے دعوت دین کی نئی سمتیں اُجاگر ہوں گی، ماضی کے روشن میناروں سے ہم اکتساب کر سکیں گے اور دعوتِ دین اور خدمتِ اسلام کی جدوجہد میں اس سے رہنمائی حاصل کر سکیں گے۔

اس کتاب میں دعوت دین کے سلسلے میں سلاطین و امراء کی مساعی کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور صوفیاء اور مشائخ کی تعلیمات اور خاموش خدمات کا بھی۔ آزادئ وطن اور اقامت دین کے لئے وقتاً فوقتاً جو تحریکات اُٹھتی رہی ہیں، ان پر بھی گفتگو کی گئی ہے اور انفرادی کوششوں اور بیسویں صدی کے اسلامی مفکرین کے ذکر کے ساتھ ساتھ مجددِ دینِ ملت کے کارناموں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے نیز بیسویں صدی میں خدمت دین کے لئے جو تحریکات اُٹھیں، ان پر بھی سیر حاصل کلام موجود ہے۔ اس بنا پر یہ کتاب ہندوستان میں خدمت دین کی کوششوں کا ایک ہمہ جہتی جائزہ ہے مجھے امید ہے کہ اس کتاب کو قبول عام حاصل ہوگا اور اہل علم و دانش بھی اسے شرف پذیرائی بخشیں گے۔

مجھے مصنفِ عزیز سے صرف یہ کہنا ہے کہ اس راہ میں مزید کوہ کنی درکار ہے اس لئے کہ یہ وہ بحرِ ذخار ہے جس کی گہرائیوں کا پتہ چلانا مشکل ہے۔ اس کتاب کا ایک ایک باب مستقل تصنیف چاہتا ہے اس لئے امید ہے کہ وہ انہیں ہی اپنا موضوع بنائیں گے اور قارئین ان سے فیضیاب ہوتے رہیں گے، قارئین سے درخواست ہے کہ دُعا میں مُصنف کے ساتھ مجھ ناچیز کو بھی شامل فرمائیں۔

والسلام

(پروفیسر) محمد اقبال انصاری

مُقدّمہ کتاب

اسلام ——— نظریہ اور تحریک

نظریۂ اسلامی کی خصوصیات

دین و دُنیا کی سیکولر تقسیم کا یہ نتیجہ ہے کہ مُسلمان اسلام کو نکاح و طلاق، وضو اور غسل، عبادات اور اخلاق تک محدود سمجھنے لگے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک مکمل نظریہ حیات ہے جو عبادات و تسبیحات معاشرت و سیاست، تعلیم و ثقافت، اخلاق و اقدار، اجتماعیت و انفرادیت غرضیکہ زندگی کے تمام شعبوں میں مکمل رہنمائی دیتا ہے۔ یہ تو عیسائیت کی مجبوری رہی ہے کہ وہ پہاڑی کے چند مواعظ سُنا کر انسانوں کو اجتماعی معاملات میں آزاد چھوڑ دیتی ہے، لیکن اسلام آغازِ دعوت سے غلبہ دین تک ہمہ وقت میدان عمل میں موجود رہا اور رسول اکرمؐ نے باقاعدہ اسلامی ریاست قائم کر دکھائی جس کی بنیاد قرآن و سُنّت کی اسلامی تعلیمات پر تھی اور جہاں اسلام کا مکمل نظام زندگی نافذ اور جاری تھا۔

دین و دنیا کی وحدت

اسلامی نظریہ کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ دین و دُنیا کی تقسیم کو ختم کر کے ان میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ یہاں نہ ترکِ دُنیا اور رہبانیت کی اجازت ہے نہ دُنیا پرستی اور پرستشِ زر کی۔ اسلام دین و دنیا کی تقسیم کو غیر الٰہی نظریہ قرار دیتا ہے۔ یہ مغربی فلسفہ کی بنیادی کمزوری ہے کہ یہاں رُوح اور مادہ کے درمیان تضاد ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مذہب کا عمل دخل زندگی سے کٹ کر رہ گیا ہے اور پوری دنیا شیطان کی جولانگاہ بن کر رہ گئی ہے۔ اسلام تو تمام انسانوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ:

ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۔

(البقرہ : ۲۰۸)

(اے ایمان لانے والو تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔)

یہاں صاف صاف کہا جارہا ہے کہ کسی استثناء اور تحفظ کے بغیر پوری زندگی کو اسلام کے تحت لے آؤ۔ تمہارے خیالات، تمہارے نظریات، تمہارے علوم، تمہارے طور طریقے، تمہارے معاملات اور تمہاری سعی وعمل کے راستے سب کے سب بالکل تابع اسلام ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مختلف حِصّوں میں تقسیم کر کے بعض حصّوں میں اسلام کی پیروی کرو اور بعض حصّوں سے اس کی پیروی کو مُستثنیٰ کرلو۔

بلکہ قرآن اس روش کو منافقت سے تعبیر کرتا ہے۔ سورہ محمدؐ میں منافقین، جو ایک طرف ایمان کے مُدعی تھے اور دوسری طرف مخالفین اسلام کے ساتھ بھی ان کا ساز باز تھا، ان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿﴾ (محمد: ۲۶)

(یہ اس وجہ سے ہے کہ ان منافقین نے ان لوگوں سے جنہوں نے اللہ کی اُتاری ہوئی چیز کا بُرا منایا، یہ کہا کہ ہم بعض معاملات میں آپ ہی لوگوں کی طرح پیروی کریں گے۔ اللہ ان کی رازداری کو خوب جانتا ہے۔)

چنانچہ اسلام نے حکم دیا کہ بغیر کسی استثناء اور تحفظ کے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں داخل ہو جائیں۔ کامل اطاعت کا یہی راستہ امن وعدل کا راستہ ہے اور اسی راستہ پر چلنے والوں کے لئے فوز وفلاح ہے۔

قرآن ہمیں اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ ہم دُنیا و آخرت دونوں کو سنواریں اور ان میں سے کسی کو نظرانداز نہ کریں سورہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (بقرہ: ۲۰۱)

(اے ہمارے رب ہمیں دُنیا میں بھی کامیابی عطا فرما اور آخرت میں بھی۔)

اس دُعا کے ذریعہ قرآن نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ اپنے رب سے دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی طلب کریں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جو دُعا سکھائی ہے اس سے دین ودنیا کی وحدت کا یہ نظریہ بالکل عیاں ہو کر سامنے آجاتا ہے آپ نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ لِيْ دِيْنِيَ الَّذِيْ هُوَ عِصْمَةُ اَمْرِيْ وَ اَصْلِحْ لِيْ دُنْيَايَ الَّتِيْ فِيْهَا مَعَاشِيْ وَ اَصْلِحْ لِيْ آخِرَتِي الَّتِيْ فِيْهَا مَعَادِيْ

وَاَحْیِنِیْ مَاکَانَتِ الْحَیٰوۃُ خَیْرًا لِّیْ وَتَوَفَّنِیْ مَاکَانَتِ الْوَفَاۃُ خَیْرًا لِّیْ وَاجْعَلِ الْحَیٰوۃَ زِیَادَۃً لِّیْ فِیْ کُلِّ خَیْرٍ وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَۃً لِّیْ مِنْ کُلِّ شَرٍّ (حصن حصین)

(اے اللہ! تو میرے دین کو میرے لئے سُدھار دے کہ وہ میرے معاملات کی ڈھال ہے اور میرے لئے دُنیا کو سُدھار دے کہ اس میں میری معاش ہے اور میرے لئے آخرت کو سُدھار دے کہ اس کی طرف مجھے لوٹ کر جانا ہے اور مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک زندگی میرے لئے باعثِ خیر ہے اور مجھے موت دے جبکہ موت میرے لئے اچھی ہو اور زندگی کو میرے لئے ہر نیکی میں اضافہ کا موجب بنا اور موت کو میرے لئے ہر بُرائی کے مقابلے میں موجب راحت بنا۔)

یہ نصوص اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اسلام کا نظریۂ زندگی دین و دُنیا دونوں کو محیط ہے اور دونوں کی صلاح و فلاح چاہتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ آخرت کی کامیابی اس دُنیا کے بہترین استعمال اور رضائے رب کے حصول پر ہے۔ یہاں طبرانی کی وہ حدیث نقل کرنا مناسب ہوگا جو اس موقف کی بہترین ترجمان ہے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنْ سَعٰی عَلٰی وَالِدَیْہِ فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، وَمَنْ سَعٰی عَلٰی عَیَالِہٖ فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَمَنْ سَعٰی عَلٰی نَفْسِہٖ لِیُعِفَّھَا فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَمَنْ سَعٰی عَلَی التَّکَاثُرِ فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ الشَّیْطَانِ (طبرانی)

(جو والدین کے لئے محنت کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے۔ جو اہل و عیال کے لئے محنت کرتا ہے وہ بھی اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے جو اپنی ذات کو فقر و فاقہ سے بچانے کے لئے کام کرتا ہے وہ بھی اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے اور جو دولت سمیٹنے کے لئے کام کرتا ہے وہ شیطان کی راہ میں کام کرتا ہے۔)

ثبات و تغیر کے درمیان مکمّل توازن

اسلامی نظریہ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جمود نہیں ہے کہ حالات و ضروریات کی رعایت سے آنکھ بند کرلے نہ محض تغیر ہے کہ اس کی کوئی ابدی اساس ہی نہ رہ جائے اور ہوا کے ہر جھونکے پر یہ تنکا ثابت ہو یہاں ثبات اور تغیر کے درمیان مکمّل توازن ہے۔ اس نے زندگی کے ابدی اصول پیش کئے ہیں جن میں کوئی ترمیم و اضافہ ممکن نہیں ہے دوسری طرف انسانی معاشرہ میں جو فطری

تغیرات آتے ہیں ان سے پیش آمدہ مسائل کا حل بھی اس میں موجود ہے۔

اسلام کے اصول ابدی اور ناقابل ترمیم ہیں ان میں تبدیلی، حذف یا اضافہ کا حق کسی فرد یا گروہ کو نہیں ہے:

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

(یونس: ۶۴)

(اللہ کی باتیں بدلتی نہیں ہیں یہی تو بڑی کامیابی ہے۔)

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہے کہ یہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ بھی دیتا ہے کیونکہ اس نظریہ میں:

(۱) انسان کے لئے وہ ابدی اور بنیادی اصول فراہم کئے گئے ہیں جو اس کی فطرت کے مطابق ہیں۔ اور انسان کی فطرت میں زمانہ قدیم سے لے کر آج تک تہذیبوں کے عروج و زوال اور ماہ و سال کی آمد و رفت کے باوجود کوئی تبدیلی نہیں آسکی ہے۔

(۲) اس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں فراہم کی گئی ہیں، جن چیزوں کا تعلق وقت، موسم اور مقامی حالات سے ہے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے اور ہر زمانے کے انسانوں کو شریعت کی مجموعی تعلیمات کی روشنی میں تفصیلات طے کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

(۳) اس نظریہ کی اصل دلچسپی انسان کی ہدایت و ضلالت سے ہے — قرآن انسانی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے، سائنس یا جغرافیہ کے مسائل بیان کرنے کے لئے نہیں۔ اسی لئے یہ نظریہ علوم طبیعی سے تعرض نہیں کرتا اور انہیں انسان کے تجربات و مشاہدات پر چھوڑ دیتا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

"من جملہ سیرت انبیاء علیہم السلام کے ایک یہ ہے کہ جن باتوں کا تعلق نفیاً یا اثباتاً تہذیب نفس اور تزکیہ رُوح یا سیاست اُمت کے ساتھ نہیں ان میں وہ خوض نہیں کرتے مثلاً کائنات الجو (یعنی وہ مناظر جو فضا میں نظر آتے ہیں، مثلاً بجلی کا کوندنا، بادل اور بارش، برف، طوفان، شہابوں کی حرکت وغیرہ) کے ظہور میں آنے کے اسباب و علل، کسوف اور خسوف کی حقیقت یا بالفاظ دیگر نظام شمسی کی کیفیت، نباتات اور حیوانات کے انواع و اقسام اور ان کے وہ خصائص وغیرہ جن کا جاننا ترقی تمدن کا باعث ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ)

اسلامی نظریہ کے اس طریقہ کار اور دائرہ عمل نے مذہب اور سائنس کے درمیان ہر قسم کے تصادم کے

امکانات ختم کر دیتے ہیں۔ ان میں تبدیلی و ترمیم کی پوری گنجائش موجود ہے اور ان کے ارتقاء میں اسلام کوئی رُکاوٹ نہیں ڈالتا۔ اس طرح اسلام نے ثبات اور تغیر کے درمیان حسین توازن قائم کیا ہے۔

تدریج اور فطری رفتار کار

اسلامی نظریہ کی ایک اہم خصوصیت ہے کہ وہ تدریج اور فطری طریقہ کار کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اور انسانوں کی سہولت کو اپنے نظامِ عمل کی تنفیذ میں پیش نظر رکھتا ہے اس لئے کہ اس کا کام مشکلات و مصائب اور غیر ضروری بندشوں سے نکالنا ہے۔ سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ (اعراف: ۱۵۷)

(محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں، بدی سے روکتے ہیں، ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتے ہیں اور ان پر سے وہ بوجھ اُتارتے ہیں جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتے ہیں جن میں جکڑے ہوئے تھے)

یعنی یہودیوں کے فقیہوں نے اپنی قانونی موشگافیوں سے، راہبوں نے اپنے زُہد کے مبالغوں سے اور جاہل عوام نے اپنے توہمات اور خود ساختہ حدود و ضوابط سے ان کی زندگی کو جن بوجھوں تلے دبا رکھا ہے اور جن جکڑبندیوں میں کس رکھا ہے یہ پیغمبر وہ سارے بوجھ اُتار دیتا ہے اور وہ تمام بندشیں توڑ کر زندگی کو آزاد کر دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں آسانی اور سہولت کو مدِنظر رکھا گیا ہے۔ اور یہی سہولت کی حکمت تھی جیسے نماز، زکوٰۃ، حرمتِ شراب، حرمتِ سود وغیرہ بے شمار احکام کی تنفیذ میں ملحوظ رکھ کر تدریج کا طریقہ اختیار کیا گیا تاکہ انسان عبادتِ الٰہی کے خوگر ہو سکیں۔ خود تحریکِ اسلامی کے نشو و نما کی جو کیفیت قرآن میں بیان ہوئی ہے اس میں تدریج اور فطری ارتقاء پر زور دیا گیا ہے۔ سورۂ فتح میں فرمایا:

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۖ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا ۖ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۚ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ

الْكُفَّارِ۔ (فتح : ۲۹)

(محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب انہیں دیکھو گے رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں یہ ہے ان کی صفت تورات میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر اس کو سہارا دیا، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی، کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔)

زندہ اور متحرک ایمان

اسلامی نظریہ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ انسان کے دل و دماغ میں انقلاب پہلے پیدا کرتا ہے اور خارج میں بعد میں از خود اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسرے خود ساختہ نظریات کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ خارج میں تبدیلی کا منصوبہ تو پیش کرتے ہیں لیکن اندرون سے کوئی بحث نہیں کرتے۔ شاخوں پر تو تیشے چلاتے ہیں لیکن جڑ کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں، پھوڑے پھنسیوں پر نشتر زنی کرتے ہیں، لیکن فساد خون کا علاج نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ برائی ایک جگہ دب جاتی ہے لیکن دوسرے نئے مقامات سے اُبھر آتی ہے لیکن اسلام سب سے پہلے ایمان و اصلاح پر زور دیتا ہے۔ انبیاء اپنی دعوت کا آغاز ایمان سے کرتے ہیں۔ سب سے پہلے اللہ کی محبت اور اس کا خوف دلوں میں بٹھاتے ہیں اور غیر اللہ کی محبت اور خوف کو نکالتے ہیں اور جب اللہ کی محبت دل میں بسیرا بنا لیتی ہے تو فکر و نظر کا پیمانہ بدل جاتا ہے سوچنے سمجھنے کے انداز میں تبدیلی آجاتی ہے، رجحان اور نقطہ نظر تبدیل ہو جاتا ہے اور اس کی پوری شخصیت میں انقلاب آجاتا ہے۔

تحریک اسلامی کا تصور

اسلام محض ایک نظریہ ہی پیش نہیں کرتا بلکہ اس کو قائم کرنے، چلانے اور زمین پر نافذ کرنے کے لئے ایک تحریک بھی برپا کرتا ہے۔ تحریک اس جدوجہد کا نام ہے جو کسی نصب العین کے حصول کے لئے منظم طور پر کی جائے۔ اور تحریکِ اسلامی دین اسلام کو مشن بنا کر اُٹھنے کا نام ہے۔ جب کوئی شخص تن تنہا

بندگی خدا کی دعوت دینے کھڑا ہوتا ہے تو دعوتِ اسلامی کی نفیر عام کا آغاز ہو جاتا ہے اور راہ حق میں ایک قافلہ سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پوری انسانی تاریخ میں تحریک اسلامی ایک ہی پیغام، پروگرام اور لائحہ عمل کی طرف دعوت دیتی چلی آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ہر ہر فرد کو حق کا سپاہی اور راستی کا سفیر بنانا چاہتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو اُمت وسط قرار دیتا ہے اور اس اُمت کی تخلیق کا مقصد ہی یہ قرار دیتا ہے کہ وہ انسانیت کی خیرخواہ بنے، نیکیوں کا حکم دے، برائیوں سے روکے تاکہ خدا کا دین اس زمین پر غالب ہو سکے۔ سورہ آل عمران میں فرمایا:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ (آل عمران: ۱۱۰)

(اب دُنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نیکی کو قائم کرنا، بدی کو مٹانا اور اللہ وحدہ لاشریک کو اعتقاداً و عملاً اپنا الٰہ اور رب تسلیم کرنا، یہ اُمتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے اور اگر اس ذمہ داری کی انجام دہی سے وہ کترائے گی تو یہود سے اس کا حال مختلف نہ ہوگا۔

سورہ مائدہ میں باقاعدہ مسلمانوں کو حکم دیا کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ

(مائدہ: ۸)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔)

یعنی اُمتِ مسلمہ کا کام صرف انصاف کرنا نہیں بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے۔ اسے اس بات پر کمربستہ ہونا ہے کہ ظلم مٹے اور دُنیا میں عدل و راستی قائم ہو۔ سورۃ انفال میں فرمایا:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ۚ

(انفال: ۳۹)

(ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔)

قرآن بتاتا ہے کہ رسول کی بعثت کا مقصد ہی یہ تھا کہ دین اسلام کو تمام باطل ادیان پر غالب کرنے کی جدوجہد کرے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ (حدید: ۲۵)

(ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور لوہا اُتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں، یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو قیام عدل کی محض ایک اسکیم پیش کرنے کے لئے مبعوث نہیں فرمایا تھا بلکہ یہ بات بھی ان کے مشن میں شامل تھی کہ اس کو عملاً نافذ کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ قوت فراہم کی جائے جس سے فی الواقع عدل قائم ہو سکے۔

ان باتوں سے تحریک اسلامی کا ایک مجمل اور مختصر تصور سامنے آجاتا ہے آیئے ہم دیکھیں کہ انبیائی تحریک کی دعوت کیا تھی اور اس کے لئے انہوں نے کیا طریقہ کار اختیار کیا۔

انبیائی تحریک اسلامی

قرآن کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کی دعوت بنیادی طور پر ایک تھی یعنی بندگیٔ رب کی دعوت۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کو نبوت و خلافت عطا کر کے جب دُنیا میں بھیجا گیا تھا تو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک کے لئے ایک مستقل ہدایت بھی انہیں دی گئی تھی جسے قرآن نے دو آیتوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے:

"ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اُتر جاؤ، پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقعہ نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" (بقرہ: ۳۸، ۳۹)

حضرت آدمؑ تحریک اسلامی کے اولین داعی تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد کو توحید اور بندگیٔ رب کی دعوت دی اور ان کی تربیت بھی کی۔ لیکن قابیل نے خدا سے بغاوت اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا اور اپنے دیندار بھائی ہابیل کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا تو اس صالح بندے نے وہی جواب دیا جو تحریک اسلامی کے ایک

ادم کے شایاں ہے۔اس نے کہا:

"اے قابیل، اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ اُٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ اُٹھاؤں گا۔ میں تو اللہ ربّ العالمین سے ڈرتا ہوں" (مائدہ: ۲۶)

حضرت نوحؑ نے کفر و شرک اور اللہ سے بغاوت کے ماحول میں اپنی دعوت کا آغاز کیا اور اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے سرداران قوم! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں" (اعراف: ۴۸)

"میں تمہارے لئے امانت دار رسول ہوں لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔"
(شعراء: ۱۰۷، ۱۰۸)

"اے میری قوم کے لوگو! میں تمہیں کھلے طور پر نصیحت کرتا ہوں کہ خدا کی اطاعت کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہا مانو" (نوح: ۳،۲)

حضرت نوحؑ نے خلوت و جلوت میں اپنی قوم کو سمجھانے کی کوشش کی، اسے ڈرایا بھی اور خوشخبری بھی سنائی لیکن قوم نے مان کر نہ دیا:

حضرت ہودؑ جب تحریک اسلامی کے علمبردار بن کر تشریف لائے تو اپنی قوم سے کہا:

"اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان کے دروازے کھول دے گا اور تمہاری قوت میں اضافہ کرے گا۔ خدا کے بندو، مجرموں کی طرح منہ نہ پھیرو" (ہود: ۵۴)

قوم عاد کے قدوقامت میں جو اضافہ ہوا تھا، تحریک اسلامی کے اس خادم نے انہیں اللہ کی یہ نعمت یاد دلائی:

"اور یاد کرو جب اس نے تم کو قوم نوح کا جانشین بنایا اور تمہارے بدن کے پھیلاؤ میں اضافہ کیا، پس خدا کی نعمت کو یاد کرو تاکہ نجات حاصل کرسکو" (اعراف: ۶۹)

دولت دنیا سے بے جا محبت اور زر پرستی پر اپنی قوم کو لعنت ملامت کی۔ چنانچہ فرمایا:

"یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لا حاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو جبار بن کر ڈالتے ہو پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ڈرو اس سے جس نے تمہیں وہ کچھ دیا ہے جو تم

جانتے ہو، تمہیں جانور دیئے، اولاد دی، باغ دیئے اور چشمے دیئے مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے عذاب کا ڈر ہے" (شعراء : ۱۲۸ تا ۱۳۵)

لیکن قوم نہ مانی اور ہلاک کر دی گئی۔

حضرت صالحؑ نے بھی اپنی قوم کو وہی دعوت دی جو حضرت ہودؑ نے دی تھی۔ فرمایا:

"اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو اس لئے کہ اس کے سوا تمہارا دوسرا کوئی خدا نہیں ہے وہی ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسایا ہے" (ہود : ۶۰)

لیکن قوم کی سرکشی کم نہ ہوئی بالآخر تین دن کی مہلت دے کر تباہ و برباد کر دی گئی۔

حضرت ابراہیمؑ کی جو سرگزشت قرآن میں بیان ہوئی ہے اس کا مطالعہ ہمارے لئے بے حد اہم ہے۔ آپ نے وقت کے سب سے بڑے طاغوت کو للکارا، اسے بندگیٔ رب کی دعوت دی اور قوم کے خود ساختہ بتوں پر زبردست تنقید کی، فرمایا:

"اے میری قوم! میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رُخ صرف اس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں" (انعام : ۷۸، ۷۹)

آخر میں وطن سے ہجرت کی اور احباب و اقارب، دُنیوی مفادات اور خاندانی رشتوں پر لات مار کر خدا کی راہ میں خدا کے حکم پر نکل کھڑے ہوئے! اور یہ ثابت کر دیا کہ تحریک اسلامی کے افراد طاغوت کے سامنے جھکتے ہیں نہ دُنیوی مفادات کے سامنے۔

انبیاء بنی اسرائیل میں حضرت یوسفؑ نے جیل کے دو ساتھیوں کو دین کی دعوت دی اور انہیں سمجھایا کہ:

"اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لئے ہیں، اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نہیں نازل کی ہے فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو یہی سیدھا طریق زندگی ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"

(یوسف : ۳۹، ۴۰)

اس سورہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے پیغمبرانہ مشن کی تبلیغ کے لئے

کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ عزیز مصر کے گھر سے لے کر ایام اسیری کی طویل مدت میں صبر و ضبط، پاک دامنی، تقدس و طہارت، حلم و بردباری، بے مثل اخلاق و کردار اور اپنی بے پایاں صلاحیتوں کا جو ثبوت دیا اس نے انہیں پورے مصر میں مشہور کر دیا اور وہ ایک ایسی شخصیت اُبھر کر سامنے آئے جس کی نظیر پورے مصری معاشرہ میں موجود نہ تھی رہی سہی کسر اس خواب نے پوری کر دی جو بادشاہ مصر نے دیکھا تھا اس طرح حکومت مصر کا تخت ان کے لئے تیار ہو چکا تھا یہی وجہ ہے کہ جب بادشاہ مصر نے مصر کا نظم و نسق سنبھالنے کی پیش کش کی تو اس شرط پر اسے قبول کر لیا کہ ملک کا کلی اقتدار ان کے حوالے کر دیا جائے۔ اس طرح تحریک اسلامی کو غلبہ و تمکن حاصل ہوا اور نظام باطل کا استیصال ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور بنی اسرائیل دونوں کی طرف بھیجے گئے تھے مقصد یہ تھا کہ فرعون شرک و بغاوت چھوڑ کر راہِ راست پر آجائے اور اگر وہ ایمان نہ لائے تو اس سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکل جانے دے۔ سورۂ نازعات میں اللہ تعالیٰ موسیٰ کو حکم دیتا ہے:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ﴿﴾ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿﴾ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿﴾ (نازعات: ۱۷ تا ۲۱)

(فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے کہو کیا تو اس کے لئے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو اس کا خوف تیرے اندر پیدا ہو؟ پھر موسیٰ نے اس کو بڑی نشانی دکھائی مگر اس نے جھٹلایا اور نہ مانا)

یہاں تزکّٰی کا مطلب یہ ہے کہ کیا تو اس کے لئے تیار ہے کہ کفر و شرک سے توبہ کر کے اسلام قبول کرے اور تمام باطل معبودوں کا انکار کر کے ایک خدا کا اقرار کرے۔ اور رب کی طرف رہنمائی کرنے کا مطلب اس کی عظمت اور اس کے جلال کی معرفت پیدا کرنا ہے۔ سورۂ اعراف میں بنی اسرائیل کی آزادی کا ذکر بھی ہے:

"موسیٰ نے کہا، "اے فرعون، میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں، میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں، میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے صریح دلیلِ ماموریت لے کر آیا ہوں لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے"

(اعراف: ۱۰۴، ۱۰۵)

فرعون نے بات نہ مانی اس لئے بنی اسرائیل کی اصلاح و تربیت کے لئے انہیں لے کر ہجرت کا پروگرام بنایا اور خدا کے اشارے پر وہاں سے قوم کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔ فرعون نے پیچھا کیا لیکن دریائے نیل

میں وہ اور اس کی فوج غرقاب ہوگئی اور تحریک اسلامی کے علمبردار نجات پا گئے۔

بنی اسرائیل میں آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تحریکِ اسلامی کے علمبردار بن کر ابھرے۔ قوم کفر و شرک کی آلودگیوں میں لت پت تھی اس لئے وہی دعوت یہاں بھی دی گئی جو نوحؑ، صالحؑ، ابراہیمؑ نے اپنی قوموں کو دی تھی، فرمایا:

"اے بنی اسرائیل! اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔" (مائدہ: ۷۱)

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

"دیکھو میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانیاں لے کر آیا ہوں لہٰذا اللہ کی اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، لہٰذا تم اسی کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔" (آل عمران: ۵۰، ۵۱)

سورۂ صف میں ارشاد ہوتا ہے:

"اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں تصدیق کرنے والا ہوں اس توریت کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔" (صف: ۶)

لیکن بنی اسرائیل نے ان کی زبردست مخالفت کی اور تحریک اسلامی کے اپنے اس آخری داعی کو بھی صلیب پر لٹکانے کا مطالبہ کیا اس پر خداوند نے ان کو آخری تنبیہہ کی:

"یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتا اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ان کو سنگسار کرتا ہے، کئی بار میں نے چاہا جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے سمیٹ لیتی ہے اسی طرح میں تیرے لڑکوں کو سمیٹ لوں مگر تو نے نہ چاہا دیکھ اب تیرا گھر تیرے لئے ویران چھوڑا جاتا ہے۔"

داعی تحریک حضرت عیسیٰ نے انہیں آخری بار خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اے یروشلم کی بیٹیو! میرے لئے نہ روؤ بلکہ اب اپنے اور اپنے بچوں کے لئے روؤ کیونکہ دیکھو وہ دن جلد آتا ہے جب سب کہیں گے مبارک ہیں وہ بانجھیں اور وہ پیٹ۔ جو نہ جنیں اور وہ چھاتیاں جنہوں نے دودھ نہ پلایا اس وقت وہ پہاڑوں سے کہیں گے کہ ہم پر گر پڑو اور ٹیلوں سے کہیں گے کہ ہم کو چھپا لو، لیکن اس روز کسی کو کوئی پناہ نہ

ہوگی" (لوقا۔ باب ۲۳۔ آیت ۲۸، ۲۹)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی تاریخ کبھی تحریک اسلامی کے علمبرداروں سے خالی نہ رہی۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ بنی آدم راہِ راست سے بھٹک گئے ہوں اور انہیں صراطِ مستقیم دکھانے کے لئے اللہ نے کوئی نبی نہ بھیجا ہو۔ تحریک اسلامی ہر دور میں بندگیٔ رب کی دعوت لے کر اٹھتی ہے، باطل کے خلاف مورچہ بندی کرتی ہے اور انسانوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کرتی ہے۔

تحریک اسلامی ــــ بعثتِ نبویؐ کے دور میں

آخر میں تحریک اسلامی کے سب سے بڑے علمبردار سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا سے نکل کر مکہ کی گلیوں میں دعوت اسلامی کی صدا لگاتے ہیں اور پوری سوسائٹی کو کفر و شرک کی آلودگیوں سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی میں لانے کا عزم کرتے ہیں قریش کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

"لوگو، جو تعلیم میں لے کر آیا ہوں وہ نہ طلب اموال کے لئے ہے اور نہ جلب جاہ و شرف یا حصول سلطنت کے لئے۔ بات یہ ہے کہ خدا نے مجھے تمہاری طرف اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ مجھ پر اپنی کتاب اُتاری ہے۔ مجھے اپنا بشیر و نذیر بنایا ہے۔ اگر تم میری تعلیمات کو قبول کر لوگے تو یہ تمہارے لئے دُنیا و آخرت کا سرمایہ ہے اور اگر رد کر دو گے تب میں اللہ کے حکم کا انتظار کروں گا کہ وہ میرے اور تمہارے لئے کیا حکم بھیجتا ہے۔"

قرآن نے اسی دعوت کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں یوں نقل کیا ہے:

"لوگو، بندگی اختیار کرو اپنے اُس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے، تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت میں ہو سکتی ہے" (البقرہ: ۲۱)

چنانچہ حضور اکرمؐ تن من دھن سے اس مشن کی تکمیل میں لگے رہے۔ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں صبر و ثبات کے ذریعہ جاں نثاروں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جو صدق و صفا، ایثار و قربانی اور شجاعت، وغیرہ میں یکتا اور فرد تھے۔ اور جنہوں نے تحریک اسلامی کو کامیابی کے مرحلے تک پہنچایا۔ اس راہ میں طائف کی گلیاں بھی آئیں، بدر و احد کے معرکے بھی آئے، اپنوں کی منافقت اور سازش کا سامنا کرنا پڑا، غیروں کی عداوت اور مخالفت کو بھی جھیلنا پڑا لیکن کہیں تحریک اسلامی کے اس عظیم خادم نے مصالحت اور سودے بازی کی ناپاک غلطی نہ کی۔ ہر موقع پر آپ کا رویہ یہی رہا کہ:

"اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند لا رکھیں تو بھی میں اس کام سے نہیں ہٹ سکوں گا۔ چاہے اس کام میں میری جان ہی چلی جائے۔"

تحریک اسلامی کا یہ عظیم قائد اپنے آخری خطاب میں کہتا ہے کہ:

" لوگو! جاہلیت کے دستور میرے قدموں کے نیچے روند دئے گئے ہیں۔ بے شک تمہارا رب ایک ہی ہے، تمہارا باپ بھی ایک ہی ہے۔ عربی کو عجمی پر اور سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سُرخ پر کوئی فضیلت نہیں ہے مگر تقویٰ کے سبب سے۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سب مسلمان باہمی بھائی بھائی ہیں۔"

اور آخر میں تحریک اسلامی کی تکمیل کا اعلان کر دیا جاتا ہے:

" آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔" (مائدہ: ۳)

تحریک اقامت دین کے لئے اُسوہ

آج اگر کوئی تحریک اقامتِ دین اور غلبہ اسلام کے لئے جدّ وجہد کرنا چاہتی ہے تو اس کے لئے اسوۂ حسنہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلم کی تحریک ہوگی۔ یوں تو ذہن حضرت موسیٰؑ کی طرف بھی جاتا ہے کہ اس وقت کے حالات ہمارے حالات سے کچھ مماثلت رکھتے ہیں اور دونوں ادوار میں کچھ مشابہت پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ موسیٰؑ کی بعثت ایک بگڑی ہوئی مسلمان قوم کے درمیان ہوئی تھی جو غیر مسلم اکثریت اور اس کی جابرانہ حکومت کے ظلم کا شکار تھی لیکن ہمارے لئے اُسوہ سیّدنا محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم اور خلفائے راشدین کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن نے اسی بات کا حکم دیا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيرًا ۝ (احزاب: ۲۱)

(درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخر کا اُمیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے)

رسول اکرمؐ کا طریق کار

رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا انقلابی طریق کار تین بنیادی نکتوں پر مبنی تھا۔

(۱) انقلابی فرد کی تیاری

(۲) خدا ترس، بااخلاق اور انقلابی گروہ کی تنظیم و تربیت۔

(۳) باطل کے خلاف مورچہ بندی۔

آپ نے دین کے بنیادی امور کی دعوت دی، توحید، رسالت اور آخرت کی تعلیمات عوام کے ذہنوں میں بٹھائیں، غیر اللہ سے محبت اور خوف دلوں سے نکال پھینکا، طاغوت سے نفرت اور عداوت کی تعلیم دی اور سارا زور فرد کی انفرادی تربیت پر صرف کیا اس لئے کہ فرد کی اصلاح پر ہی کوئی تحریک یا انقلاب ابھر اٹھ سکتا ہے۔ وہی عمارت کا بنیادی پتھر ہے، وہی جہاد و قربانی کا مرکز ہے۔ وہی جوش و جذبہ کا منبع ہے، اسی کے خون پسینے سے قیام عدل ہوتا ہے، ساری معاشیات، ساری سیاسیات، ساری اجتماعیات اسی کے گرد گھومتی ہیں اس کائنات کا محور و مرکز صرف فرد ہے اور فرد سے بالاتر بس خدا کی ذات ہے۔ چنانچہ آپ نے اسی فرد کو حق پرستی اور جذبہ عبودیت کے رنگ میں رنگنے کا اہتمام کیا۔

پھر آپ نے انقلابی اور خدا ترس افراد کی تنظیم کی۔ اور فرد و معاشرہ اور ہیئت حاکم کے تزکیہ کے لئے انہیں منظم کیا۔ انہیں الگ الگ عقیدہ و مسلک کا عشق دے کر حق کا درس دیا گیا، پھر آزمائش اور امتحان کی بھٹی میں انہیں تپایا گیا اور ایک انقلابی گروہ سے وابستہ کر کے ان کے سامنے ایک عظیم نصب العین رکھا گیا اور اس کے لئے کشمکش، جدوجہد، ایثار و قربانی اور عزیمت و استقلال کے مختلف مراحل سے گزار کر ان کی تربیت کی گئی اور اس طرح وہ تحریک تیار ہوئی جو اپنوں کے لئے بے حد لچکدار اور غیروں کے لئے فولاد تھی۔

حضور اکرمؐ نے ایک منظم اور اجتماعی تحریک کے لئے باقاعدہ کوشش فرمائی، بہترین صلاحیت اور جوہر قابل کا اعتراف کیا۔ عمر فاروقؓ کے اسلام کے لئے خود دعا فرمائی، سرداران قریش سے خصوصی ملاقاتیں کیں، بہترین قابلیتوں کی ہر ممکن طریقے سے ہمت افزائی کی، ان سے تعلقات بڑھائے، انہیں وظائف دیئے، تالیف قلب کے لئے انہیں ہدایا و تحائف سے نوازا، مناصب دیئے، رشتہ داریاں قائم کیں، حضرت خالد بن ولیدؓ کو اسلام قبول کرتے ہی فوج میں اعلیٰ مقام عطا کیا، ابوسفیان کے گھر کو فتح مکہ کے دن امن کا گھر قرار دیا غرضیکہ آپ نے ہر باصلاحیت فرد کی قدر افزائی کی اور اسے تحریک اسلامی کی گاڑی میں جوت کر منزل حق کی طرف روانہ کرنے کی کوشش کی۔

جب آپ کے پیارے ساتھیوں میں اسلام کے لئے مر مٹنے کا جذبہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا، اقامت دین کے لئے ان کی طلب اور آرزو پختہ ہوگئی، بھٹی میں تپ کر وہ کندن بن گئے اور میل کچیل دور ہوگیا تب آپ کو ہجرت کرنے اور اس مورچے پر پہنچنے کا حکم ملا جہاں سے باطل کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز ہونا تھا۔

ہجرت اسلامی انقلاب کے لئے ایک اہم اور ضروری قدم ہے یہ باطل سے بغاوت کر کے خدا کی

بندگی اختیار کرنے کا کھلم کھلا اعلان ہے۔ ہجرت ملک و وطن، نسل و برادری، خون و نسب اور تمام گروہی، علاقائی اور وطنی عصبیتوں کے خلاف ایک زبردست اقدام ہے۔ اور اسلامی انقلاب کے لئے اس منزل کا سرکرنا ضروری ہے۔

یہ ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا ایک نقشہ کار جس سے موجودہ تحریک اسلامی کو اپنے لئے بنیادی رہنمائی لینی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اول روز سے یہ تحریک مظلوموں کی حمایت اور فریادیوں کی ہمدردی کی تحریک تھی۔ آپ آغاز کار سے ہی ظلم و جبر کے خلاف تلوار بن کر اُٹھے تھے۔ آپ کے اندر یہ جذبہ نہایت قوی موجود تھا کہ مظلوموں کی مدد کی جائے اور ظالم کا ہاتھ پکڑا جائے۔ یہ بے لاگ انسانی خدمت اول دن سے آپ کے اخلاق کا ایک حصہ تھی۔ اس کی تاباں مثال حلف الفضول کے معاہدے میں آپ کی شرکت ہے۔

حضورؐ بیس سال کے تھے جب قریش کے چند قبائل نے ایک معاہدہ کیا جس کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے کہ:

"میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ایک ایسے معاہدہ میں شریک ہوا جس میں شرکت کی اگر مجھے اسلام کے زمانے میں بھی دعوت دی جائے تو میں اسے پسند کروں گا۔"

پھر اس معاہدہ کی تشریح آپؐ نے یہ فرمائی کہ

تَحَالَفُوْا أَنْ یَّرُدُّوا الفُضُولَ عَلٰی اَھْلِھَا وَ اَنْ لَّا یَعُدَّ الظَّالِمُ مَظْلُوْمًا۔

"انہوں نے اس بات پر باہم معاہدہ کیا کہ فضول کو اس کے حقداروں کی طرف پلٹائیں گے اور ظالم مظلوم پر زیادتی نہ کرنے پائے گا۔"

نبوت کے دور میں مکہ میں جبکہ ساز و سامان، قوت و طاقت، افراد و اعوان سب کی کمی تھی بلکہ آپ بالکل نہتے تھے اس وقت بھی آپ نے مظلومین کی حمایت سے دریغ نہ کیا۔ ابوجہل نے اراشی کے اونٹوں کی قیمت دینے سے انکار کیا تو آپ نے اس سے قیمت دلوائی۔ دوسرا واقعہ بھی اسی ابوجہل سے متعلق ہے وہ ایک یتیم بچے کا وصی تھا لیکن باپ کے چھوڑے ہوتے مال میں سے اسے کچھ دینے کو تیار نہ تھا۔ آپ نے ابوجہل کے گھر جا کر اس بچے کا حق دلایا۔ بنی زبید کے ایک شخص پر جب ابوجہل نے ظلم کیا تو حضورؐ اس کے پاس گئے اور کہا کہ خبردار جو تم نے پھر کسی کے ساتھ ایسی حرکت کی جو اس غریب بُدّو کے ساتھ کی ہے ورنہ میں بُری طرح پیش آؤں گا اور اس نے آئندہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ کیا۔

حلف الفضول کے ممبران آپس میں جو معاہدہ کرتے تھے اس کے الفاظ پر غور کرنے سے بھی اس انجمن امداد مظلومین کی حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے۔ اس معاہدہ میں شریک ہونے والے یہ اقرار کرتے تھے کہ:

"خدا کی قسم ہم سب مل کر ایک ہاتھ بن جائیں گے اور وہ مظلوم کے ساتھ رہ کر اُس وقت تک ظالم کے خلاف اُٹھا رہے گا تاآنکہ وہ ظالم اس مظلوم کا حق ادا کردے اور جب تک سمندر گھونگھوں کو بھگوتا رہے اور حراء کے پہاڑ قائم ہیں ہماری معیشت میں مساوات رہے گی۔"[1]

اس سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ تحریک اسلامی آغاز کار سے معاشرے کے پس ماندہ طبقات کے حقوق کی پوری طرح محافظ تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ سرداروں اور خوشحال طبقے کے دباؤ کے باوجود غلاموں، مسکینوں اور اجیروں نے اسلام کا کھل کر ساتھ دیا اور وہ اسلام کی فوج کے بہترین سپاہی ثابت ہوئے۔[2]

تحریک اسلامی کا تاریخی کردار

قرآن جس کشمکش حق و باطل کا ذکر کرتا ہے اور تحریک اسلامی کی جانگسل جدوجہد کا خاکہ ہمارے سامنے رکھتا ہے وہ اسلام کی پوری تاریخ میں نمایاں اور تابناک رہا ہے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے مبارک دور کے بعد جب بھی غیر معیاری صورت حال پیدا ہوئی، اسلام میں انحراف رونما ہوا، بدعت و جہالت کی آمیزش کی ناپاک کوشش کی گئی، جبر و استبداد کی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد ہوئی تو تحریک اسلامی کے علمبرداروں نے اس کا بروقت نوٹس لیا، اُمت کو خطرات سے آگاہ کیا اور جمہوری طرز حکومت کی حفاظت کے لئے سردھڑ کی بازی لگا دی۔ چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جاہلیت کی بُو محسوس کی، شخصی امیدواری سے آگے بڑھ کر ولی عہدی تک معاملہ پہنچ گیا، جمہوریت کی جگہ آمریت اور شخصی استبداد نے لینی چاہی، اُمتِ مسلمہ کا حق غصب ہونے لگا اور خلافت ملوکیت میں تبدیل ہونے لگی تو امام حسین رضی اللہ عنہ،

---

[1] رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ڈاکٹر حمید اللہ، ص ۲۷، ۲۸۔

[2] رسول اکرمؐ کی حکمتِ انقلاب، سید اسعد گیلانی، ص ۵۷۰،
کریسنٹ پبلشنگ کمیٹی، علی گڑھ ۱۹۸۱ء۔

اور عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی جان دے کر اس سیلاب جاہلیت کو روکنے کی کوشش کی۔ وہ اس سیلاب کو تو نہ روک سکے لیکن اپنے خون سے اُمت کو جبر و استبداد کے خلاف صف آراء کر دیا ؎

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

بنو اُمیہ کے استبداد اور جبر و شخصی انانیت نے ان تحریکوں کو دبا دیا لیکن اللہ کا بول سب سے اونچا ہے اس نے بدعات ملوکانہ اور شاہی جاگیرداریوں کا خاتمہ کرنے کے لئے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو اُٹھا کھڑا کیا جنہوں نے شاہی میں فقیری کا راستہ اختیار کیا۔ تحریک اسلامی کے اس علمبردار نے نہایت قلیل مدتِ امارت میں اسلام کی جیتی جاگتی تصویر عوام کے سامنے پیش کر دی۔ شاہی کروفر کا خاتمہ کیا، ناجائز ٹیکس ختم کئے، نسلی حکومت پر تیشہ چلایا اور بحیثیتِ مجموعی خلافت راشدہ کا نمونہ پیش کیا۔ اس طرح ایک بار پھر اسلامی تحریک کامیاب ہوئی اور باطل سرنگوں ہوا۔

اس کے بعد تحریک دعوت و عزیمت کا مسلسل سلسلہ ہے جو ہر دور میں اپنے جواں مردوں کو باطل کے خلاف صف آراء کرتا رہا۔ امام مالکؒ بنو عباس کے دور میں جبری بیعت کے خلاف آواز بلند کر کے تحریک اسلامی کے کاز کو تقویت پہنچاتے ہیں، امام ابو حنیفہؒ ملوکیت کے حق وراثت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور تحریک اسلامی کو آگے بڑھاتے ہیں امام احمد بن حنبلؒ خلق قرآن کے مسئلہ میں قرآن و سُنّت کے ماسوا تمام دلائل کو رد کر دیتے ہیں اور اس سلسلہ کی تمام سزائیں برداشت کر کے تحریک اسلامی کے علم کو اونچا کرتے ہیں۔ امام غزالیؒ، حضرت حسن بصریؒ، امام ابن قیمؒ، محمد بن عبدالوہابؒ وغیرہ یہ وہ تحریک اسلامی کے مایۂ ناز سپوت ہیں جنہوں نے تحریفات و تاویلات، عجمی اثرات، مشرکانہ رسوم، مادیت اور نفس پرستی، لادینیت اور عقل پرستی وغیرہ کے خلاف آواز بلند کی اور سینہ سپر ہوئے اور دین خالص کو اُجاگر اور قائم کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ انہوں نے عوام الناس کے ضمیر کو اتنا بیدار رکھا کہ انہوں نے تمام غیر اسلامی رُجحانات اور اقتدار کے ساتھ مصالحت اور سودا بازی سے انکار کر دیا۔

اس کے برعکس دوسرے مذاہب کو دیکھئے۔ ان کے یہاں سلسلہ اصلاح و تجدید نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہاں ایسی شخصیتیں کم ملتی ہیں جنہوں نے اس دین کے مزاج اور رُوح کو غلط عقائد کی آمیزشوں اور آلائشوں سے پاک کرنے کی سعی کی ہو۔ عیسائیت ہی کو لیجئے، قسطنطین اور سینٹ پال کے توسط سے مسیحیت میں جو مشرکانہ رُوح داخل ہو گئی تھی وہ ایک ہزار برس تک اصل دین قرار پائی۔ لوتھر نے دعوت اصلاح و تجدید کا آغاز کیا لیکن وہ کوئی بڑی خدمت نہ انجام دے سکا اور آج صورت حال اتنی خراب ہو چکی ہے کہ

یوروپ کے مفکرین عیسائیت کی نشاۃ ثانیہ سے قطعاً مایوس ہو گئے ہیں۔

یہی حال کم وبیش دوسرے مذاہب کا ہے۔ بدھ مت نے ایک زمانے میں ایشیا کے ایک بڑے حصے کو فتح کر لیا تھا لیکن یہ مذہب رفتہ رفتہ بُت پرستی اور مظاہر پرستی کے رنگ میں ڈوب گیا اور اس کی اصل رُوحانی تعلیمات، تزکیۂ نفس اور اخلاقی تربیت کا پاکیزہ نظام خانقاہی تعیش اور غیر فطری تجرد میں گم ہو کر رہ گیا۔ لیکن اس مذہب کی تاریخ میں ایسی عظیم شخصیت نہ پیدا ہوئی جو خالص مذہب کو از سرِ نو واضح کرے اور اس پر تعمیری فکر وعمل کی بنیاد رکھے[1]

ہندوستان میں تحریک اصلاح وتجدید

اسلام کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں جنہوں نے اسلام کے اُصول، عقائد اور اساس اعمال کو ہر قیمت پر زندہ رکھا اور اس کی تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں آیا جب اسلام کی تصویر کلیتہً دُھندلا چکی ہو اور اصلاح وتجدید کی کوئی دعوت نہ اُٹھی ہو۔ اسی حقیقت کو حضور اکرمؐ نے اس طرح بیان کیا ہے :

"اس علم کو ہر صحیح جانشین سے آگے ثقہ لوگ لیتے رہیں گے وہ اس سے غلو کرنے والوں کی تحریف، جھوٹوں کی من گھڑت باتوں اور جاہلوں کی تاویل کو ہمیشہ دُور کرتے رہیں گے"۔

(الفقہ المقدسیہ ص ۳۱)۔

حضرت جابر بن سمرۃؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ "یہ دین برابر قائم رہے گا اور اس کے لئے اہلِ ایمان کا ایک طبقہ برابر لڑتا رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے"۔

حضرت امیر معاویہؓ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے یہ حدیث روایت کی :

"میری اُمت کا ایک طبقہ امر الٰہی پر برابر قائم رہے گا جو انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کریں گے یا ان کی مخالفت کریں گے وہ انہیں کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے اور وہ طبقہ لوگوں پر غالب ہو"۔

چنانچہ اس کی صداقت تاریخ سے ثابت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں تحریک اصلاح وتجدید کو پڑھ جایئے یہاں ایک طرف ایسے مسلم سلاطین رہے ہیں جنہوں نے شاہی میں فقیری کی، جن کی

---

[1] چراغ راہ ، نظریۂ پاکستان نمبر مضمون اسلام کا تاریخی رول، ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی سے مستفاد۔

ذاتی زندگی بڑی متقیانہ اور خدا کی محبت اور اس کے خوف سے معمور ہوگی، جن کے اخلاق پاکیزہ اور اعمال درست تھے، جنہوں نے فتوحات کے ذریعہ باطل کا سر جھکا دیا اور مسلم مبلغین کے لئے راہیں ہموار کیں تو دوسری طرف صوفیاء و مشائخ کی ایک کثیر تعداد ہے جنہوں نے اپنے حسنِ اخلاق سے یہاں کے باشندوں کے دل موہ لئے اور انہیں اسلام کا حلقہ بگوش بنایا۔ تیسری طرف تجدید و احیائے دین کی ایسی کوششیں بھی نظر آتی ہیں جنہوں نے شرک و بدعت، الحاد و لادینیت کا کھل کر مقابلہ کیا اور اس راہ میں ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کیں۔ خاص طور سے شاہ ولی اللہ، شیخ احمد سرہندی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہم اللہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ پھر اس بیچ میں ایسی تحریکیں بھی اٹھیں جنہوں نے اسلام کے قیام کی جدوجہد کی اور غلبہ دین کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ تحریک مہدویت، تحریک فرائضی، تحریک مجاہدین، خاص طور سے مشہور ہیں اور تحریکات آزادی میں تحریک سن ستاون، تحریک ریشمی رومال، تحریک خاکسار، تحریک اہل حدیث، تحریک خلافت سرفہرست ہیں۔ ان تحریکوں کے علمبردار اور کارکنوں نے دراصل تحریک اسلامی کا ہی علم اٹھایا اور اسلام کی خدمت انجام دی۔ شخصیات میں ابوالکلام آزادؒ، مولانا شبلی نعمانیؒ، مولانا الطاف حسین حالیؒ، اکبر الٰہ آبادیؒ، حمید الدین فراہیؒ، شبیر احمد عثمانیؒ اشرف علی تھانویؒ جیسے بزرگوں نے اپنی کوششوں سے تحریک اسلامی ہی کو فروغ اور استحکام بخشا۔ جب علامہ اقبال نے متحدہ قومیت کے خلاف نعرہ بلند کیا، وطنیت، سوشلزم، سرمایہ داری اور دوسرے غیر اسلامی افکار و نظریات پر کاری ضرب لگائی اور مسلمانوں کے اندر بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے اسلامی تحریک ہی کا جھنڈا اٹھایا تھا۔ مولانا محمد الیاسؒ نے جب تبلیغ کی مہم شروع کی اور شدھی سنگٹھن کو ناکام بنانے کے لئے خاموش جدوجہد کا آغاز کیا تو وہ تحریک اسلامی ہی کے علمبردار تھے۔ دیوبند، علی گڑھ، ندوۃ العلماء اور دوسرے مدارس اور یونیورسٹیوں نے اپنے اپنے دائرے میں تعلیم کے میدان میں انقلاب لانے کی جو جدوجہد کی وہ سب تحریک اسلامی کو کامیاب بنانے کی مبارک کوششیں تھیں اور جب سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اقامت دین کی تحریک کی بنیاد ڈالی اور ایک منظم اور مستحکم گروہ اس مقصد کے لئے تیار کیا تو وہ بھی تحریک اسلامی ہی کی خدمت کر رہے تھے اس طرح آج جو تحریک اسلامی پوری دنیا میں کام کر رہی ہے وہ اسلامی تحریک کی تاریخ کے پس منظر میں گزرتی ہوئی دور حاضر کے انسانوں تک پہنچی ہے اور آج کے انسان اسی تحریک اسلامی کے مخاطب ہیں ـــــ۔

یہ تمام کوششیں اپنی جگہ صد درجہ مبارک ہیں لیکن غلطیوں اور خامیوں سے کوئی گروہ یا فرد

پاک نہیں ہو سکتا معصوم تو صرف انبیاء ہوتے ہیں چنانچہ ہم ان سلاطین، صوفیاء، تحریکات اور شخصیات کے یہاں بھی جزوی خامیاں پاتے ہیں جن کی طرف اپنے اپنے موقعہ پر نشاندہی کردی گئی ہے۔ مسلم سلاطین گو ذاتی زندگی میں نیک اور پاکیزہ تھے لیکن انہوں نے خلافت راشدہ کے طرز پر کوئی حکومت قائم کرنے کی مخلصانہ کوشش نہیں کی۔ صوفیاء نے اپنے حسن اخلاق وعمل سے یہاں اسلام کا زبردست کام کیا لیکن ان کی بہت سی باتوں سے اتفاق کرنا مشکل ہے اور قرآن وسنت سے ان کی تائید نہیں ہوتی اسی طرح تحریکات میں کچھ تو ایسی ہیں جو اصل مقصود سے منحرف ہوگئی تھیں اور کچھ کے یہاں طریق کار کی زبردست خامی پائی جاتی تھی۔ ڈاکٹر اقبال نے اقامت دین کی راہ کے تمام کانٹے صاف کئے لیکن اس جماعت کے قیام کے لئے کوئی جدوجہد نہ کرسکے جو دین الٰہی کو نافذ اور غالب کرتی۔ مولانا الیاسؒ کا طریق کار بھی مقصود کے حصول میں بہت زیادہ معاون نہ تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کی قائم کردہ تحریک آج تحریک نماز بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن ان تمام خامیوں اور غلطیوں سے قطع نظر وہ سب تحریک اسلامی کے علمبردار تھے اور اسلام کے احیاء کی خدمت میں مصروف تھے۔

اس کتاب کی تالیف کا مقصد مسلمانوں کو ان تمام کوششوں سے متعارف کرانا ہے تاکہ وہ ماضی کے تجربات سے سبق سیکھ سکیں اور مستقبل کے لئے صحیح منصوبہ بندی کرسکیں۔

اس کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کردیا ہے۔ پہلا باب عرب تاجر اور دعوت دین پر مشتمل ہے جس میں مختصر طور پر یہ دکھایا گیا ہے کہ عرب تاجروں کے ذریعہ اسلام کی اشاعت کتنی ہوئی۔

دوسرا باب مسلم سلاطین پر مشتمل ہے جس میں ان چند مسلمان بادشاہوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے دم سے اشاعت اسلام، اور اسلامی تہذیب کو فروغ حاصل ہوا۔ اس باب میں بھکتی تحریک کی ناکامی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرا باب صوفیاء ومشائخ کی تبلیغی مساعی پر مشتمل ہے۔ چوتھا باب تجدید واحیائے دین کے لئے مخصوص ہے جس میں شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ کا مفصل تذکرہ ہے۔ پانچواں باب اسلامی تحریکات سے بحث کررہا ہے جن میں تحریک مہدویت، تحریک فرائضی اور تحریک مجاہدین کے خدوخال نمایاں کئے گئے ہیں۔ چھٹے باب میں آزادی کی تحریکات پر بحث ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ یہ مسلمان لیڈران آزادی برائے اسلام چاہتے تھے۔ ساتویں باب میں علی گڑھ، دیوبند، ندوۃ العلماء پر مفصل بحث کی گئی ہے اور ان کے نتائج واثرات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ آٹھویں باب میں بیسویں صدی کی چند مشہور شخصیات کے کارناموں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اور پانچویں باب میں تحریک تبلیغ، جماعت اسلامی

در بیں

اور ڈاکٹر اقبال پر قدرے تفصیلی گفتگو کی گئی ہے کیونکہ یہی باب اس کتاب کا حاصل ہے۔

تاریخ محض بادشاہوں کی داستان اور سیاسی بساط کے رنگ و آہنگ کا نام نہیں ۔ یہ تو پورے تہذیبی سرمایہ کی عکاس ہے جس میں تہذیبی شخصیت کا پورا اُبھار دیکھا جا سکتا ہے۔ میں نے تاریخ پر ایک داعی کی نگاہ ڈالنے کی کوشش کی ہے اور تحریک اسلامی کے نشیب و فراز کو نمایاں کرنے اور تعبیر تاریخ کی ایک ابتدائی اور نامکمل سعی کی ہے اگر اس سے تحریک اسلامی کو کچھ فائدہ پہنچ جاتا ہے تو خدا کا شکر بجا لاتا ہوں اور اس سے توفیق مزید کی دعا کرتا ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

گلشن سہیل
بدر باغ علی گڑھ

عبید اللہ فہد
یکم اپریل ۱۹۸۳ء

پہلا باب

عرب تاجر اور دعوت دین

عرب تاجر اور دعوت دین

برصغیر میں اسلام سب سے پہلے ان عرب تاجروں کے ذریعہ پہنچا جو ایک حیات آفریں تہذیب و تمدن موثر شخصیت اور دل پذیر اخلاق و کردار سے مالا مال تھے۔ اس وقت ہندوستان کا معاشرہ ذات پات، اونچ نیچ اور رنگ و نسل کے امتیاز پر قائم تھا۔ مخصوص طبقوں کو خصوصی مراعات حاصل تھیں جس کی پشت پناہی نام نہاد مذہب کر رہا تھا۔ دوسری طرف اچھوت ہر قسم کے انسانی و اخلاقی حقوق سے نہ صرف محروم تھے بلکہ جانوروں سے بدتر زندگی بسر کر رہے تھے۔ مالابار، گجرات کچھ اور جزائر ہند میں تو اچھوتوں کا ناطقہ بند تھا چنانچہ جب اسلام آیا اور مسلمان تاجروں نے اپنی معاشرت اور کردار سے اعلیٰ انسانی اخلاق، اصول مساوات و اخوت کا عملی نمونہ پیش کیا تو انہی اچھوتوں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بڑے بڑے راجہ اور مہاراجہ بھی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ ڈاکٹر سر دتیم اپنی اسلام دشمنی کے باوجود اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور نظر آتا ہے کہ:

"ہندوؤں نے دہانہ گنگا کی قدیم اقوام کو کبھی اپنی برادری میں شامل نہیں کیا۔ مسلمانوں نے جملہ انسانی مراعات کو برہمنوں اور اچھوتوں دونوں کے سامنے یکساں طور پر پیش کیا۔ ان پر جوش مبلغوں نے ہر جگہ یہ پیغام سنایا کہ ہر شخص کو خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں جھک جانا چاہیئے۔ خدائے واحد کے سامنے تمام انسان برابر ہیں اور مٹی کے ذروں کی طرح ان سب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ فتح کے بعد فتح کا نعرہ جنگ ایک الہامی اور متبرک حیثیت اختیار کر لیتا ہے"[1]۔

ایک دوسرے ہندوستانی فاضل اسلام کے احسانات و اثرات کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

"اسلام یہاں صرف ایک نورانی مشعل لایا تھا جس نے زمانہ قدیم میں جبکہ پرانے تمدن

---

[1] ماخوذ از (ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین، ہندوستانی مسلمان ص ۲۲۰)

انحطاط پذیر ہو رہے تھے اور پاکیزہ مقاصد محض ذہنی معتقدات بن کر رہ گئے تھے انسانی زندگی کو چھائی ہوئی ظلمتوں سے پاک کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج کی اسلامی دُنیا بھی ایک رُوحانی برادری ہے جس کو توحید اور مساوات کے مشترک عقیدے کا ایمانی رشتہ باہم منسلک کیے ہوئے ہے[1]۔

چنانچہ عربوں کے عقائد و عبادات کو دیکھ کر مالا بار کے چیرامن پیرومن کا آخری راجہ بطیب خاطر مشرف بہ اسلام ہو گیا[2]۔ اس کی راجہ بھانی ڈنگیلور تھی اس نے ایک عرب کو بلا کر اپنے یہاں کنانور کا راجہ بنا دیا تھا کالی کٹ کا زیمورن بھی عرب تاجروں کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اس کے زمانے میں ایک عرب تاجر نے اس کے حدودِ سلطنت میں ایک بازار قائم کیا تھا جو بعد میں کالی کٹ کی ایک خوش حال بندرگاہ بن گئی۔ زیمورن مسلمانوں کا بڑا خیال رکھتا تھا اور اسلام کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کرتا تھا اس نے حکم بھی دے رکھا تھا کہ اس کے حدودِ سلطنت کے ملاحوں کے ہر خاندان سے ایک مرد مسلمان ہو جاتے۔ کولتری کے راجہ کا ایک وزیر نایر تھا جو خود مسلمان ہو گیا اور آگے چل کر کنانور کا راجہ ہوا۔

ہندوستان کے مشرقی ساحل پر بھی عرب تاجر دسویں صدی میں پہنچ چکے تھے۔ وہ یہاں بلا تکلف شادی بیاہ کر لیتے جس سے ان کی آبادی بڑھتی رہی اور ان کی معاشرت اور عبادت کو دیکھ کر وہاں کے اصلی باشندے متاثر ہوتے اور اسلام کے حلقے میں داخل ہو جاتے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس تاریخی حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :

> "شمالی مغرب سے آنے والے حملہ آوروں اور اسلام کی آمد ہندوستان کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے ان خرابیوں کو جو ہندو سماج میں پیدا ہو گئی تھیں، یعنی ذاتوں کی تفریق، چھوت چھات اور انتہا درجہ کی خلوت پسندی کو بالکل آشکارا کر دیا، اسلام کے اخوت کے نظریے اور مسلمانوں کے عملی مساوات نے ہندوؤں کے ذہن پر بہت گہرا اثر ڈالا، خصوصاً وہ لوگ جو ہندو سماج میں برابری کے حقوق سے محروم تھے، اس سے بہت متاثر ہوئے[3]"

---

[1] ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک جھلک، مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مضمون ہندوستانی تہذیب اور اسلام ص ۳۱۶-۱۷

[2] ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر از سید صباح الدین عبد الرحمٰن ص ۲۲۸

[3] تلاش ہند (انگریزی) ص ۵۲۵، ۵۲۶

دوسرا باب

مسلم سلاطین اور اشاعت اسلام

(۱) محمد بن قاسم ثقفی ــــ اسلامی ہند کا پہلا حاکم

(۲) شمس الدین التمش ــــ فقر و جلال کا پیکر

(۳) غیاث الدین بلبن ــــ شریعت کا پیرو

(۴) بغرا خاں کی نصیحت بیٹے کو

(۵) فیروز شاہ خلجی ــــ ایک متشرع حکمراں

(۶) غیاث الدین تغلق ــــ اسلامی تہذیب کا علمبردار

(۷) سلطان محمد تغلق ــــ شریعت کا نافذ

(۸) شاہ جہاں ــــ دین الٰہی کا باغی

(۹) اورنگ زیب عالمگیر ــــ حکومت اسلامی کا مسلمان بادشاہ

(۱۰) بھکتی تحریک کی ناکامی

مسلم سلاطین اور اشاعت اسلام

یہ صحیح ہے کہ جن سلاطین کے ذریعہ یہاں اسلام پہنچا ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے باقاعدہ اپنے زمانے میں اسلامی حکومت قائم کی ہو اور خدا کی حاکمیت اور انسانی خلافت کا نظریہ عملی روپ میں پیش کیا ہو بلکہ اکثر و بیشتر بادشاہوں کے پیش نظر فتح و تسخیر اور حصول دولت تھا۔ حالانکہ ایک مسلمان کا مقصد زندگی عبادت خداوندی قرار دیا گیا تھا۔ مسلمان خیر اُمت کے لقب سے نوازے گئے تھے جن کی ذمہ داری امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھی، جو اس سرزمین پر خدائی فوجدار بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ کا نظام نافذ کریں اور حق کی شہادت تمام بندگانِ خدا کے سامنے دیں، جن کا مطلوب و مقصود جہاد اور شہادت قرار دیا گیا تھا لیکن ان حکمرانوں نے اسلامی تعلیمات کی نمائندگی کرنے کے بجائے قبائلی اور خاندانی سلطنتیں بنائیں اور سیاسی جوڑ توڑ میں لگے رہے۔ پھر بھی اس حقیقت سے صرف نظر کرنا مشکل ہے کہ انہی حکمرانوں میں زاہد و عابد بھی ہوئے ہیں اور بعضوں کی کوششوں سے تہذیب و تمدن میں ایسے جلوہ ہائے صد رنگ پیدا ہوئے کہ ان سے آج تک ہندوستانی زندگی معمور ہے[۱]۔ چنانچہ جنگ آزادی کے مشہور رہنما ڈاکٹر پٹابی سیتارمیہ نے کانگریس کے اجلاس جے پور میں اپنے خطبۂ صدارت میں صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ:

> "مسلمانوں نے ہمارے کلچر کو مالامال کیا ہے اور ہمارے نظم و نسق کو مستحکم اور مضبوط بنایا۔ نیز وہ ملک کے دُور دراز حصوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں کامیاب ہوئے۔ اس ملک کے ادب اور اجتماعی زندگی میں ان کی چھاپ بہت گہری دکھائی دیتی ہے[۲]۔"

ان حکمرانوں کی وجہ سے داعیان دین اور علماء و مشائخ کو یہاں کھل کر کام کرنے کا موقعہ ملا۔

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے: ۱۔ تمدن ہند پر اسلامی اثرات از ڈاکٹر تارا چند ۲۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڑھ ۳۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے عہد کے تمدنی جلوے از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

[۲] خطبۂ صدارت انڈین نیشنل کانگریس اجلاس جے پور۔

ان ہی کے سہارے اس سرزمین میں اسلام پھل پھول سکا اور انہی کی بدولت مبلغین اسلام کی کوششیں بارآور ہوتی گئیں۔ ان مسلمان بادشاہوں نے جہاں ہندوستان کے قدیم معاشرہ کو توحید کے بیش قیمت تصور اور اسلامی اخوت و مساوات کے گرانمایہ تحفہ سے نوازا وہیں یہاں کے مذہبی عقائد کے احترام کے ساتھ ستی کی لرزہ خیز اور مہیب رسم کی اصلاح میں بھی حصہ لیا۔ ہندوستان کا مشہور سیاح ڈاکٹر برنیر لکھتا ہے :

"آج کل پہلے کی بہ نسبت ستی کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ کیونکہ مسلمان جو اس ملک کے فرماں روا ہیں، اس وحشیانہ رسم کو نیست و نابود کرنے میں حتی المقدور کوشش کرتے ہیں گرچہ اس کے امتناع کے واسطے کوئی قانون مقرر نہیں ہے کیونکہ ان کی پالیسی کا یہ جزو ہے کہ ہندوؤں کے معاملات میں دست اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ مذہبی رسوم کو بجالانے میں انہیں آزادی دیتے ہیں تاہم ستی کے رسم و رواج کو بعض اپیچ پیچ کے طریقوں سے روکتے رہتے ہیں یہاں تک کہ کوئی عورت بغیر اجازت اپنے صوبہ کے حاکم کے ستی نہیں ہوسکتی۔ اور صوبہ دار ہرگز اجازت نہیں دیتا جب تک واقعی طور پر اس امر کا یقین نہیں ہو جاتا کہ وہ اپنے ارادے سے ہرگز باز نہ آئے گی۔

صوبہ دار بیوہ کو بحث و مباحثہ سے سمجھاتا ہے اور بہت سے وعدے وعید کرتا ہے اگر اس کی فہمائش اور تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو کبھی ایسا بھی کرتا ہے کہ اپنے محل سرا میں بھیج دیتا ہے تاکہ بیگمات بھی اس کو اپنے طور پر سمجھائیں مگر باوجود ان سب امور کے ستی کی تعداد اب بھی بہت ہے خصوصاً ان راجاؤں کے علاقوں اور عملداریوں میں جہاں کوئی مسلمان صوبہ دار نہیں ہے[۱]۔"

---

[۱] وقائع سیر و سیاحت از ڈاکٹر برنیر جلد دوم ص : ۱۷۲

محمد بن قاسم ثقفی

(یوں تو ہندوستان پر مسلمانوں کے بحری حملے حضرت عمرؓ کے زمانے سے ہی شروع ہو گئے تھے) پھر حضرت عثمان، علی، معاویہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کے کارناموں میں مکران، قیقان بلکہ بنوں اور لاہور تک اسلامی دستوں کے آنے اور جنگ کرنے کے واقعات کا ذکر ملتا ہے، لیکن باقاعدہ حملہ اور فتح خلیفہ ولید بن عبد الملک کے زمانے میں مشہور اسلامی جرنیل محمد بن قاسم کے زیر قیادت ہوئی۔[1]

محمد بن قاسم کے دور میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے اور اس صنم خانے سے کعبہ کو پاسباں فراہم ہونے کی بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے دور میں غیر مسلم رعایا کو وہی حیثیت دی جو صحابہ کرام نے اہل فارس کو دی تھی یعنی نکاح اور ذبیحہ کے علاوہ دیگر تمام امور میں ان کے ساتھ اہل کتاب کا برتاؤ کیا جائے اور ان کے مندروں کی حیثیت ایران کے آتش کدوں کی طرح رکھی گئی اور جس طرح صحابہ نے آتش کدے نہیں توڑے اسی طرح مصالحت کے بعد مندر بھی محفوظ رہنے دیئے گئے۔ چنانچہ بعض روایات میں آتا ہے کہ محمد بن قاسم کے چلے جانے کے بعد وہاں کے لوگوں نے اس کا مجسمہ بنالیا تھا۔[2]

ڈاکٹر تارا چند نے سندھ کے راجہ چچ اور محمد بن قاسم دونوں کے نظم سلطنت اور طرز حکومت کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "چچ (داہر کا باپ) متعصب فرماں روا تھا۔ اس نے بدھ مذہب کے پیروؤں کے لیے ظالمانہ قوانین جاری کئے تھے۔ ان لوگوں کو ہتھیار بند ہونے، ریشمی کپڑے پہننے، گھوڑوں پر زین لگا کر سوار ہونے کی اجازت نہ تھی۔ علاوہ بریں اس نے حکم دے رکھا تھا کہ یہ لوگ برہنہ پا اور برہنہ سر کتوں کو ساتھ لے کر باہر نکلا کریں۔"

اس کے برخلاف محمد بن قاسم کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

---

[1] مسلمانوں کا عروج و زوال از سعید احمد اکبر آبادی ص: ۲۰۶

[2] فتوح البلدان ص ۴۲۸

"مسلمان فاتحوں نے مفتوحوں کے ساتھ ہوشیاری اور کرم گستری کا معاملہ کیا، مال گزاری کا پرانا نظم باقی رکھا گیا۔ پرانے ملازم اپنی ملازمتوں پر بدستور باقی رہے۔ ہندو پجاریوں اور برہمنوں کو مندروں میں پوجا پاٹ کرنے کی عام اجازت تھی اور ان کو صرف ایک ہلکا سا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا جو ان کی آمدنی کے مطابق تھا۔ مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ قاضی کرتے تھے لیکن ہندوؤں کے لئے ان کی پنچائیتیں الگ تھیں جو ان کے معاملات فیصل کرتی تھیں بہت سے بڑے عہدوں پر ہندو فائز تھے۔ یہاں تک کہ وزارت عظمیٰ پر راجہ داہر کا وزیر ہی سرفراز تھا"[1]

محمد بن قاسم کے اندر عدل وانصاف کی جو تھوڑی سی جھلک پائی جاتی تھی وہ اسلام ہی کی دین تھی۔ کیونکہ قرآن کا حکم ہے کہ "عدل سے کام لو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے"۔ دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ جب بھی بولو حق وانصاف کی بولو چاہے اس کی زد تمہارے رشتہ دار پر پڑتی ہو۔ تیسرے مقام پر خبردار کیا کہ کسی قوم کی نفرت تمہیں اس امر پر نہ ابھارے کہ عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھو۔

شمس الدین التمش (سنہ ۱۲۱۰ء تا سنہ ۱۲۳۵ء)

سلطان شمس الدین التمش اسلامی ہندوستان کا وہ قابل فخر فرماں روا ہے جس کے یہاں فقر و فخر اور شاہانہ جلال اور درویشانہ استغنا کا حسین توازن نظر آتا ہے۔ اس بادشاہ کو مذہب اور اشاعت اسلام سے جو دلچسپی تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ تذکرہ نویس اولیاء ومشائخ میں اس کا شمار کرنے لگے تھے۔ مولانا غلام سرور نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ:

"اگرچہ بظاہر تعلق بہ بادشاہی داشت لیکن از دل فقیر و فقیر دوست بود"[2]

یعنی اگرچہ ظاہر میں اس کا تعلق بادشاہی سے تھا لیکن جہاں تک دل کا تعلق ہے وہ فقیر اور فقیر دوست تھا۔

اس کی نماز کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ مہمات کے زمانے میں نماز کے لئے خاص اہتمام

---

[1] مختصر تاریخ اہل ہند از ڈاکٹر تارا چند (انگریزی) ص ۱۱۲، ۲۳–۱۲۲

[2] عجائب الاسفار ج ۲ ص ۵۲

کے جاتا تھا[1]۔ تہجد کا خاص اہتمام کرتا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے بیان کے مطابق "راتوں کو جاگتا تھا اور کسی کو بیدار نہیں کرتا تھا[2]"۔ اس زمانے میں سلطان کی عبادتوں کے متعلق عام رائے تھی کہ:

"وہ حد سے زیادہ صاحب اعتقاد تھا۔ تمام تمام رات جاگتا تھا کسی نے اس کو کبھی سوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب بھی دیکھا عالم تحیر میں کھڑا ہوا اور عبادت میں مصروف۔ اگر کبھی آنکھ لگ جاتی تو اس وقت گھبرا کر بیدار ہو جاتا۔ اُٹھ کر خود پانی بھرتا، وضو کرتا اور مصلے پر بیٹھ جاتا اور کبھی کسی خدمتگار کو نہیں جگاتا تھا بلکہ کہتا تھا کہ جو لوگ آرام میں ہیں ان کو کیوں زحمت دوں[3]"

سلطان علماء کی مجلسیں منعقد کرتا، مشائخ سے عقیدت رکھتا اور ان کا وعظ سنا کرتا تھا۔ مملکت میں فواحش کے انسداد پر بھی توجہ رہا کرتی تھی۔ علامہ سید نور الدین مبارک غزنویؒ جو شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ تھے، انتہائی جرآت اور بے باکی سے دربار کے غلط رسوم اور ملک میں پھیلی ہوئی خرابیوں پر تنقید کرتے تھے اور بادشاہ نہایت خاموشی سے انہیں سنتا تھا۔ وہ کلمۂ حق کی بلندی، شعار اسلام کی ترویج، فسق و فجور کے خاتمہ اور بدکردار لوگوں پر سختی کی تلقین کرتے، دین محمدی کے احکام کے اجراء اور اس کے لئے خدا ترس اور نیک بندوں کی تقرری پر زور دیتے۔ لیکن سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا یہ سوال پھر بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ:

"اس میں شک نہیں کہ التتمش مذہبی جذبات کا حامل تھا، علماء و مشائخ سے اس کو گہری دلچسپی تھی، اس نے دہلی میں ایسی فضا پیدا کر دی تھی جس میں مسلمانوں کے مذہبی اور تہذیبی ادارے نشو و نما پا سکے[4]، لیکن آج کا مؤرخ بھی سید نور الدین مبارکؒ کی طرح یہ سوال کر سکتا ہے کہ آخر یہ دینی مذاکرات سلطان کی فکر میں ایسی تبدیلی پیدا کرنے میں کیوں ناکام رہے جو اس کو سیاسی نظام کی بنیادیں بدلنے اور اس کو اسلام کی حقیقی روح سے قریب تر لانے پر مجبور کر دیتی[5]"

۱۔ طبقات اکبری ج ۱ ص ۶۳

۲۔ فوائد الفواد ص ۲۱۳

۳۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۱۲۹ بحوالہ فوائد السالکین (قلمی نسخہ)

۴۔ ملاحظہ ہو تاریخ محمدی (ص ۲۴۴ ب) میں سلطان کی وفات کا ذکر۔

۵۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۱۳۱

غیاث الدین بلبن

سلطان غیاث الدین بلبن نہ صرف یہ کہ نماز روزے کا پابند تھا اور شریعت کے تمام احکام کی اطاعت کرتا تھا بلکہ اپنے بچوں کو بھی اس کی نصیحت کرتا تھا اور عوام کے اندر دینی تبدیلی لانے کے لئے کوشاں تھا۔ چنانچہ مآثر رحیمی کے مصنف لکھتے ہیں کہ "اس کے زمانے میں تقویٰ اور پاکیزگی کو رواج ہوا اور اس کا حال یہ تھا کہ اگر کسی شخص میں زہد و صلاح کی خوبیاں نہیں ہوتی تھیں تو کوئی مہم اس کے سپرد نہیں کرتا تھا اور اس نے شراب نوشی اور غیر مشروع حرکات کو اپنے ملک سے اکھاڑ پھینکا[1]"۔ اس کے بیٹے بغرا خاں کا بیان ہے کہ سلطان اپنے بیٹوں میں جس کسی کے متعلق یہ سُن لیتا کہ اس سے ایک وقت کی نماز فوت ہوگئی ہے۔ جب بھی وہ شخص آداب بجالاتا، اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا تھا[2]۔ اس نے اپنی اولاد کو وقتاً فوقتاً جو نصیحتیں کی ہیں وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ ایک بار فرمایا:

"امور جہاں داری میں خدا کے بندوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرے اور اس طرح پیش آئے کہ اس کے امر و امارت، قول و فعل، اوصاف و اخلاق سب سے متاثر ہو کر راہ شریعت پر چلنے کی توفیق ہو اور فسق و فجور اور گناہوں سے لوگ عبادت اور نیک کاموں کی طرف آجائیں۔ اور دُنیا میں احسان کے سزاوار اور آخرت میں نجات کے مُستحق ٹھہریں[3]۔"

اور ایک موقعہ پر یوں نصیحت کی:

"نوکروں، چاکروں، خزانوں اور دفینوں کو کفر اور کافروں، شرک اور بت پرستی کے قلع قمع کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہیئے اور فسق و فجور اور بغاوت و نافرمانی کو ختم کرنے کا ذریعہ بنانا چاہیئے اور خدا اور رسولِ خدا کے دشمنوں اور اس کی نافرمانی کرنے والوں اور دین مصطفیٰ کی مخالفت کرنے والوں کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ دینا چاہیئے[4]۔"

---

[1] مآثر رحیمی جلد اول ص ۳۰۵

[2] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۰۲

[3] " " " ص ۷۲

[4] " " " ص ۷۳ نیز ملاحظہ ہو طبقات اکبری جلد اول ص ۸۹ تا ۹۱۔

بغرا خاں کی نصیحت بیٹے کو

بلبن کی وفات کے بعد جب معزالدین کیقباد کو اعیان و ملوک نے ۶۸۶ھ میں تخت پر بٹھایا اور اس نے شریعت کے احکام کی خلاف ورزی شروع کی تو اس کے باپ بغرا خاں نے بیٹے کو انحرافِ شریعت پر مندرجہ ذیل نصیحت کی:

"میں نے سُنا ہے کہ تم نماز نہیں پڑھتے اور ماہ رمضان میں روزے نہیں رکھتے اور ایک حیلہ گر عالم نے درہم و دینار کی طمع میں تم کو روزے ناغہ کرنے کی اجازت دے دی ہے اور تم سے کہہ رکھا ہے کہ اگر تم ایک روزے کے بدلے ایک غلام آزاد کر دو یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو تو تم کو روزے کا ثواب پہنچ جائے گا۔ تم نے یہ بات مان لی ہے لیکن ایمان داروں کی یہ بات نہیں سُنی کہ جو شخص ماہ رمضان کے روزے نہیں رکھتا وہ جوانی ہی میں چل بستا ہے۔

میرے بیٹے! تمہارا دادا (غیاث الدین بلبن) اکثر کہا کرتا تھا کہ بادشاہوں بلکہ تمام مسلمانوں کو علمائے آخرت پر اپنا اعتقاد و عمل رکھنا چاہیئے اور حیلہ گر تاویل کرنے والوں کو اپنے سامنے ہی نہیں آنے دینا چاہیئے اور نہ ہی ان کے حیلہ و تاویل کو اپنے عمل کا مدار بنانا چاہیئے۔

میں نے اپنے والد سے بارہا سُنا ہے کہ علماء کے دو طبقے ہیں، ایک تو علمائے آخرت، جنہیں اللہ تعالیٰ دُنیا اور اس کی محبت اور حرص و لالچ سے بچائے رکھتا ہے۔ اور دوسرے علمائے دنیا، جو دُنیا کی محبت و طمع اور لالچ میں کتوں کی طرح بھاگتے ہیں۔ یہ لوگ امراء کے مکانوں پر جاتے ہیں اور ان کا کام حیلہ و تاویل ہے۔ سمجھدار اور دیندار بادشاہ وہ ہو گا جو علمائے دُنیا کے کہنے پر عمل نہ کرے اور ان علماء کے ہاتھ میں جنہیں دُنیا جان سے بھی زیادہ عزیز ہے، اوامرو احکام شرعی نہ دے دے۔ دینی مسئلے بھی ان حریصوں اور لالچیوں سے جو فی الوقت دُنیا کی پرستش کرتے ہیں، نہیں پوچھنے چاہئیں۔ اور اگر دینی و دنیوی فلاح کی خواہش ہے تو احکام شرعی کی تکمیل ان علماء کے حوالے کرنی چاہیئے جنہوں نے دنیا کی طرف اپنی پشت کر دی ہے اور درہم و دینار کو سانپ بچھو کی طرح سمجھتے ہیں۔ مذہبی مسائل بھی انہیں علماء سے پوچھنا چاہئیں۔

میرے بیٹے! تم اپنے دادا بلبن کی خدمت میں رہے ہو اور دیکھا ہے کہ وہ روزہ، نماز اور فرائض و نوافل میں کس قدر مشغول رہتا تھا۔ کسی عالم اور کسی شیخ کو اس طرح نماز روزہ کی طاقت نہ رہی ہوگی۔ اگر سلطان بلبن کو پتہ چلتا کہ ہم دو بھائیوں (یعنی شہید اور بغرا) سے ایک نماز فوت ہوگئی ہے یا ہم سوئے رہے ہیں اور فجر کی نماز باجماعت نہیں پڑھی تو وہ مہینہ بھر ہم سے بات نہ کرتے۔ اور اگر دوسرے کسی سے بھی ایک نماز فوت ہوجاتی اور وہ بادشاہ کی خدمت میں جاتا تو وہ منہ پھیر لیتا۔

اور میں نے بہت سے بوڑھوں سے سنا ہے کہ جو کوئی رمضان میں روزے نہیں رکھتا وہ جوانی میں مرجاتا ہے اور جو کوئی نماز نہیں پڑھتا وہ مسلمان نہیں رہتا۔ بلکہ اس ارتداد پر اس کا خون مباح ہوجاتا ہے۔

میرے بیٹے! موت کا وقت سخت ہوتا ہے، بالخصوص بادشاہوں کا جنہوں نے اتنی نعمتوں سے حظ اٹھایا ہوتا ہے اور ان میں جوان بادشاہ کی موت اور بھی دردناک ہوتی ہے جو تمام دنیا کی حسرتیں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

میری آخری نصیحت یہ ہے کہ رمضان میں روزے رکھو اور جس طرح بھی ہوسکے نماز پڑھو اور ایک خدا طلب عالم کو اپنے پاس سے دور نہ کرو کیونکہ اتنے ہزار لوگ غم دنیا میں ہلاک ہوتے ہیں اور وہ تمہارے دین کی فکر کرتا ہے۔[1]

تاریخ میں آتا ہے کہ باپ کی اس نصیحت کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ بیٹے نے شراب و کباب کی محفلیں اٹھادیں، شراب اور منکرات سے توبہ کرلی اور تھوڑے دنوں تک نماز روزے کی پابندی کرتا رہا۔

فیروز شاہ خلجی

سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی کا دور بھی اس لحاظ سے ممتاز و منفرد ہے کہ یہ بادشاہ نہ صرف یہ کہ نماز روزے کا پابند اور علماء و مشائخ سے عقیدت رکھنے والا تھا بلکہ ضیاء الدین برنی کے الفاظ میں "اس عہد مبارک میں حاکموں کا خلاف شرع بات کہنا یا کرنا سخت عیب سمجھا جاتا ہے۔ بادشاہ کے اندر حلم و خدا ترسی دکھائی دیتی ہے اور اس کے اعوان و انصار میں علم و عقل، کرم و

---

[1] آب کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۲۹ - ۱۲۶

شفقت، احکام شریعت کی پابندی اور معاملہ داری پائی جاتی ہے۔" بلکہ برنی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

" اگر کسے غیر احکام شریعت و معاملت مردم آں زمانہ در پیش آمدے آں کس مطعون شدے ور اا اعتبار گشتے۔"

یعنی اگر کوئی احکام شریعت اور معاملے کے خلاف کرتا نظر آتا تھا تو وہ مطعون اور ساقط الاعتبار ہو جاتا تھا۔[1]

غیاث الدین تغلق

یہ بادشاہ نہایت نازک حالات میں برسر اقتدار ہوا۔ اس سے پہلے جو بادشاہ تھے محض نام کے تھے۔ ناصر الدین خسرو خاں کا لقب اور نام مسلمانوں کا تھا لیکن اس نے اپنے دور میں مسلمانوں کے لئے جینا حرام کر دیا۔ مسجدوں کی محرابوں میں بُت رکھوائے جاتے تھے اور کلام مجید کے نسخوں کو اوپر تلے رکھ کر خسرو کے ساتھی انہیں مونڈھوں کی طرح استعمال کرتے۔ یہ وقت اسلام کے لئے بڑا نازک تھا۔ کیمبرج ہسٹری میں لکھا ہے کہ:

" اسلام کو اس وقت ایک سرپرست کی بڑی ضرورت تھی۔ خسرو کی ساری جماعت میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کا اسلام برائے نام نہ ہو اور بعض نے تو اسلام اختیار ہی نہ کیا تھا۔ دربار میں علانیہ بُت پرستی ہوتی اور مذہب اسلام کی توہین کی جاتی۔ مسلمان مؤرخین ان واقعات کا بڑے افسوس اور رنج کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ مسجدوں کی بے حرمتی ہوتی یا انہیں مسمار کیا جاتا اور اسلام کی مقدس کتابیں کرسیوں اور اسٹولوں کی طرح بیٹھنے کے لئے استعمال کی جاتیں۔"

ترجمہ صحیح

ضیاء الدین برنی جو اس زمانے میں زندہ تھا، لکھتا ہے کہ خسرو کا مقصد شمالی ہندوستان میں نئے سرے سے ہندو اقتدار قائم کرنا تھا۔[2] لیکن ایک خدا کا بندہ اٹھا اور پیشتر اس کے کہ فتنہ جڑ پکڑ لے، اس کا قلع قمع کر دیا۔ یہ بادشاہ غیاث الدین تغلق تھا اس کی ذاتی زندگی بڑی پاکیزہ، متشرع اور عبادت گزار تھی۔ نواہی سے حد درجہ دور رہتا تھا اور اوامر کی تعمیل میں پیش پیش رہتا تھا۔ خلجیوں کے زمانے میں جو مذہبی بدعنوانیاں شروع ہو گئی تھیں ان کی اس نے اور اس کے جانشینوں نے اصلاح کی۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۰۲ - [2] ملاحظہ ہو آب کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۴۳۸ - ۴۴۷

سلطان محمد تغلق

یہ بادشاہ قرآن مجید کا حافظ، نماز روزہ کا سختی سے پابند اور عربی فارسی میں ماہر زبان داں تھا۔ ڈاکٹر تارا چند نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ :

"وہ اپنے مذہب کی پوری پیروی کرتا اور اس کی خانگی زندگی بے عیب تھی۔ وہ متعصب ہرگز نہ تھا۔ تنگ نظر فقہاء کی رائے کو بہت اہمیت نہ دیتا تھا اور ہندوؤں کے ساتھ اس نے رواداری کا سلوک کیا۔ اس نے ان کی معاشرتی زندگی کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور رسم ستی کو موقوف کرنا چاہا۔ ایک ہندو کو اس نے سندھ کا گورنر مقرر کیا اور دوسروں کو بڑے بڑے عہدے دیئے۔"[1]

اس بادشاہ کے دور میں دہلی میں شراب نہ علانیہ پی جا سکتی تھی نہ چھپ کر۔[2] شہاب الدین العمری کو شبلی نے بتایا تھا کہ دہلی میں شراب بالکل نہیں ملتی اور وہاں کا باشندہ شرابیوں سے سخت نفرت کرتا ہے۔[3] سلطان نے ایک امیر کی جائیداد محض اس وجہ سے ضبط کرلی تھی کہ وہ شراب پیا کرتا تھا۔[4] سلطان نماز باجماعت پر کتنا زور دیتا تھا اس کا اندازہ ابن بطوطہ کے اس بیان سے لگایئے کہ :

"یہ بادشاہ نماز کے معاملہ میں بہت تاکید کرتا تھا اور اس کا حکم تھا کہ جو شخص جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھے اس کو سزا دی جاتے۔ ایک روز اس نے نو آدمی اسی بات پر قتل کرڈالے۔ ان میں سے ایک آدمی مطرب تھا۔ اس کام پر بہت سے آدمی لگائے ہوا تھا کہ جماعت کے وقت جو شخص مل جائے اس کو پکڑ لاویں یہاں تک کہ سائیس جو دیوان خانے کے دروازے پر گھوڑے لئے رہتے تھے ان کو بھی پکڑنا شروع کیا۔ حکم تھا کہ ہر شخص نماز و شرائط اسلام کو سیکھے۔ تمام لوگ بازاروں میں نماز یاد کرتے پھرتے تھے اور کاغذوں پر لکھواتے تھے۔"[5]

دوسری طرف بادشاہ نے تبلیغ اسلام کے لئے بھی کچھ جدّ وجہد کی۔ وہ اسلامی تمدن کو ہندوستان

---

[1] مختصر تاریخ اہل ہند (انگریزی) از ڈاکٹر تارا چند ص ۱۷۲، ۱۷۳۔

[2]، [3]، مسالک الابصار ص ۵۲ [4] صبح الاعشیٰ ص ۶۴

[5] عجائب الاسفار ص ۱۳۰، ۱۳۱

ں ترقی پذیر دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے علماء و مشائخ کو نہایت کوشش سے ن دور دراز جگہوں میں بھیجا جہاں مسلمانوں کی آبادی نسبتاً کم تھی۔ چنانچہ دکن میں اس نے علماء کے ے وفود بھیجے تاکہ وہاں رہ کر اسلام کی تبلیغ کریں اور اسلامی آبادی کو فروغ دیں۔ شمالی ہندوستان میں سلمانوں کی ثقافتی زندگی کی جڑیں کافی مضبوط ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اس نے یہ سوچا کہ اگر یہاں کے ایک ضبوط تمدنی مرکز کو جنوبی ہند کی سرزمین میں منتقل کر دیا جائے تو شمالی ہندوستان کی تمدنی زندگی میں کوئی خاص کمی واقع نہ ہوگی لیکن دکن میں اسلامی روایات اور طرزِ زندگی کو پھیلانے کا کام انجام پائے گا بس منصوبہ کو تبدیلیٔ دارالسلطنت کے نام سے مؤرخوں نے مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا ہے وہ حقیقت میں سلامی تہذیب و تمدن کی ترویج و اشاعت کے لئے ایک نہایت ہی منظم کوشش تھی۔[1]

شاہجہاں — "دینِ الٰہی" کا باغی

اکبر کا دور اسلامی ہند کی تاریخ میں سب سے بدترین اور تاریک دور ہے۔ یہاں اسلام کو بگاڑنے اور اسلام کی بے حرمتی کرنے کی ساری چالیں چلی گئیں۔ پورے معاشرے پر تعقل پرستی، تشیّع، علمائے سوء اور جاہلانہ تصوف کا غلبہ تھا۔ ایک طرف علمائے سوء اور جاہل صوفیوں نے عام مسلمانوں کو اوہام و خرافات کا صید زبوں بنا کر کتاب و سنت سے ان کا رشتہ منقطع کر دیا تھا اور اسلام کے لئے ان کی قوتِ مزاحمت کمزور کر دی تھی اور دوسری طرف خود بادشاہ اسلام سے عناد اور بغض و بغاوت کی راہ پر جا پڑا تھا۔ ملت کی دینی و فکری بنیادیں منہدم ہوئی جا رہی تھیں، اسلامی شعائر کا جنازہ نکل رہا تھا، اور غیر اسلامی اور ہندوانہ مراسم رواج پا رہے تھے لیکن اللہ نے اسلام کی حفاظت و صیانت کی ذمہ داری لے لی ہے چنانچہ ایک طرف حضرت مجدد الف ثانی ان فتنوں سے نبرد آزما ہوئے اور دوسری طرف شاہجہاں کے دور میں زمانے کی فضا بدل گئی۔ اسلام پھلنے پھولنے لگا اور اسلامی تہذیب کا بول بالا شروع ہوا۔

شاہجہاں نے اپنی عملی زندگی، حکومت کی پالیسی اور نظم و نسق میں تبدیلی کے ذریعہ ہندوؤں کے غلبہ و اثرات سے ملک کو نجات دینے کے لئے مختلف اقدامات کئے۔ جس سے اسلامی طاقتیں روز بروز زور پکڑتی رہیں۔ اس نے حکم دیا کہ جو مسلمان عورتیں غیر مسلموں کے قبضے میں ہیں وہ انہیں آزاد کریں یا خود

---

[1] سلاطینِ ہند کے مذہبی رجحانات از خلیق نظامی ص ۳۳۸، ۳۳۹

ان کے ساتھ مسلمان ہو جائیں۔ جہاں ہندوؤں کے غلبے سے اذانیں نہ دی جا سکتی تھیں وہاں اذان و نماز کا باقاعدہ اہتمام کیا۔

پنجاب کے قصبہ گجرات کے سادات و مشائخ نے بادشاہ سے عرض کیا کہ وہاں کے بعض ہندوؤں نے مسلمان عورتیں گھروں میں ڈال رکھی ہیں اور ان میں سے بعض نے تو مسجدوں پر قبضہ کر رکھا ہے اس کے معلوم ہوتے ہی شاہ جہاں نے شیخ محمد گجراتی کو جو علوم رسمی سے واقف تھے اور نو مسلموں کے داروغہ مقرر ہوئے تھے، حکم دیا کہ وہ ثبوت کے بعد مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضے سے نکالیں اور مسجدوں اور غیر مسلموں کی عمارتوں کو علیحدہ کریں۔ چنانچہ شیخ نے ستر مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضہ سے نکالا اور جہاں جہاں مسجدوں پر ہندوؤں نے بے جا تصرف کر لیا تھا تحقیق کے بعد انہیں واگزار کیا اور غیر مسلموں سے جرمانہ لینے کے بعد مسجدوں کو بحال کر دیا۔[۱]

بادشاہ کو سجدۂ تعظیمی کرنے کا حکم بھی موقوف کر دیا البتہ کورنش کا رواج باقی رکھا یعنی جب بھی کوئی شخص بارگاہ شاہی میں حاضر ہوتا تو اپنا دایاں ہاتھ زمین پر لگاتا اور اس کی پشت چوم کر کھڑا ہو جاتا۔ دسویں سال جلوس میں اسے بھی منسوخ کر دیا۔ صرف شرعی سلام دربار کا سلام مقرر رہا۔

شاہ جہاں کے دور میں گرچہ بڑے بڑے درباری علماء، فضلاء اور شاعر تھے مگر وہ خود علمی ذوق سے زیادہ تعمیری ذوق رکھتا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے ایسی تعمیری یادگاریں چھوڑی ہیں جو آج بھی اپنی خوبصورتی اور دلکشی میں لاثانی ہیں۔

شاہ جہاں کا عہدِ حکومت اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ معاشرت اور سیاست سے اکثر غیر اسلامی تخیلات، تصورات اور رسم و رواج ختم کئے جا رہے تھے۔ بادشاہ کے اندر گو ہندو خون کی آمیزش تھی لیکن پسند اور ناپسند میں اور زندگی کے معاملات میں وہ اپنے باپ جہانگیر سے زیادہ اسلام کی طرف مائل تھا۔

لیکن شاہ جہاں کے دور میں غیر مسلم طاقتوں اور اکبر کے "دین الٰہی" کے معتقدین نے پھر سر اُبھارنا شروع کیا اور حالات کو اپنے حق میں سازگار بنانے کے لئے دوبارہ تگ و دو شروع کر دی۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ شاہ جہاں کے بیٹوں میں جو تخت نشینی کی جنگ ہوئی وہ محض اقتدار کی

۱؎ رود کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۲۴۸

۔ نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے افکار و تصورات اور نظریات و عقائد کی ایک بڑی کشمکش پوشیدہ تھی ایک طرف
اتھا جو آزاد خیال اور اکبری طرز فکر کا علمبردار تھا اور دوسری طرف اورنگ زیب عالمگیر تھا جو قرآن و سُنت
عامل تھا،

دارا، شاہ جہاں کا بڑا لڑکا تھا جو بادشاہ کا مقرب خاص اور حکومت کے معاملات و مسائل میں
دراست دخیل تھا۔ عقیدہ اور فکر کے لحاظ سے وہ آزاد خیال، وسیع المشرب اور ہندو ویدانت فلسفہ
ے متاثر تھا اس نے ایک طرف سفینۃ الاولیاء اور سکینۃ الاولیاء وغیرہ
تابیں لکھیں جو صوفیاء کے حالات پر مشتمل تھیں تو دوسری طرف ہندو ویدانت کی چھان بین سے متاثر
ر مجموعۃ البحرین تصنیف کی جس میں مسلمان صوفیوں اور ہندو جوگیوں کے خیالات جمع
کئے۔ اس میں عناصر صفاتِ الٰہی، نبوت، ولایت اور عالم برزخ وغیرہ کے متعلق تصوف اور جوگ کے خیالات
ٹھا کئے اور انہیں ایک دوسرے کے مطابق ثابت کیا۔

دارا نے ویدانتیوں اور "ہندو موحدین" کے خیالات کو زیادہ محنت سے فارسی زبان میں منتقل
کرایا۔ اس سلسلے میں ایک مختصر رسالہ مکالمۂ دارا شکوہ و بابالال کے نام سے دارا شکوہ کے منشی چندر بھان
نے مرتب کیا جس میں دارا کے سوالات اور بابالال کے جوابات جمع ہیں۔ پھر ۱۰۶۶ھ میں دارا کے ایماء
پر جوگ بسشٹ کا آسان فارسی میں ترجمہ ہوا، اس میں شری رام چندر جی کے گرد کے اشارات جمع ہیں۔
ان دونوں سے بھی اہم کتاب سر اکبر ہے جس میں دارا شکوہ نے بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے اپنشدوں
کے تقریباً پچاس ابواب کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ دارا شکوہ نے بھگوت گیتا کا
بھی فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ایک با اثر گروہ مسلمان صوفیوں اور ہندو
جوگیوں کے تصوف اور ویدانت کے اشتراک سے مشترک روحانی نظریہ کی تلاش میں تھا۔ دارا شکوہ
اس مکتب فکر کا نہ صرف ہمنوا بلکہ سرخیل نظر آتا ہے اور اس کے گرد بہت سے مذہبی حضرات تصوف کا
لبادہ اوڑھے اور ہندو سادھو اس کام کی تکمیل کے لئے جمع تھے۔ اگر یہ گروہ جڑ پکڑ لیتا اور ہندو ویدانت
اور تصوف کا معجون مرکب مسلمانوں میں مقبول ہو گیا ہوتا تو آج اسلام ہندوستان میں محض داستان
سانحہ کی حیثیت سے زندہ ہوتا۔

مسلمان اس خطرے سے ناواقف نہ تھے چنانچہ انہوں نے اس سخت گھڑی میں بھی اس
فتنہ کا مقابلہ کیا اور اورنگ زیب عالمگیر کی تخت نشینی میں انہوں نے مدد کی جو بچپن ہی سے نونہال

ذہین، نڈر، بختہ کردار کا مالک اور ہمت و استقلال میں اپنے تمام بھائیوں سے ممتاز تھا۔ فکر
عقیدہ کے لحاظ سے وہ شریعت کا پیرو اور قرآن کا حامل تھا۔ مختلف علوم و فنون میں مہارت
تھا، نہایت متدین اور خدا ترس تھا۔ شعر و ادب کا عمدہ ذوق رکھتا تھا۔ اس طرح اورنگ زیب
تخت نشینی اور کامیابی سے تاریخ ہند اسلام کی طرف مڑ جاتی ہے اور ہندوستان میں اسلامی
اور احیائے اسلام کی دوبارہ بنیاد پڑتی ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۱۸ء - ۱۷۰۷ء)

اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں اسلامی حکومت قدرے نمایاں شکل میں عوام کے سامنے آتی ہے۔ اس نے اپنی تمام جدوجہد احیائے اسلام اور شعائر اسلام کی ترویج و اشاعت میں صرف کی۔ رعایا کی خوشحالی، اقتصادی بہتری اور مادی سہولیات کی طرف خصوصی توجہ دی۔ برائیوں کو دُور کرنے اور معاشرے کو پاکیزہ بنانے کے لئے متعدد اصلاحی اقدامات کئے۔ تخت نشین ہوتے ہی بھنگ وغیرہ کی کاشت کرنے کی ممانعت کی۔ شراب نوشی کو ممنوع قرار دیا۔ قمار بازی بند کی۔ بدکاری کو روکنے کے لئے اقدامات کئے۔ بازاری عورتوں کو حکم دیا کہ وہ شادی کریں یا ملک چھوڑ دیں۔ ان احکام کی تعمیل اور نفاذ کے لئے محتسب مقرر کئے اور ۱۶۶۴ء میں ستی کے رسم کی مخالفت کی اور بچوں کو غلام یا خواجہ سرا بنانے کے خلاف حکم جاری کئے۔ جو بے راہ روی، بے مقصدیت اور بدکرداری اکبر کی پالیسی کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی اور سالوں پروان چڑھی تھی ان کے خلاف سینہ سپر ہو گیا۔ درشن کے طریقہ کو موقوف کیا۔ ریشمی زربفت اور کمخواب کے کپڑوں کو ممنوع قرار دیا۔ نوروز منانے اور تلک لگانے کی رسم بند کی۔ موسیقی کا اگرچہ وہ ماہر تھا لیکن گانے والوں اور گانے والیوں کو دربار سے رخصت کر دیا۔ سالگرہ کے موقعہ پر ہونے والے اسراف کو بند کیا۔ رعایا ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی، اس نے بہتیرے محاصل منسوخ کر دیئے بقول سرکار تقریباً ۸۰ ٹیکس اس نے معاف کئے۔

وہ ایک زبردست عالم دین تھا اور عالموں اور بزرگوں کی قدر افزائی کرتا تھا۔ اس نے علوم و فنون کی ہمت افزائی کے لئے متعدد مراعات عطا کیں۔ ملک کا نظم و نسق شرع کے اصولوں پر قائم کیا اور عدل و انصاف کا محکمہ متدین علماء کے ہاتھ میں دیا۔ اسلامی شریعت کے مطابق مقدمات کے فیصلے کے لئے ایک مستند اور جامع کتاب ملک کے مایۂ ناز اور قابل قدر علماء کو جمع کر کے مرتب کرائی، جو فتاویٰ عالمگیری کے نام سے مشہور ہے اور آج تک بڑی اہم اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ مولانا سید عبدالحی حسنی مرحوم اپنی کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" میں لکھتے ہیں:

"فتاویٰ عالمگیری جسے فتاویٰ ہندیہ کہا جاتا ہے کثرت مسائل، سہل طرز نگارش اور پیچیدہ گتھیوں

کو سلجھانے کے لئے نہایت مفید کتاب ہے۔ مصر وشام اور بلاد عرب میں یہ فتاوی ہندیہ کے نام سے مشہور ہے، اس کی چھ بڑی بڑی جلدیں ہیں جنہیں ہدایہ کی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے اور نوادر سے قطع نظر کرکے صرف ظاہر الرّوایات پر اکتفا کیا گیا ہے لیکن جس مسئلہ میں ظاہری روایت نہ مل سکی اس میں نادر روایتوں کو علامتِ فتویٰ کے تحت بے کم و کاست صاحبِ عبارت کے حوالہ کے ساتھ اصل عبارت نقل کردی ہے فقہائے احناف کی مدد سے اس جمع وتدوین کا کام سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ نے ابتدائی عہدِ سلطنت میں شیخ نظام الدین برہانپوری کے سپرد کیا تھا اور دو لاکھ روپے اس پر صرف کئے تھے۔ مؤلف مذکور نے ۴۲ ممتاز ہندوستانی علماء کے نام گنائے ہیں جنہوں نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں حصہ لیا۔ ان میں چار علماء یہ ہیں: قاضی محمد حسین جونپوری محتسب، شیخ علی اکبر حسینی، اسعد اللہ خانی، شیخ حامد بن ابو حامد جونپوری اور مفتی محمد اکرم حنفی لاہوری، ان چاروں علماء نے تدوین کے کام کی مل کر نگرانی کی ہے[۱]

وہ خود ایک وسیع سلطنت کا مطلق العنان حکمراں تھا لیکن تاریخ میں اس حیثیت سے منفرد ہے کہ اس نے تخت پر بیٹھ کر فقیری کی۔ اور سادہ زندگی بسر کی۔ ریشمی حریر اور دیبا کے لباس کو نہ صرف ترک کیا بلکہ ان پر پابندی عائد کی بیت المال کے روپیہ کو باوجود کسی روک ٹوک نہ ہونے کے وہ ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ اپنی روزی خود ٹوپیاں بناکر اور قرآن شریف لکھ کر کماتا تھا۔ عملاً مشقت ومحنت کی حلال کمائی کھاکر دوسروں کو اس نے ترغیب دی۔ اس طرح سادگی اور عزم واستقلال کے ساتھ اس نے اپنے نصف صدی کے دورِ حکومت میں شریعت اسلامی کی ترویج واشاعت کرکے ہندوستان میں دوبارہ اسلامی تہذیب وتمدن کی داغ بیل بھی رکھی اور جس وقت اس دارِ فانی سے کوچ کیا تو اس کی وصیت کے مطابق چار روپے دو آنے جو اس نے ٹوپیاں بناکر کمائے تھے، اس کے کفن پر خرچ کئے گئے اور تین سو پانچ روپیہ، جو قرآن شریف لکھ کر کمائے تھے وہ مساکین وغرباء میں تقسیم کردیئے گئے۔

غرضیکہ اورنگ زیب کا دورِ حکومت مسلمانوں میں ملّی اور قومی احساس کو پیدا کرنے میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اگر اس دور میں اسلامی تہذیب وتمدن اور شعائر اسلام کو فروغ دے کر کفر کی طاقت کو زیر نہ کیا جاتا تو اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہوجاتا۔

---

[۱] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند از عبدالحی حسنی ص ۱۱۰، ۱۱۱

جادو ناتھ سرکار اورنگ زیب کی شخصیت اور کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"جسمانی ہمت اور تمکنت کے علاوہ وہ اوائل زندگی ہی سے ایک بادشاہ کے شایانِ شان محنت و مشقت اور خطرات کا سامنا کرنے کا عادی بن چکا تھا۔ اس نے احترام ذات خود شناسی اور ضبطِ نفس سے کام لے کر اپنے آپ کو اس عظیم الشان منصب کے لئے تیار کیا۔ اورنگ زیب بادشاہوں کے لڑکوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ ایک وسیع النظر اور سلیم الفطرت عالم تھا۔ آخر دم تک کتابوں سے محبت اس کا شیوہ رہا۔ اگر ہم قرآن مجید کے ان متعدد نسخوں سے صرف نظر بھی کرلیں جو اس نے ایک عابد و زاہد کی سی مشقت کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے لکھے، تب بھی یہ حقیقت ناقابل فراموش ہے کہ وہ ایک مشغول حکمراں ہونے کے باوجود، فرصت و فراغت کے قلیل اوقات فقہی و دینی کتابوں کے پُرشوق مطالعے اور پرانے نادر مخطوطات مثلاً نہایہ، احیاء العلوم اور دیوان صائب کی تلاش میں گزارتا۔ اس سلسلے میں اس کی کیفیت کسی کامل عاشق سے کم نہ تھی۔ اس کے کثیر التعداد رقعات ظاہر کرتے ہیں کہ وہ فارسی شاعری اور عربی ادب پر کامل قدرت رکھتا تھا۔ وہ جب بھی کوئی خط لکھتا اسے مناسب اشعار و اقتباسات سے مزین کرتا۔ وہ عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی اور ہندی بے روک ٹوک بول سکتا تھا۔ اسی کی جودتِ طبع اور سرپرستی کے طفیل آج ہمارے پاس ہندوستان میں مسلمانوں کے قانون کا سب سے بڑا خلاصہ فتاویٰ عالمگیری ہے جو بجا طور پر اس کے نام سے منسوب ہے۔ اور جس سے بعد کے ادوار میں ہندوستان میں اسلامی نظام عدل کو آسانی اور وضاحت کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔"

مآثر عالمگیری کا مولف اورنگ زیب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی ان الفاظ میں کرتا ہے

"حضرت خلد مکان اپنی فطری سعادت کی وجہ سے دینی احکام و شعائر کے سخت پابند تھے۔ قبلۂ عالم حنفی المذہب سُنّی تھے اور اسلامی فرائض خمسہ کی پابندی اور ان کے اجراء و نفاذ میں نہایت کوشاں رہتے۔ حضرت ہمیشہ باوضو رہتے۔ کلمہ طیبہ اور دیگر اوراد و وظائف ہر وقت زبان پر جاری رہتے۔ نماز اول وقت میں مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کرتے اور تمام سُنن و نوافل بے حد خلوص اور حضورِ قلب کے ساتھ ادا فرماتے۔ ایام بیض کے روزوں کے بے حد پابند تھے اور ہفتے میں دوشنبہ، پنجشنبہ اور جمعہ کو صائم رہتے تھے۔ جمعہ کی نماز بھی مسجد میں تمام مسلمانوں کے ساتھ ادا فرماتے۔ مقدس شب ہائے اسلامی بیداری و

عبادت میں بسر فرماتے اور انوار فیض الٰہی سے چراغ دین و دولت ہو کر اپنی دینی شعاع سے اہل علم کو منور فرماتے ۔

قبلۂ عالم حق طلبی کے شیدائی تھے ۔ حضرت کا معمول تھا کہ دولت خانے کی مسجد میں تمام رات اہل اللہ کے ساتھ سرگرم گفت گو و ذکر رہتے اور خلوت میں کبھی تکیہ و مسند پر جلوس نہ فرماتے ۔

حضرت نے کبھی غیر مشروع لباس زیب تن نہ فرمایا ۔ اور چاندی سونے کے برتنوں کے استعمال سے ہمیشہ احتراز فرماتے رہے ۔

بادشاہ رعیت نواز نے کبھی ایسا حکم صادر نہیں فرمایا ، جو رفاہ عامہ کے منافی ہو اور کبھی ایسے فعل کے مرتکب نہیں ہوئے جو مخلوق خدا کی پریشانی کا باعث ہو ۔ زنان بازاری اور دیگر فواحش کے شیدائی دار الحکومت سے خارج کر دیئے گئے تھے اور تمام ممالک محروسہ میں اس قسم کے احکام جاری تھے ۔ احتساب کا محکمہ قائم تھا اور عاملان احتساب ہر شخص سے باز پرس کرتے تھے اور تمام ممالک محروسہ میں سلطنت کی وسعت کے باوصف احکام شرعی جاری و نافذ تھے[1]

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر نے احکام شرعی کے احیاء و ترویج کے لئے کافی کوششیں کیں اور مملکت میں منکرات کی روک تھام اور معروفات کا چلن عام کرنے کے لئے اپنی طاقت لگا دی ۔ اس کے دور میں اسلامی حکومت کی قدر نے نمایاں شکل سامنے آتی ہے اور ہر چیز پر اسلامی تہذیب کی چھاپ پڑتی دکھائی دیتی ہے ۔ اور اکبر کا فلسفہ متحدہ قومیت اپنی موت آپ مرجاتا ہے ۔

---

[1] ماخوذ از حضرت مجدد الف ثانی کے سیاسی مکتوبات مرتب آباد شاہ پوری ص ۱۵۱ ، ۱۵۲

بھگتی تحریک
اسلام کے خلاف سازش

جب مسلمان ہندوستان میں آئے اور اخلاق و محبت، انسانیت و مساوات اور اعلیٰ انسانی اقدار کا بہترین نمونہ پیش کیا اور اس کے نتیجہ میں چھوت چھات اور اونچ نیچ پر قائم ہندوستانی معاشرہ زیر و زبر ہونے لگا تو ہندو مفکرین اور مذہبی مصلحین نے مسلم خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ ہندو جوگیوں اور فلسفیوں نے اسلام کی روح کو مسخ کر کے اور مسلمانوں کی تہذیبی و تمدنی انفرادیت ختم کر کے ایک متحدہ کلچر اور نئے فرقے کو جنم دیا جو بھگتی تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ اس تحریک کا آغاز گیارھویں صدی میں جنوبی ہندوستان سے ہوا[1] تاہم جلد ہی اس نے پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا[2]۔ اس کا اولین قابل ذکر نمائندہ رامانج ہے تاہم بھگتی تحریک کی وسیع تر عوامی مقبولیت رامانند کی مرہونِ منت ہے اس لئے اسے اس تحریک کا بانی قرار دیا جاتا ہے اور بھگت کبیر اور گرونانک اس تحریک کے سب سے بڑے علمبردار رہے ہیں، ڈاکٹر سید عابد حسین لکھتے ہیں:

> "چونکہ یہ لوگ (عرب تاجر) امن پسند دیانت دار تاجروں کی حیثیت سے آتے تھے اس لئے ہندو راجہ اور پرجا کے دلوں میں ان کی بڑی قدر تھی۔ ان لوگوں کو نہ صرف اپنے مذہبی عقیدے اور عمل میں بلکہ اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے بارے میں بھی پوری آزادی حاصل تھی اور وہ اس سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ ابتدائی عہد کے پرجوش مسلمان جہاں کہیں گئے، انہوں نے علاوہ اس اثر کے جو براہ راست اسلام کی تعلیم سے پڑتا تھا، بالواسطہ یہ اثر ڈالا کہ لوگوں کے دلوں میں مذہبی احساس کی دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دیا اور ان کی مذہبی زندگی میں حرکت و ہیجان پیدا کر دیا[3]۔"

---

[1] احیائے اسلام کا بحران۔ نیا دور شمارہ ۶۳-۶۴ ص ۱۱۶۔ از جاذ احمد فاروقی۔

[2] پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء ص ۱۸۰-۲۱۷، از سید سبط حسن۔

[3] قومی تہذیب کا مسئلہ از سید عابد حسین ص ۵۶

یہ حرکت اور ہیجان تقریباً اسی قسم کا تھا جو آج جنوبی ہند میں ہریجنوں کے قبول اسلام سے ہندو لیڈروں اور ہندو مذہبی رہنماؤں میں پایا جاتا ہے۔

ان مذہبی مصلحین نے دیکھا کہ اسلام کی سیدھی سادی تعلیمات سے اور مسلمانوں کے عملی مظاہرہ سے ہندو معاشرہ متاثر ہو رہا ہے تو اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ تصور پیش کرنا شروع کیا کہ ذات پات کا فرق خدا کی محبت کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ سارے مذاہب ایک ہی حقیقت تک پہنچاتے ہیں وہ سب اپنی جگہ درست ہیں۔ ہندو مسلمان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ رام رحیم ایشور سب ایک ہی خدا کے نام ہیں۔ گرونانک جی کہیں کہیں قرآن پاک کی تعریف کرتے ہیں اور رسول اکرمؐ کی قصیدہ خوانی کرتے نظر آتے ہیں، مثال کے طور پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتے ہیں:

اُٹھے پہر بھوندا پھرے کھاون سنڈرے رسول
دوزخ پوندا کیوں رہے جاں چلت نہ ہوے رسول

یعنی جن لوگوں کے دل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت نہیں ہے وہ اس دُنیا میں بھٹکتے پھریں گے اور مرنے کے بعد ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

کھاون قسم قرآن دی۔ کارن ونی حرام
آتش اندر سڑسن آکھے نبی کلام

(قرآن جیسی بے نظیر کتاب کی جھوٹی قسم جو لوگ کھاتے ہیں وہ بڑا ذلیل اور بڑا حرام کام کرتے ہیں وہ بلاشبہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے اور یہی نبیؐ کا ارشاد ہے۔)

تیہئے صرف قرآن دے تیہئے سپارے کین
تس وچ پند نصیحتا سُن سُن کرو یقین

(قرآن پاک کے تیس حروف اور تیس ہی پارے ہیں اور اس اکمل کتاب میں لاانتہا نصیحتیں ہیں اے سُننے والو! نہ صرف سُنو بلکہ اس پر ایمان لاؤ)

لیکن مسلک ان کا وہی وحدت ادیان کا ہے۔ سارے مذاہب کو ایک سمجھتے اور نجات کے لئے کسی بھی مذہب کی پیروی کو کافی گردانتے ہیں کہتے ہیں:

کوئی بولے رام رام کوئی خدا
کوئی سیوے گسیا کوئی اللہ
کارن کرن کریم کرپا دھار رحیم

یعنی کوئی رام رام کہتا ہے اور کوئی خدا کو پکارتا ہے۔ سب سے خدا خوش ہوگا اور سب کو نجات دے گا۔

قرآن کے بارے میں کہتے ہیں:

کل پروان کتیب قرآن
پوتھی پنڈت رہے پوران
نانک ناؤں بھیا رحمان
کر کرتا تو ربکو جان

یعنی کلجگ کے زمانہ میں یہ کتاب قرآن مجید ہے اب پوتھی اور تمام پوران منسوخ ہو گئے ہیں اور اب خدائے تعالیٰ کا نام رحمٰن مشہور ہوا ہے۔ کرتا پورکھ اور رحمٰن میں کوئی فرق نہیں ہے[1]۔

گرونانک کا عقیدہ تھا کہ اگر کوئی سچائی پر عمل کرتا ہے اور خدا سے محبت رکھتا ہے تو وہ مسلمان ہے اس لحاظ سے گرونانک اپنے آپ کو بھی مسلمان کہتے ہیں[2]۔

کبیر داس جی کے یہاں یہ نظریہ اور زیادہ نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ اس نظریہ میں "ایک طرف وہ نغمۂ عشق ہے جو ذات الٰہی کی محبت اور مرشد کی عقیدت سے معمور ہے اور دوسری طرف نعرۂ جنگ ہے ظاہری مذہب کی رسوم و روایات اور عقائد و عبادات کے خلاف[3]"۔ انہوں نے یہ سوچ دی کہ مذہبی پابندی اور تقسیم بے معنیٰ ہے اور ان سے نسل انسانی کو دُکھ اُٹھانا پڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بھگت کبیر ابن عربی کے فلسفہ وحدت الوجود سے متاثر تھے[4]۔ ابن عربی کا فلسفہ شعری قالب میں یوں تھا:

"آج کے دن سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ جس ساتھی کا دین مجھ سے نہ ملتا میں اس کا انکار کرتا اور اسے اجنبی سمجھتا، لیکن اب میرا دل ہر صورت کو قبول کرتا ہے۔ وہ ایک چراگاہ

---

[1] سکھ مسلم تاریخ حقیقت کے آئینے میں از ابوالامان امرتسری ص ۴۸، ۴۹۔

[2] Great Guru Nanak and the Muslims by N. D. Ahuja, P. 1-5

[3] قومی تہذیب کا مسئلہ از سید عابد حسین ص ۸۰

[4] دین الٰہی اور اس کا پس منظر از پروفیسر محمد اسلم ص ۱۴۲

بن گیا ہے غزالوں کی، دیر راہبوں کا اور آتش کدہ آتش پرستوں کا اور کعبہ حاجیوں کے لئے۔ اور دہ الواح ہے تورات کی اور صحیفہ ہے قرآن کا۔ میں اب مذہب عشق کا پرستار ہوں، عشق کا قافلہ جدھر چاہے مجھے لے جائے۔ میرا دین بھی عشق ہے۔ میرا ایمان بھی عشق ہے"

بھگت کبیر نے ایک دوہے میں اسی فلسفے کا اظہار یوں کیا:

"وہ خود حق ہے۔ خود ہی تخم ہے۔ خود ہی نامیہ۔ وہ خود ہی پھل پھول ہے اور خود ہی سایہ۔ وہ خود برہما ہے اور خود مخلوق و مایا بھی۔ ہر دل میں موجود ہے ہر ایک ظرف میں اس کی جلوہ گری ہے"[1]

بھگت کبیر نے مذہب کی رُوح کو اس کے اظہار کی خارجی صورتوں پر ترجیح دی۔ ان کے نزدیک ملہ مذاہب کا جوہر مشترک ہے۔ ظاہر پرستی اور روایت پسندی کے خلاف ان کی نفرت حد سے بڑھی ہوئی تھی[2] گرونانک بھی" مذہب کے ظاہری اور رسمی پہلو سے اتنے ہی بیزار تھے جتنے کبیر مگر وہ محض واردات قلب کو مذہب کی کائنات نہیں سمجھتے بلکہ اخلاقی عمل کو اس سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ ذات پات کے قائل نہیں مگر تناسخ کو مانتے ہیں"[3]

ان تعلیمات سے پتہ چلتا ہے کہ شعوری طور پر اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ ایک طرف ہندو معاشرہ کو بچایا جائے اور مسلم معاشرہ کی پاکیزگی، انفرادیت اور علیحدگی کو ختم کرکے ایک متحدہ کلچر اور تصور کی بنیاد رکھی جائے جس میں اسلام اور ہندومت دونوں کی کچھ چیزوں کو شامل کر لیا گیا تھا۔

یہ تحریک وسیع پیمانہ پر اضافہ و ترمیم کے ساتھ جنوبی ہند اور بنگال سے لے کر تمام شمال اور وسط ہند میں پھیلی۔ اس کا اثر مسلمانوں پر بھی ہوا۔ کبیر کے شاگردوں میں ہندو اور مسلمان دونوں کے نام ملتے ہیں۔ لیکن علماء جو ہمیشہ شریعت کی برتری اور فوقیت پر زور دیتے رہے ہیں ان کی مخالفت سے عامۃ المسلمین میں یہ فلسفہ اور تصور مذہب مقبول نہ ہو سکا۔

---

[1] تمدن ہند پر اسلامی اثرات از ڈاکٹر تارا چند اردو ترجمہ محمد مسعود احمد ص ۲۵۳، ۲۵۴

[2] افکار شاہ ولی اللہ از قاضی جاوید

[3] قومی تہذیب کا مسئلہ از سید عابد حسین ص ۸۱

تیسرا باب

صوفیاء و مشائخ اور تبلیغ اسلام

خواجہ معین الدین چشتیؒ

بابا فرید الدین گنج شکرؒ

حضرت نظام الدین اولیاءؒ

شاہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ

حضرت خواجہ باقی باللہؒ

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ

(ہندوستان کے اولیاء کرام، داعیان اسلام اور مشائخ عظام کے تذکرہ پر بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان میں بڑی ضخیم تصنیفات بھی ہیں لیکن یہ ایک عجوبہ ہے کہ جن بزرگوں کے ذریعہ یہاں اسلام پہنچا، جنہوں نے اپنی مساعی سے یہاں اسلام کے چراغ روشن کئے اور اپنے اخلاق و کردار سے تسخیر قلوب کی مہم انجام دی، ان کی جدوجہد اور مبارک کوششوں کو کشف و کرامات کی داستانوں میں ایسا چھپادیا گیا ہے کہ ان کی دینی تبلیغ و مساعی، تعلیم و تربیت کے نتائج اور اصل کمالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ بعض اوقات صدہا صفحات کی ایک کتاب سے بلکہ متعدد کتابوں کی مدد سے بھی ایک صفحہ کے بقدر بھی مواد حاصل نہیں ہوتا۔ عظیم ترین شخصیتوں کے تذکروں اور سوانح حیات میں اتنے بڑے خلا نظر آتے ہیں جن کو کسی قیاس اور عبارت آرائی سے بھرا نہیں جاسکتا۔ پوری کتاب خوارق و کرامات، محیر العقول واقعات اور عجائبات سے بھری ہوتی ہے[1]، مصنف کا سارا زور ان کے کشف و کرامات کے بیان کرنے پر صرف ہوجاتا ہے اور اس کو اس حد تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے ماوراء ہستی نظر آتے ہیں۔ وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ سوتے ہیں نہ اور خصائص انسانی سے ان کو سروکار ہے نہ علمی مشاغل سے ان کو کچھ واسطہ ہے ان کا صرف یہ کام ہے کہ وہ قانون فطرت کو ہمیشہ توڑتے رہیں اور موالید ثلاثہ و عناصر اربعہ پر اپنی حکومت و خود مختاری کو کسی طرح قائم رکھیں[2]۔

میں نے آئندہ صفحات میں چند صوفیاء و مشائخ کے حالات زندگی اور ان کی تبلیغی مساعی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مختلف کتابوں اور ملفوظات و مکاتیب سے خوشہ چینی کے نتیجہ میں تیار ہوسکی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ ہمارے ان مشائخ و صوفیاء نے اشاعت اسلام میں کتنا اہم رول ادا کیا ہے۔

ہندوستان کے سیاسی حالات پر آپ کی نگاہ ہو تو آپ یہ محسوس کئے بغیر نہ رہیں گے کہ ایک ایسا دور جبکہ حکمراں طبقہ اور سلاطین اسلام ارشاد و ہدایت کے بجائے تحصیل وصول اور فتوحات کے نشہ میں دُھت تھے، وہ اپنے فریضۂ منصبی سے نہ صرف غافل بلکہ اپنے کردار اور اپنے عمّال و حکّام کے اعمال بد کے

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت حصہ سوم ص ۱۳، از سید ابوالحسن علی ندوی۔

[2] یاد ایام (تاریخ گجرات) ص ۵۹، از مولانا سید عبدالحی حسنیؒ

لحاظ سے اس ذمہ داری کے لئے نقصان دہ اور اس راہ میں مزاحم ہوں، انہیں ہر نئی دعوت، ہر نئی تنظیم اور ہر نئی تحریک جس میں قیادت وسیادت اور سمع وطاعت کی روح موجود ہو، کا وجود اور اس کی بقاو استحکام گوارانہ ہو، وہ اس طرح کی ہر کوشش کو کچل کر رکھ دیں، ایسی صورت میں مسلمانوں میں حرکت وعمل کی رُوح بیدار کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی راہ نہ تھی کہ خدا کے چند بندے اپنی اپنی جگہ اس الحاد ولادینیت کا مقابلہ کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں اور مسلمانوں سے ایمان وعمل اور اتباع شریعت کے لئے بیعت لے کر ان کی سابقہ زندگی کو پاک وصاف اور گناہوں سے بچانے کی کوشش کریں اور :

"پھر وہ نائب پیغمبران کی دینی نگرانی اور تربیت کریں۔ اپنی کیمیا اثر صحبت، اپنے شعلۂ محبت اپنی استقامت اور اپنے نفس گرم سے پھر ایمانی حرارت، گرمیٔ محبت، خلوص وللّٰہیت، جذبۂ اتباع سُنّت اور شوق آخرت پیدا کردے ان کو اس نئے تعلق سے محسوس ہو کہ انہوں نے ایک زندگی سے توبہ کی ہے اور ایک نئے دور میں قدم رکھا ہے اور کسی اللہ کے بندے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے، وہ بھی یہ سمجھے کہ ان بیعت کرنے والوں کی اصلاح وتربیت اور ان کی دینی خدمت اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی ہے اور اس محبت واعتماد کا مجھ پر نیا حق قائم ہوگیا ہے پھر اپنے تجربوں واجتہاد اور کتاب وسُنّت کے اصول وتعلیمات کے مطابق ان میں صحیح رُوحانیت وتقویٰ اور ان کی زندگی میں ایمان واحتساب واخلاص اور ان کے اعمال وعبادات میں ایمانی کیفیات اور رُوح پیدا کرنے کی کوشش کرے یہی حقیقت ہے اس بیعت تربیت کی جس سے دین کے مخلص داعیوں نے اپنے اپنے وقت میں احیاء وتجدید دین اور اصلاح مسلمین کا کام لیا ہے[1]"

چنانچہ حضرت خواجہ فریدالدین کے بیعت لینے کا طریقہ اور ان کی تلقین ونصیحت کتابوں میں جو ملتی ہے وہ یہ ہے کہ :

"جب کوئی شیخ شیوخ العالم فریدالدین والحق کی خدمت میں بہ نیت ارادت آتا فرماتے پہلے ایک بار سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھو اس کے بعد سورۂ بقرہ کا آخری رکوع آمَنَ الرَّسُوْلُ سے آخر تک پڑھتے اس کے بعد شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ... اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ تک پڑھتے اس کے بعد فرماتے کہ تم نے

---

[1] تاریخ دعوت وعزیمت حصہ اوّل ص ۲۰۲ از سید ابوالحسن علی ندوی

بیعت کی اس ضعیف کے ہاتھ پر، اس کے شیخ اور شیخ کے مشائخ کے ہاتھ پر، اور حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست مبارک پر، اور حضرت عزت (جل مجدہٗ) سے عہد کیا کہ اپنے ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کی حفاظت کروگے اور شریعت کے راستہ اور طریقہ پر قائم رہوگے۔[1]

بیعت کی اس تلقین میں اسلام کے بنیادی عقائد آگئے، سمع و طاعت کا وعدہ اور ارادہ بھی آگیا، یہ بات بھی آگئی کہ اللہ کے یہاں قابل قبول دین صرف اسلام ہے، اس کا احساس بھی بیدار و تازہ کردیا گیا کہ یہ بیعت دراصل دست مبارک نبوی پر ہے اور شیخ کا ہاتھ اس دست مبارک کا قائم مقام ہے رب العزت سے اس کا بھی عہد کیا گیا کہ ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کی معصیتوں سے حفاظت کی جائے گی اور راہ شریعت پر قائم رہا جائے گا۔[2]

خواجہ معین الدین چشتیؒ

(والد کا نام غیاث الدین حسن تھا۔ سجستان جسے سیستان بھی لکھتے ہیں، آپ کی جائے ولادت ہے اسی نسبت سے آپ کو سنجری کہا جاتا ہے) بخارا اور خراسان میں علوم کی تکمیل کی۔ والد کے انتقال کے بعد پندرہ برس کی عمر میں ہرون (نیشاپور کی ایک نواحی بستی) آئے اور خواجہ عثمان چشتی کے مرید ہوئے اور خرقۂ خلافت حاصل کیا (طبقات ناصری کے مصنف قاضی منہاج الدین عثمان جوزجانی کے بیان کے مطابق حضرت خواجہ سلطان شہاب الدین غوری کے اس لشکر کے ساتھ تھے جس نے پرتھوی راج کو شکست دے کر دہلی فتح کیا تھا۔ اس فتح میں ان کی دعاؤں، توجہات اور روحانیت کا بہت بڑا حصہ تھا۔ لیکن بعض سیرت نگاروں کے خیال میں دہلی کی فتح سے پہلے ہی قدیم ہندوستان کے دارالسلطنت اجمیر میں منتقل ہوگئے تھے اور کفر کی تاریکیوں میں چراغ ایمان و توحید روشن کردیا تھا۔ بہرحال واقعہ کی ترتیب کچھ بھی ہو، حضرت خواجہ ہی کے طفیل یہاں اسلام کی اشاعت ہوئی اور کفر و شرک کی تاریکیوں میں توحید و مساوات کے دیپ روشن ہوئے۔[3] سیر الاولیاء کے

---

[1] سیر الاولیاء ص ۳۲۴۔ [2] تاریخ دعوت و عزیمت حصہ سوم ص ۱۳۸، از سید ابوالحسن علی ندوی

[3] سوانح تفصیل سے دیکھئے: ۱۔ خواجہ غریب نواز از شبیر حسن چشتی نظامی، ۲۔ سوانح خواجہ معین الدین چشتی از وحید احمد مسعود

مصنف لکھتے ہیں:

"ملک ہندوستان اپنے آخری مشرقی کنارہ تک کفر و شرک کی بستی تھی۔ اہل تمرد أنا ربکم الأعلیٰ کی صدا لگا رہے تھے اور خدا کی خدائی میں دوسری ہستیوں کو شریک کرتے تھے اور اینٹ پتھر، درخت، جانور گائے وگوبر سب کو سجدہ کرتے تھے۔ کفر کی ظلمت سے ان کے دل تاریک اور مقفل تھے۔ سب دین و شریعت کے حکم سے غافل، خدا و پیمبر سے بے خبر تھے۔ نہ کسی نے کبھی قبلہ کی سمت پہچانی نہ کسی نے اللہ اکبر کی صدا سنی۔ آفتاب اہل یقین حضرات خواجہ معین الدین کے قدم مبارک کا اس ملک میں پہنچنا تھا کہ اس ملک کی ظلمت نور اسلام سے مبدل ہو گئی ان کی کوشش و تاثیر سے جہاں شعائر شرک تھے وہاں مسجد و محراب و منبر نظر آنے لگے۔ جو فضا شرک کی صداؤں سے معمور تھی وہ نعرۂ اللہ اکبر سے گونجنے لگی۔ اس ملک میں جس کو دولت اسلام ملی اور قیامت تک جو بھی اس دولت سے مشرف ہوگا نہ صرف وہ بلکہ اس کی اولاد در اولاد، نسل در نسل سب ان کے نامۂ اعمال میں ہوں گے اور اس میں قیامت تک جو بھی اضافہ ہوتا رہے گا اور دائرۂ اسلام وسیع ہوتا رہے گا قیامت تک اس کا ثواب شیخ الاسلام معین الدین حسن سنجری کی روح کو پہنچتا رہے گا۔[1]"

آپ کے ہاتھ پر اس کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے ہیں کہ تاریخ کے اندھیرے میں اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ آپ کے پاکیزہ اخلاق، صاف ستھری زاہدانہ زندگی، ایمان و یقین کی قوت، خلق خدا کے ساتھ ہمدردی اور بلا تفریق مذہب و ملت تمام انسانوں سے محبت اور انسانیت کا احترام یہ وہ بلند ترین صفات تھیں جنہوں نے دشمنوں کو بھی دوست بنایا۔ اسی لئے مولانا غلام علی آزاد کا کہنا صحیح ہے کہ:

"لاشک بزرگان چشت عنبر سرشت را حقی است قدیم بر ولایت ہند۔[2]"

یعنی اس میں شبہ نہیں کہ بزرگان سلسلۂ چشت کا ملک ہندوستان پر حق قدیم ہے۔

اور صاحب سیر الاقطاب کا یہ لکھنا بھی صحیح ہے کہ:

"بہ ہندوستان بہ یمن قدوم میمنت لزومش طریقۂ اسلام ظاہر گشت و سیاہی کفر و

---

۱ سیر الاولیاء از امیر خورد ص ۴۷۔

۲ مآثر الکرام از مولانا غلام علی آزاد ص ۷

شرک از عرصۂ روزگار بزدود[1]

یعنی ہندوستان میں ان کے قدم کی برکت سے اسلام کی اشاعت ہوئی اور کفر کی ظلمت یہاں سے کافور ہوئی۔

اجمیر پر آپ کی آمد کا جو اثر ہوا اس کی نسبت صاحب سیر العارفین لکھتے ہیں کہ:

"بیشترے کفار نامدار ازاں دیار بہ برکت آثار آں زبدۃ الابرار بہ تشریف ایمان مشرف شدند و بیشتریکہ ایمان نیاوردند او فتوح بے حد و عد بحضرت ایشاں مے فرستادند کہ ہنوز آں کفار بداں غلط معتقد ند۔ بر سالے مے آیند و سر بر خاک آں آستانۂ عظیم القدر و آں بدر سپہر مشیخت مے نہند و مبلغ ہائے کلی بمجاوران روضۂ مطہرۂ ایشاں مے رسانند و خدمتے بجائے مے آیند[2]"

"بہت سے بڑے بڑے کفار حضرت کی برکت اور کوششوں سے مشرف بایمان ہوگئے اور بیشتر مسلمان تو نہ ہوئے لیکن آپ کے دربار میں بڑے نذرانے پیش کرتے رہے۔ اور جو غلط عقیدہ رکھتے تھے وہ اس عظیم آستانہ اور مشیخت کے بدر منیر کے قدموں میں سر رکھتے رہے اور اس روضہ کے مجاوروں کو بڑے بڑے تحفہ تحائف پہنچاتے رہے اور ان کی خدمت کرتے رہے۔"

جب آپ اجمیر میں مقیم ہوئے تو وعظ و نصیحت، تبلیغ و اصلاح اور ارشاد و تربیت میں زندگی پوری کی لیکن کسی قدیم تاریخی ماخذ میں ان تبلیغی مساعی کی تفصیلات اور ان کے نتائج و اثرات کا مستند و معین طریقہ پر تذکرہ نہیں ملتا۔ عام طور پر اتنا ذکر کیا جاتا ہے کہ کثیر و عظیم تعداد میں بندگانِ خدا نے اُن سے ایمان و احسان کی دولت پائی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے[3]

---

[1] سیر الاقطاب ص ۱۰۱ بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ سوم ص ۳۰

[2] سیر العارفین ص ۱۲ ماخوذ از آب کوثر، شیخ محمد اکرام ص ۲۸ — ۲۲۷

[3] تاریخ دعوت و عزیمت حصہ سوم ص ۳۰ سید ابوالحسن علی ندوی

بابا فرید الدین گنج شکرؒ

۵۶۹ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ صغر سنی میں ملتان کا سفر کیا اور وہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ مولانا منہاج الدین ترمذی سے فقہ کی کتاب "النافع" پڑھی۔ وہیں ۵۸۴ھ میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملاقات ہوئی اور ان کے گرویدہ ہو گئے۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جا کر تعلیم کی تکمیل کی۔ تکمیل کے بعد ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ اس سے فراغت پانے کے بعد سند خلافت سے سرفراز ہوئے۔ ۶۶۴ھ میں اجودھن (پاک پتن) میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

حضرت خواجہ نظام الدین فرماتے ہیں کہ عجب قوت اور عجب طرز زندگی تھا، جس کا تحمل کسی سے آسان نہیں۔ نئے آنے والے جو کبھی نہیں آئے، اور برسوں کے ساتھ رہنے والے سب سے یکساں لطف و مہربانی اور توجہ کے ساتھ پیش آتے (مولانا بدر الدین اسحاق فرماتے ہیں کہ میں خادم خاص تھا۔ جو کچھ کہنا ہوتا مجھ سے فرماتے۔ خلوت و جلوت میں یکساں حال تھا۔ ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہ تھا۔ برسوں خدمت کرنے اور ساتھ رہنے کے باوجود کوئی تفاوت نہ دیکھا۔)

آپ نے اپنی زندگی کا اصول ارباب حکومت سے بے تعلقی اور کنارہ کشی کو بنایا تھا چنانچہ نہایت سختی سے اس اصول پر کاربند رہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین بیان کرتے ہیں کہ ایک دن شیخ حجرے میں تھے، سر برہنہ تھا۔ اور چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا، حجرے میں والہانہ کیفیت میں پھرتے تھے اور یہ اشعار پڑھتے تھے:

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے تو زیم
خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم

مقصود من خستہ ز کونین توئی
از بہر تو میرم از برائے تو زیم

(میری آرزو ہے کہ ہمیشہ آپ ہی کا ہو کر جیوں، خاک ہو جاؤں اور آپ کے قدموں کے نیچے زندگی گزرے۔ مجھ مسکین و بے چارے کا دونوں جہان میں مقصود آپ ہی ہیں، آپ ہی کے لئے جیتا ہوں، آپ ہی کے لئے مرتا ہوں۔)

آپ کی مجلس اور خانقاہ میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے بقول "حضرت خواجہ فرید الدین کی خدمت میں ہر صنف و نوع کے لوگ درویش وغیر درویش پہنچتے تھے"[۱]

حضرت خواجہ کو اللہ نے جو عالی استعداد اور قلبی قوت عطا فرمائی تھی اس کے پیش نظر بعید نہیں کہ اشاعت اسلام میں وہ بھی معین ہوئی ہو اور نو مسلموں کی ایک بڑی تعداد آپ کے ہاتھوں مسلمان ہوئی ہو

پروفیسر آرنلڈ اپنی کتاب THE PREACHING OF ISLAM میں لکھتے ہیں:

"پنجاب کے مغربی صوبوں کے باشندوں نے خواجہ بہاء الحق ملتانی اور بابا فرید پاک پٹن کی تعلیم سے اسلام قبول کیا۔ یہ دونوں بزرگ تیرھویں صدی عیسوی کے قریب خاتمہ اور چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں گزرے ہیں۔ بابا فرید الدین گنج شکر کا تذکرہ جس مصنف نے لکھا ہے اس نے تحریر کیا ہے کہ سولہ قوموں کو انہوں نے تعلیم و تلقین سے مشرف بہ اسلام کیا لیکن افسوس ہے اس مصنف نے ان قوموں کے مسلمان ہونے کا مفصل حال نہیں لکھا۔"[۲]

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ:

"اشاعت اسلام میں جتنی کامیابی آپ کو ہوئی ہے، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کو شاید ہی ہوئی ہو۔ مغربی پنجاب کے کئی بڑے بڑے قبیلے آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے مثلاً سیال، راجپوت، وٹو وغیرہ"[۳]

اس کے علاوہ بڑے بڑے صاحب سطوت بزرگوں کی آپ نے تربیت بھی کی۔ ہندو پاکستان میں چشتیہ سلسلہ کو وسعت و استحکام بابا فرید کی ذات بابرکات سے نصیب ہوا۔ مخدوم علاء الدین صابرؒ حضرت سلطان المشائخ، قطب جمال الدین ہانسویؒ، حضرت امام الحق سیالکوٹیؒ، شیخ منتخب الدینؒ وغیرہ داعیان اسلام کی تربیت آپ ہی نے کی جنہوں نے دہلی، کلیر، سیالکوٹ اور دکن وغیرہ کے علاقوں میں اسلام کی تعلیمات کو عام کیا۔

۱۔ فوائد الفواد از امیر حسن علا سنجری ص ۵

۲۔ دعوت اسلام، ترجمہ مولوی عنایت اللہ دہلوی ص ۲۹۷

۳۔ آب کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۲۵۱

حضرت نظام الدین اولیاءؒ

(۶۳۶ھ - ۷۲۵ھ)

محمد نام نظام الدین لقب، اور والد ماجد کا نام احمد بن علی تھا۔ بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولانا علاء الدین اصولی سے حاصل کی۔ پھر سولہ سال کی عمر میں دہلی آ گئے وہاں مولانا شمس الدین خوارزمی کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔ حدیث کا درس شیخ محمد بن احمد المار یکلی سے لیا۔ اور حدیث کی اجازت حاصل کی۔ بیس سال کی عمر میں شیخ کبیرؒ سے بیعت ہوئے اور ان سے شیخ شہاب الدین سہروردی کی مشہور کتاب عوارف المعارف پڑھی۔

دُنیا سے تنفر اور عطایا و ہدائف سے بیزاری تھی۔ بادشاہوں سے دور رہتے اور فقر و استغنار کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک بار ایک امیر نے باغ اور بہت سی زمین ہبہ کرنی چاہی اور اپنی عقیدت و اخلاص کا اظہار کیا۔ آپ نے متبسّم ہو کر فرمایا کہ اگر میں اس کو قبول کر لوں تو لوگ کہا کریں گے کہ شیخ باغ کو گئے ہیں اور اپنی کھیتی اور زمین دیکھنے تشریف لے گئے ہیں میرے کام سے اس کو کیا مناسبت۔ ہمارے بزرگوں اور مشائخ میں سے کسی نے زمین جائداد قبول نہیں کی[1]

آپ نے تجدید ایمان اور توبۂ عام کی تحریک چلائی۔ لاکھوں بندگانِ خدا نے غفلت، خدا فراموشی، نفس پرستی، بدکرداری اور منکرات و شہوات سے توبہ کی اور خدا اور رسول کی اطاعت کا آپ سے معاہدہ کیا۔ آپ بیعت کے وقت انہیں اپنے ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کی حفاظت کرنے اور شریعت کے راستے اور طریقے پر قائم رہنے کی وصیت کرتے۔ چنانچہ بیعت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد اس اقرار و عہد کی لاج رکھتی تھی اور اس طرح یہ بیعت تجدید ایمان اور انقلاب حال کا ذریعہ بن جاتی تھی۔ آپ کے دور ن اس بیعت و تعلق کا مسلمانوں کی عمومی زندگی پر کیا اثر پڑا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اُس عہد کے تبر مورخ ضیاء الدین برنی کہتے ہیں:

"سلطان علاء الدین کے زمانہ کے مشائخ میں سے سجادۂ تصوّف شیخ الاسلام نظام الدین،

---

[1] فوائد الفواد ص ۹۹

شیخ الاسلام علاء الدین اور شیخ الاسلام رکن الدین سے آراستہ تھا۔ ایک دُنیا ان کے انفاس متبرکہ سے روشن ہوئی اور ایک عالم نے ان کی بیعت کا ہاتھ پکڑا اور ان کی مدد سے گناہگاروں نے توبہ کی اور ہزاروں بدکاروں اور بے نمازیوں نے بدکاری سے ہاتھ اُٹھالیا اور ہمیشہ کے لئے پابند نماز ہوگئے۔ اور باطنی طور پر دینی مشغلے کی طرف رغبت ظاہر کی، اور توبہ صحیح ہوگئی اور عبادات لازمہ اور متعدیہ کا معمول ہوگیا اور دُنیا کی حرص ومحبت جو انسانوں کے فوائد اور فرماں برداری کی بنیاد ہے، ان مشائخ کے اخلاقِ حمیدہ اور ترک و تجرید کے معاملات دیکھنے سے دلوں سے کم ہوگئی ------ ان بزرگوں کی عبادات و معاملات کی برکت سے لوگوں کے معاملات میں سچائی پیدا ہوگئی اور ان کے مکارم اخلاق و مجاہدہ و ریاضت کے دیکھنے سے اللہ والوں کے دلوں میں اخلاق کے بدلنے کی خواہش پیدا ہوئی۔"

پھر سلطان علاء الدین کے دینی اقدامات کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"دوسری طرف اسی زمانہ میں شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعت کا عام دروازہ کھول رکھا تھا اور گنہگاروں کو خرقہ پہناتے اور ان سے توبہ کراتے تھے اور اپنے مُریدوں میں قبول کرتے تھے۔ اور خاص وعام، غریب ودولت مند، بادشاہ وفقیر، عالم وجاہل، شریف ورذیل، شہری اور دیہاتی، غازی ومجاہد، آزاد وغلام سب کو طاقیہ، توبہ اور پاکی کی تعلیم دیتے تھے اور یہ تمام لوگ چونکہ اپنے کو شیخ کا مُرید سمجھتے تھے، بہت سے گناہوں سے باز آتے تھے، اور اگر شیخ کے کسی مُرید سے لغزش ہوجاتی تھی تو پھر از سرِ نو بیعت کرلیتے اور توبہ کا خرقہ عطا کرتے تھے اور شیخ کی مریدی کی شرم تمام لوگوں کو بہت سی ظاہری اور باطنی بُرائیوں سے روک دیتی تھی اور عام طور پر لوگ تقلید و اعتقاد کی وجہ سے عبادت کی طرف رغبت کرتے تھے ..... عہدِ علائی کے آخری چند سالوں میں شراب، معشوق، فسق وفجور، جوا، فحاشی وغیرہ کا نام اکثر آدمیوں کی زبان پر نہیں آنے پایا۔ بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے تھے۔ مسلمان ایک دوسرے کی شرم کی وجہ سے سود خواری اور ذخیرہ اندوزی کے کھُلم کھلا مرتکب نہیں ہوسکتے تھے۔ بازار والوں سے جھوٹ بولنے کم تولنے اور آمیزش کرنے کا رواج اُٹھ گیا تھا..... حاصل کلام یہ کہ خداوند تعالیٰ نے شیخ نظام الدین کو پچھلی صدیوں میں شیخ جنیدؒ اور شیخ بایزیدؒ کے مثل پیدا کیا تھا۔"[۱]

۱۔ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۶ — ۳۴۱ از ضیاء الدین برنی ماخوذ از بزم صوفیہ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ص ۱۹۹ تا ۲۰۲

اس سلسلۂ ارشاد و ہدایت کو ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلانے کے لئے آپ نے باہمت مُبلّغین اور خلفاء کی تربیت کا بھی اہتمام فرمایا، جن میں مولانا شمس الدین یحییٰ، شیخ نصیر الدین محمود، شیخ قطب الدین منور ہانسوی، شیخ حسام الدین ملتانی، مولانا فخر الدین زرادی، مولانا علاء الدین نیلی مولانا برہان الدین غریب، مولانا یوسف چندیری، مولانا سراج الدین اخی سراج اور مولانا شہاب الدین خاص طور پر مشہور و ممتاز ہوئے۔ آپ نے حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کو خلافت خاص عطا فرمائی جنہوں نے نہایت نامساعد حالات میں بھی رشد و ہدایت کا یہ چراغ روشن رکھا۔ پھر اسی چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوا جس نے جنوبی ہند میں نہیں سارے ہندوستان کو عشق و محبت کی گرمی سے تپا دیا میری مُراد سید محمد گیسو دراز ؒ سے ہے۔ اس طرح دہلی کے علاوہ ہندوستان کے مختلف مقامات پنڈوہ، لکھنوتی، دولت آباد، گلبرگہ، برہان پور، زین آباد، مانڈو، احمد آباد، صفی پور مانک پور اور سلون میں چشتی خانقاہیں قائم ہوئیں اور صدیوں تک علم و معرفت اور عشق و اخلاص کی شمع روشن رہی۔

حضرت خواجہ کو اہل ہند میں اشاعت اسلام سے بڑی دل چسپی تھی لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندو قوم جو اپنی پختگی قدامت پرستی اور ذات پات اور چھوت چھات کی پابندی میں خاص امتیاز رکھتی ہے اسے حسنِ تقریر سے مسلمان کر لینا آسان نہیں ہے بلکہ اس کے لئے طویل اور مؤثر صحبت کی ضرورت ہے۔ فوائد الفواد میں ہے کہ ایک غلام جو مسلمان تھا، حضرت کی مجلس مبارک میں حاضر ہوا اور اپنے ایک ہندو دوست کو اپنے ساتھ لایا اور کہا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ حضرت خواجہ نے اس غلام سے فرمایا کہ:

تمہارا یہ بھائی کچھ اسلام کی طرف بھی میلان رکھتا ہے؟ غلام نے عرض کیا کہ:

اس کو حضرت کے قدموں میں اسی لئے لایا ہوں کہ آپ کی نظر کیمیا اثر کی برکت سے یہ مسلمان ہو جائے۔ یہ سُنکر حضرت خواجہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فرمایا کہ:

کسی کے کہنے سُننے سے اس قوم کا دل نہیں پھرتا۔ ہاں اگر اس کو کسی نیک دل بندے کی صحبت میسّر آ جائے تو اُمید ہوتی ہے کہ اس کی صحبت کی برکت سے وہ مسلمان ہو جائے[1]

پچاس برس کے عرصے تک حضرت خواجہ کی خانقاہ کا دروازہ ہر انسان کے لئے کُھلا رہا۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۱۶۲

میوات کا علاقہ جو حضرت خواجہ کے مرکز غیاث پور سے جانب جنوب متصلاً واقع ہے، اور جہاں کے رہنے والوں کی رہزنی اور شورہ پشتی کی وجہ سے کچھ عرصہ پہلے سلطان ناصر الدین محمود کے زمانہ میں شہر پناہ دہلی کے دروازے سر شام ہی سے بند ہو جاتے تھے اور جن کی کئی بار غیاث الدین بلبن کو تادیب کرنی پڑی؛ حضرت خواجہ کے فیوض و برکات اور ان کی تعلیم و تربیت کے اثرات سے ضرور مستفید ہوا ہوگا اور عجب نہیں کہ اتنی بڑی تعداد میں میواتی انہیں کے زمانہ میں مسلمان ہوئے ہوں[1]۔ چنانچہ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ:

"شیخ نظام الدین صاحب کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ہندو گرویدہ اسلام ہو گئے۔ بعض اپنے رشتہ داروں کے ڈر سے مسلمان ہونے کا اظہار نہیں کر سکتے تھے، لیکن دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔"[2]

چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ سلطان فیروز تغلق کا وزیر اعظم خان جہان آپ ہی کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا۔ ڈاکٹر اقبال نے آپ کی انہی مساعی کے پیش نظر آپ کو مسیحا و خضر سے بھی اونچا مقام دیا ہے ؎

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۱۵ عدد ۲، از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، نیز تاریخ دعوت و عزیمت جلد سوم ص ۱۶۹

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ مشائخ چشت از خلیق احمد نظامی۔

حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی

(۱۶۵۰ء — ۱۷۲۹ء)

گیارھویں صدی میں سلسلہ چشتیہ کے مجدد حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی نے رشد وہدایت کی شمع ایسے زمانے میں روشن کی جب سلطنت مغلیہ کا آفتاب غروب ہو رہا تھا، معاشرہ پر انحطاط کے آثار نمایاں تھے۔ مذہب کی روح ختم ہو چکی تھی، بادشاہ جاہ طلبی اور اقتدار کی کشمکش میں مصروف تھے مسلمان اوہام کے تار و پود میں پھنسے تھے اور تبلیغ و اشاعت اسلام سے کسی کو دلچسپی نہ تھی! ایسے ماحول میں آپ اُٹھے اور اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دیا کہ

"ما و شما کار فراہم آوردن تنکہ و نقد و جنس نیست۔ فراہم آوردن دلہا مطلوب است[1]"

یعنی ہمارا اور تمہارا کام تنکہ و نقد و جنس جمع کرنا نہیں ہے بلکہ دلوں کا اکٹھا کرنا مقصود ہے۔

آپ کے اساتذہ میں شیخ برہان الدین معروف بہ شیخ بہلول اور شیخ ابو رضا ہندیؒ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ تکمیل علم کے بعد مدینہ منورہ روانہ ہوئے اور وہاں حضرت شیخ یحییٰ مدنی کی خدمت میں حاضری دی وہیں تصوف اور سلوک کی منزلیں طے کیں۔ شیخ نے انہیں خرقۂ خلافت سے نوازا اور ظاہری و باطنی نعمت سے سرفراز کیا۔ پھر دہلی واپس آئے اور درس و تدریس اور اصلاح و تبلیغ میں لگ گئے۔ اپنے عزیز ترین شاگرد شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کو دکن روانہ کیا تاکہ وہاں اصلاح و اشاعتِ دین کا کام انجام پائے۔ ایک مکتوب میں انہیں نصیحت کی:

"تم کو اللہ نے دکن کی ولایت عطا فرمائی ہے۔ تم یہ کام پورے طور پر انجام دو، میں نے اس سے پہلے تم کو لکھا تھا کہ لشکر میں جاؤ لیکن اب یہ حکم ہے کہ جہاں کہیں ہو اعلائے کلمۃ الحق میں مصروف رہو اور اپنے جان و مال کو اسی راہ میں صرف کر دو"[2]

---

[1] مکتوبات کلیمی مکتوب ۲۴ ص ۳۶ [2] مکتوبات کلیمی مکتوب ۲۱ ص ۲۶

آپ ہندوستان میں اسلام کو غالب و حکمراں دیکھنا چاہتے تھے اسی لئے اپنے شاگردوں کو بار بار تاکید کرتے تھے کہ جیسے بھی ہو کلمۃ الحق کی بلندی کے لئے جدوجہد کرو :

" درآں کوشید کہ صورت اسلام وسیع گردد و ذاکر ایں کثیر ہا[1]

(اس کی کوشش کرو کہ اسلام کا دائرہ وسیع اور اس کے حلقہ بگوش کثیر ہوں)

ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں :

" بہرحال در اعلائے کلمۃ الحق کوشید و از مشرق یا مغرب ہمہ حقیقی بر کنید[2]"

(ہر حال میں اعلائے حق کی کوشش کرو اور مشرق سے مغرب تک اسے غالب کر دو۔)

متوجہ اعلائے کلمۃ الحق باشند وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ[3]

" اعلائے کلمۃ الحق کی طرف متوجہ رہو اور اللہ اپنے نور کی تکمیل کر کے رہے گا چاہے کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو "

دعوت دین اور تبلیغ اسلام کی فضیلت اور ثواب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

واقرب عند اللہ و رسولہ آں کسے روز رستخیز است کہ در افشائے نور باطن ایمان ساعی است[4]

(قیامت کے دن اللہ اور اس کے رسول سے سب سے زیادہ قریبی وہ شخص ہوگا جو ایمان کی روشنی پھیلانے کی سعی و جہد کرے گا۔)

شیخ نظام الدینؒ کو اپنے ایک مرید کے منصب شاہی ملنے کی اطلاع دیتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ اپنے اصل نصب العین کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ :

اے برادر منصب ما و شما فقر است، کوشش کنید در اعلائے کلمۃ اللہ[5]

(اے بھائی، ہمارا اور تمہارا منصب فقر کا ہے کوشش اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے کرو)

ایک مرتبہ شیخ نظام الدین نے ایک شخص کے لئے خلافت کی سفارش کی تو ارشاد ہوا :

" جب تک اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے کمر ہمت نہ باندھی جائے خلافت سے کیا فائدہ "

---

[1] مکتوبات ۶۷ ص ۶۰

[2] مکتوبات ۸ ص ۶۲

[3] مکتوبات کلیمی ۸ ص ۶۲ ، [4] مکتوبات ۴۲ ص ۵۹ ، [5] مکتوبات ۲۹ ص ۲۹

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ:

"شیخ نظام الدین (شاگرد شاہ کلیم اللہؒ) صاحب کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ہندو گردیدۂ اسلام ہوگئے۔ بعض اپنے رشتہ داروں کے ڈر سے مسلمان ہونے کا اظہار نہیں کرسکتے تھے، لیکن دل سے مسلمان ہوچکے تھے۔"[1]

حضرت شاہ روحانی ترقی کے لئے اتباعِ شریعت پر زور دیتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ شریعت سے ہٹ کر جو کوشش بھی کی جائے گی وہ منزلِ مقصود تک پہنچانے میں ناکام رہے گی۔ بلکہ وہ کہتے تھے کہ جو شریعت کی راہ پر نہیں چلتا وہ گمراہ ہے، ایسا شخص طریقت کے منازل کبھی طے نہ کرسکے گا۔

سماع کے خلاف بھی آپ نے آواز اٹھائی۔ اور تاکید کی کہ مراقبہ کا حلقہ سماع سے زیادہ وسیع کرنا چاہیئے امیروں اور سرداروں کی اصلاح کی طرف بھی آپ نے توجہ کی اور اپنے مریدوں کو تلقین کی کہ احیاءِ ملت اور ترویج دین کے لئے جب کوشش ہو تو معاشرہ کے کسی حصہ کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

۱۷/ اکتوبر ۱۷۲۹ء کو انتقال فرمایا۔ آپ کے بعد آپ کے خلفاء نے اس کام کو سنبھالا اور اپنی اپنی بساط کے مطابق رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیا۔

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص ۴۰۱، خلیق احمد نظامی

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ

مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ (۶۶۱ھ — ۷۸۲ھ) کا کارنامہ بھی ناقابل فراموش ہے آپ نے نہ صرف یہاں کے ہزاروں باشندوں کو خدا کا راستہ دکھایا اور انہیں نورِ اسلام سے منور کیا بلکہ دین کی حفاظت کا فرض بھی انجام دیا۔ مسلمانوں کے دین و ایمان کو غالی صوفیوں کی بے اعتدالی، ملحدین کی تحریفات اور باطنیت و زندقہ کے اثرات سے محفوظ رکھا اور ان مغالطوں کا پردہ چاک کیا، جو بد اعتقاد صوفیوں، جاہل مشائخ اور فلسفہ باطنیت سے متاثر اشراقیین کی دعوت و تبلیغ سے ہندوستان جیسے دور افتادہ ملک میں سحر کا اثر رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے مکتوبات میں ان سب پر کاری ضرب لگائی اور اسلام کے صحیح عقائد اور اہل سُنّت کے مسلک کی تبلیغ و اشاعت کی۔

آپ نے بڑے بڑے گناہ گاروں کو توبہ اور انابت کی دعوت دی۔ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> "اے بھائی، تم کتنے ہی آلودہ اور ملوث ہو دامن توبہ تھام لو اور امید وار رحمت بن جاؤ کہ تم نہ ساحرانِ فرعون سے آلودہ تر ہو اور نہ اصحاب کہف کے کتے سے زیادہ گندے نہ طورِ سینا کے پتھر سے بڑھ کر جماد، اور نہ ستون حنانہ سے بڑھ کر بے قیمت، غلام کو اگر حبش سے پکڑ کر لاتے ہیں تو کیا عیب کی بات ہے جبکہ اس کا آقا اس کو کافور کا لقب دیتا ہے"[1]

تصوف کے بہت سے حلقوں میں یہ غلط فہمی عام تھی کہ جب سالک مقام یقین کو پہنچ جاتا ہے تو شریعت کی پابندیوں سے وہ آزاد اور بے نیاز ہو جاتا ہے اب اسے فرائض بجا لانے اور شرعی امور کے انجام دینے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ اس غالی تصور نے جو فتنہ برپا کیا اور الحاد و زندقہ پھیلایا کہ پڑھے لکھے لوگ بھی اس کا شکار ہو گئے۔ حضرت مخدوم نے اس تصور کو غلط قرار دیا اور یہ ثابت کیا کہ شریعت کی پابندی

---

[1] مکتوب دوم، از تاریخ دعوت و عزیمت حصہ سوم ص ۲۶۵

دم واپسیں تک کرنی ہے اور کسی حال میں بھی ان ذمہ داریوں سے فرار کی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"برادر اعز شمس الدین کو معلوم ہو کہ شیطان کبھی کبھی صوفیوں اور اہل ریاضت پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ ترک معصیت کا مقصد یہ ہے کہ خواہشات نفس شکستہ اور صفات بشریت مغلوب ہوجائیں، اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی یاد ان پر غالب آجائے اور دل ظلمات بشریت سے ذکرِ الٰہی سے صاف ہوجائے اور اس کے نتیجے میں معرفتِ خداوندی کی حقیقت اس کو حاصل ہوجائے، شریعت کی پابندی کعبۂ وصال تک پہنچنے کی ایک راہ ہے، جو شخص کعبۂ وصال کو پہنچ گیا اس کو راستہ، توشے اور سواری کی اب کیا ضرورت ہے؟ پس شیطان اس گروہ کو یہ سمجھاتا ہے کہ اگر وہ نماز پڑھیں گے تو وہ ان کے لئے حجاب ہوجائے گی اس لئے کہ ان کو وصول حاصل ہوچکا ہے ایسے لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو دائمی مشاہدہ میں رہتے ہیں اور نماز، رکوع وسجود کا مقصود یہ ہے کہ غافل دل کو حضوری ہوجائے ہم تو خود ایک لمحہ بھر غافل نہیں ہوتے عالم ملکوت کو آشکار ادیکھتے ہیں ہم کو ان عبادات اور فرائض شرعی کی کیا ضرورت ہے؟ —— درحقیقت یہ خود ابلیس کا حال اور اس کا واقعہ ہے اس نے اپنا کمال قرب دیکھا اور کہا کہ آدمؑ کو سجدہ سے کیا حاصل، آدمؑ اس سے کم ہیں، مجھے اس کا سجدہ کرنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کا قصہ افسانے کے طور پر نہیں بیان کیا ہے وہ اُنہیں لوگوں کی عبرت کے لئے بیان کیا جو اس مغالطۂ شیطانی میں گرفتار ہیں تاکہ ان کو معلوم ہوجائے کہ کسی مقرب کو شریعت کی فرماں برداری سے چارہ نہیں۔ بزرگان دین نے جو یہ فرمایا ہے کہ شریعت کی پیروی حق تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ ہے، انہوں نے سچ فرمایا ہے[1]"

علماء اور مشائخ کا اسوہ یہ بتایا کہ انہوں نے موت تک شریعت کی پابندی کی اور کسی لمحہ اپنے کو شریعت کی پابندی سے آزاد نہ سمجھا:

"وہ علماء و مشائخ جو درجہ کمال کو پہنچے، انہوں نے سمجھا کہ شریعت کی پابندیوں میں ہر پابندی ایک راز ہے جس سے آخرت کی سعادت مربوط اور وابستہ ہے یہاں تک کہ ان بزرگوں نے اپنے دم واپسیں تک آداب شریعت میں سے ایک ادب بھی ترک نہیں کیا[2]"

---

[1] مکتوب ۱۷۱ [2] مکتوب ۱۸۶

آپ اس بات کے قائل اور داعی تھے کہ سلوک وطریقت شریعت کی پابندی کے بغیر ممکن نہیں ہے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

"جو شخص طریقت میں شریعت کا تابع نہیں ہوگا اس کو طریقت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا یہ ملحدین کا مذہب ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر جائز ہے وہ کہتے ہیں کہ جب حقیقت منکشف ہوگئی، شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہی، خدا کی لعنت ہو اس عقیدہ پر، ظاہر بے باطن نفاق ہے اور باطن بے ظاہر زندقہ۔ ظاہر شریعت بے باطن نقص ہے اور باطن بے ظاہر ہوس۔ ظاہر ہمیشہ باطن کے ساتھ پیوستہ ہے، ظاہر باطن کے ساتھ ایسا پیوستہ ہے کہ کوئی شخص اس کو علیحدہ نہیں کرسکتا ہے"[1]

آپ کی جو تصنیفات ملتی ہیں یا ان کے نام سوانح میں نظر آتے ہیں وہ یہ ہیں :

راحت القلوب، اجوبہ، فوائد رکنی، ارشاد الطالبین، ارشاد السالکین، رسالہ مکیہ، معدن المعانی، لطائف المعانی، ارشادات مخ المعانی، خوان پر نعمت، تحفۂ غیبی، رسالہ در طلب طالبان، ملفوظات، زاد سفر، عقائد شرفی، فوائد مریدین، بحر المعانی، صفر المظفر، کنز المعانی، گنج لایفنیٰ، مونس المریدین، شرح آداب المریدین۔

وفات کے بعد آپ کے مریدوں اور خلفاء نے آپ کا مشن جاری رکھا اور بندگان خدا کی رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آپ نے جن امراء اور سرداروں سے ربط رکھا اور ان کی تربیت کی ان میں قاضی شمس الدین حاکم چوسہ، قاضی صدر الدین، ملک مفرح، ملک معز الدین شمس الملک شمس الدین خوارزمی کافی مشہور ہیں۔

---

[1] مکتوب ۲۶ بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ سوم

حضرت خواجہ باقی باللہ رح

(۱۵۶۴ء ـــــ ۱۶۰۳ء)

سولہویں صدی کے آخر اور سترھویں صدی کے آغاز میں حضرت خواجہ باقی باللہ کی کوششیں بھی کافی اہم ہیں۔ یہ ان علماء و مشائخ میں سے ہیں جن کا مقصد مشیخت کی بساط بچھا کر خراج عقیدت حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ جو اپنے عہد کے غیر اسلامی نظریات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں کابل میں ۹۷۱ھ میں ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد قاضی عبد السلام سے حاصل کی۔ مختلف مشائخ سے بلاد اسلامیہ میں گشت کر کے استفادہ کیا مگر کہیں تسکین نہ ہوئی۔ آخر ہندوستان میں شیخ قطب العالم رح کی خدمت میں حاضری دی۔ کچھ مدت بعد انہوں نے بخارا بھیج دیا۔ خواجہ بخارا کے شیخ خواجہ محمد درویش کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے۔ خواجہ امکنگی نے انہیں نقشبندیہ سلسلے کی تعلیم دی اور ہندوستان جانے کی ہدایت فرمائی۔

ہندوستان واپس آنے کے بعد ایک سال تک لاہور میں قیام فرمایا۔ پھر فیروز شاہ کے قلعہ میں مقیم ہوئے۔ جلد ہی آپ مرجع خلائق بن گئے۔ آپ نے نقشبندی سلسلے کو ہندوستان میں استحکام بخشا۔ دوسری طرف اکبر کے درباری امراء میں سے صلاح و خیر رکھنے والی طبیعتوں کو متاثر کیا۔ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی "اگر اس دور کی تمام مذہبی و روحانی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی ذات گرامی احیائے سُنّت اور اماتت بدعت کی تمام تحریکوں کا منبع و مخرج تھی۔" ان ملفوظات و مکتوبات کا ایک ایک حرف ان کی مخلصانہ مساعی اور بلندی فکر و نظر کا مشاہدہ ہے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رح اپنے ایک مکتوب میں خواجہ صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

> "ہمارے شہر میں اس نسبت کے داعی اور مرشد شیخ العارف الکامل سر اللہ الاعظم و نور الاتم سیدنا و مولانا خواجہ محمد باقی قدس سرہ تھے وہ اس طریقہ میں ہمارے مشائخ ہیں اللہ ان کو جزائے خیر دے[1]۔"

---

[1] المکاتیب و الرسائل ص ۲۷۸، ۲۷۹

آپ کے مکتوبات وملفوظات کے مطالعہ سے جو تصویر سامنے آتی ہے اس میں اصولی سختی اور حکیمانہ نرمی کا امتزاج بڑا حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ امراء، صوفیہ، علماء، طلباء، سپاہی، تاجر سب کو انہوں نے موقع اور مصلحت کے مطابق ہدایتیں کیں اور اس انداز میں کیں کہ جس نے ان کی باتیں سنیں گناہوں سے اُکتا گیا۔[1] آپ کی مشہور روایت ہے کہ:

"اگر ہم پیری مریدی کریں تو اس زمانہ میں کسی بھی مرشد کو مرید نہ ملے لیکن ہم کو دوسرا کام سونپا گیا ہے کہ مسلمانوں کی ظلم کی بُرائی سے حفاظت کریں۔ دین کے واسطہ سے بادشاہوں سے قریب ہوں اور ان کے قلب ونگاہ کی تسخیر کریں اور اس عمل کا مقصود مسلمانوں کی بلندی وترقی ہے"[2]

آپ نے اس اصول پر نہ صرف عمل کیا بلکہ لوگوں کو بھی متوجہ کیا اور امراء واکابر سے اختلاط پیدا کرکے نہایت خاموشی سے درباری بدعتوں کے خلاف متشرع اور دیندار امراء کا محاذ قائم کیا۔ آپ کے عقیدتمندوں میں عہد اکبری کے بڑے بڑے سردار اور امراء شامل ہوتے۔ نواب مرتضیٰ خاں جس کی مدد سے جہاں گیر تخت نشین ہوا، حضرت خواجہ کا بڑا معتقد تھا۔ رفتہ رفتہ آپ کے عقیدتمندوں میں بخشی الملک شیخ فرید خلیج خاں حاکم پنجاب، مرزا کوکہ امیر الامرا، مرزا عبد الرحیم خان خاناں سپہ سالار دکن، صدر جہاں صدر الصدور اور ابوالفضل کے بہنوئی خواجہ حسام الدین شامل ہوگئے تھے۔ اس طرح آپ کی بروقت کوششوں سے مسلم تہذیب وتمدن کو بچانے کے لئے جدوجہد کا آغاز ہوگیا اور آپ نے منتشر اور پراگندہ قوتوں کو یکجا جمع کر دیا۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے حیاتِ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ ۱۳۶ تا ۱۴۳ از خلیق احمد نظامی

[2] مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی ص ۲۶ مرتبہ مولوی قاضی عالم الدینؒ، اللجنۃ العلمیۃ حیدر آباد

شیخ عبدالحق مُحدّث دہلویؒ

(سنہ ۱۵۵۱ء ـــــ سنہ ۱۶۴۰ء)

آپ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، عوام کا قرآن و سُنّت سے رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ مختلف قسم کے غلط نظریات مسلمانوں میں پھیل رہے تھے۔ مہدوی تحریک عروج پر تھی، ایران سے گروہ غالی، نصیریہ مذاہب دہریہ کی لپیٹ پے در پے آ رہی تھی، مغل بادشاہ اور ان کے امراء منصب و مرتبہ کے جال میں پھنسے ہوئے تھے۔ علماء مذہب کو ایک کھلونا اور ہیولیٰ بنائے ہوئے تھے اور مسلمانوں کا ذہنی انحطاط اخلاقی پستی، کج بحثی، غلط فہمی اور خام خیالی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ فقہ و تصوف کے درمیان تصادم تھا، شریعت و طریقت کی بحثیں ہو رہی تھیں اور اکبر کا دربار تو جملہ بدعتوں اور گمراہیوں کا مرکز تھا۔ ان حالات میں شیخ عبدالحق محدثؒ دہلی میں پیدا ہوئے یہ شیر شاہ سوری کا عہدِ حکومت تھا۔

ابتدائی تعلیم والد ماجد سے لی۔ پھر ماوراء النہر کے بزرگوں سے استفادہ کیا اور علم کلام اور فلسفہ میں ایسا درک پیدا کیا کہ استاذ بھی ان کے کمالات کی تعریف کرنے لگے۔ علم کی تکمیل کے بعد ہجرت کر کے مکہ معظمہ پہنچے وہاں حضرت عبدالوہاب علی متقی شاذلیؒ کی صحبت میں تین سال تک رہے اور حدیث، تصوف، فقہ حنفی اور حقوق العباد ان چاروں کی تعلیم انہی سے حاصل کی۔

شیخ عبدالوہاب نظریہ وحدت الوجود اور صوفیاء کے غیر شرعی خیالات و افکار کے کڑے ناقد تھے۔ ظاہر و باطن کو سُنّتِ نبوی کے مطابق آراستہ کرنے پر بہت زور دیتے تھے اور متصوفین نے ظاہر و باطن اور شریعت و طریقت میں جو تفریق پیدا کر دی تھی، اسے غلط قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلکِ طریقت وہی مطابق حق تھا جو احکامِ شریعت سے روگردانی اور بے نیازی پر مبنی نہ ہو۔ شیخ عبدالوہاب ذکر و فکر اور اوراد و وظائف سے زیادہ نکو عملی، اخلاق کی تہذیب اور علوم دینی کی نشر و اشاعت کو اہمیت دیتے تھے۔ شیخ عبدالحق کو قیام مکہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ فکر و عمل میں انہی کے رنگ میں رنگ گئے۔

حجاز سے واپسی کے بعد دہلی میں درس و ارشاد میں منہمک ہو گئے اور شریعت و سنّت کی آواز بلند کی۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے مسلمانانِ ہند کے بکھرے ہوئے شیرازے کو

درس حدیث کے ذریعہ منظم کر دیا اور ان میں دینی غور و فکر کی وہ صلاحیتیں اُبھار دیں جنہوں نے مسلمانوں کے معاشرے میں ایک نئی جان ڈال دی۔

آپ کی خدمات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ نے تقریباً نصف صدی تک فقہ و حدیث میں تطبیق کی کوشش کی اور اس سلسلے میں ہونے والے اعتراضات کو دفع کیا۔ دوسری طرف فقہ و تصوف میں ارتباط پیدا کیا اور شریعت و طریقت اور عشق و عقل کا حسین امتزاج اپنی کتاب "تحصیل التعرف فی معرفۃ الفقہ والتصوف" اور "مرج البحرین" میں پیش کیا۔

علاوہ ازیں شیخ محدث نے حدیث کی مستند کتابوں کو فارسی میں منتقل کر کے اور معارج النبوت کو ترتیب دے کر یہاں کے مسلمانوں پر جو عظیم احسان کیا ہے اسے اسلامی تاریخ کا طالب علم کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں علم حدیث کو جو ترقی حاصل ہوئی اس کا اولین سہرا آپ ہی کے سر ہے۔

علمی کارنامے

شیخ کا شمار برصغیر کے ممتاز افاضل اور علمائے حدیث کے پیش روؤں میں ہوتا ہے امام حسن بن محمد صنعانی پہلے محدث تھے جن کے ذریعہ علم حدیث کی روشنی برصغیر میں پھیلی۔ قطب الدین ایبک نے اپنے زمانے میں انہیں لاہور کی مسند قضا تفویض کی تھی ایک مدت تک اس منصب پر رہے اور پھر بغداد چلے گئے وہیں خلیفہ مستنصر باللہ کی فرمائش پر مشارق الانوار لکھی، مشارق الانوار برصغیر میں بے حد مقبول ہوئی، مدارس کے نصاب میں شامل کی گئی اور علماء نے شرحیں لکھیں۔ سولہویں صدی عیسوی میں علاء الدین خلجی نے کنز العمال لکھ کر برصغیر کے ذخیرۂ کتب احادیث میں بیش قیمت اضافہ کیا تاہم شیخ عبدالحق محدث پہلے عالم دین ہیں جنہوں نے برصغیر میں حدیث کے فروغ و اشاعت کو اپنی زندگی کا مشن بنایا۔ حدیث کے علاوہ آپ نے تفسیر، فقہ، تصوف، تاریخ اور علم نحو وغیرہ پر بھی کتابیں لکھیں جن کی مختصر تفصیل یہ ہے:

تفسیر کے سلسلے میں آپ نے تین کتابیں لکھیں:

(۱) تعلیق الحاوی علیٰ تفسیر البیضاوی

(۲) شرح صدور تفسیر آیت النور

(۳) تحصیل الغنائم و البرکات بہ تفسیر سورۃ والعادیات

تفسیر کے سلسلے میں آپ کا عقیدہ تھا کہ فقہی موشگافیوں سے پرہیز کرنا چاہیئے اس سے تاثیر کم ہو جاتی ہے۔

علم حدیث پر تیرہ تصانیف مرتب فرمائیں۔ جن میں اشعة اللمعات، لمعات التنقیح ترجمة الاحادیث الاربعین، جامع البرکات، جمع الاحادیث الاربعین فی ابواب علوم الدین اور اسماء الرجال وغیرہ کافی مشہور ہیں۔ عقائد پر آپ کی کتاب تکمیل الایمان وتقویة الایمان کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ فقہ میں فتح المنان فی تائید النعمان، الفوائد اور ھدایة النّاسك الی طریق المناسك لکھیں، تصوف پر دس رسالے لکھے جن میں تحصیل التعرف فی معرفة الفقه والتصوف، مرج البحرین، اور شرح فتوح الغیب نے شہرت دوام حاصل کی۔ تاریخ پر بھی تین کتابیں لکھیں، سیر و تذکرہ کے موضوع پر آپ کی سات کتابیں ہیں اور علم نحو پر بھی دو کتابیں موجود ہیں۔ اس طرح آپ کی کل تصانیف کی تعداد ساٹھ بتائی جاتی ہے۔

رُشد و ہدایت کے میدان میں

آپ نے وقت کی ضلالتوں کا مقابلہ اور اکبر کی گمراہیوں کا سدِ باب دو طریقے سے کرنے کی کوشش کی۔ پہلا طریقہ اپنی تحریروں کے ذریعہ خاموش تبلیغ کا تھا دوسرا رُشد و خیر رکھنے والی طبیعتوں اور درباری امراء سے میل ملاپ کر کے ان کی تربیت کا تھا۔

آپ کی تصانیف کا ایک ایک صفحہ اکبری الحاد کا توڑ ہے —— اس وقت کا سب سے بڑا فتنہ نظریہ الفی تھا یہ نظریہ عوام میں پھیلایا جا رہا تھا کہ اسلام کی مدت صرف ایک ہزار سال تھی اس کے بعد اسلامی شریعت کے اتباع کی ضرورت ختم ہو گئی ہے ملا عبد القادر بدایونی کے الفاظ میں " بادشاہ نے یہ خیال پکایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدت کل ایک ہزار سال تھی جو پوری ہو گئی۔ بادشاہ کے دل میں اس کے بعد ان منصوبوں کے اظہار و اعلان میں اب کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی جو اس نے اپنے دل میں چھپا رکھے تھے۔ حضرت شیخ نے نہایت شدت سے اس نظریہ کی تغلیط کی اور بتایا کہ احکام اسلام ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے ہیں ان کی پابندی کے لئے زمان و مکان کی تخصیص بے معنیٰ ہے۔ مدارج النبوۃ میں فرمایا:

" از خصائص کاملہ ایں خیر الامم آنست کہ شریعت اکمل است از جمیع شرائع متقدمہ وایں عیان است کہ محتاج نیست بہ بیان و واضح است کہ خفا نیست دراں و حول

آں حضرت مبعوث است برائے تتمیم مکارم اخلاق و محامد افعال لاجرم دین و شریعت او اتم و اکمل ادیان شرائع باشد[1]

یعنی اس خیر اُمت کی سب اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ اس کی شریعت تمام سابقہ شریعتوں کے برعکس مکمل ہے۔ یہ مسئلہ اس قدر واضح ہے کہ محتاج بیان نہیں ہے چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکارم اخلاق اور محامد افعال کی تکمیل کے لئے تشریف لائے تھے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ آپ کا دین و شریعت تمام ادیان کے مقابلے میں مکمل اور اتم نہ ہو۔

اکبری الحاد اور مذہبی انتشار کا ایک سبب وہ درباری جلسے تھے جن میں ہر فرقے، مذہب، رجحان اور طریقے کے علما جمع ہوتے تھے اور نازک ترین مسائل پر ہرکس وناکس اپنے خیالات کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا تھا اور اس طرح بہت سی گمراہیوں کے دروازے کھلتے تھے۔ ان حالات میں شیخ نے لکھا کہ ان معاملات میں اسے بولنے اور رائے دینے کا حق حاصل ہو سکتا ہے جس کی نظر کتاب و سُنت پر گہری ہو، جو عوام کی اصلاح کے لئے پریشان ہو اور وقت کی نزاکتوں کو سمجھتا ہو[2]۔ علمائے سوء کی فتنہ سامانیوں سے آپ نے وقت کے مسلمانوں کو آگاہ کیا اور ان کے شر سے انہیں بچانے کی کوشش کی۔

"علماء کی تصدیق اور ان کی تعظیم ان چیزوں میں واجب ہے جو وہ دین کے موافق بتاتے ہیں اور کتاب و سُنت سے تمسک کرتے ہیں، ان چیزوں میں ان کی تصدیق ضروری نہیں جو دین کے مخالف کہتے ہیں اور ہوائے نفس و محبتِ دُنیا میں حیلہ آموزی اور فتنہ اندازی کرتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ جب تک دُنیا کی طرف نہ مائل ہوں اور بادشاہوں کے یہاں آمد و رفت نہ کریں اور جب وہ دُنیا کی طرف مائل ہو جائیں اور بادشاہوں سے میل جول بڑھائیں تو ان سے ڈرو اس لئے کہ وہ دین کے چور ہیں۔ میل دُنیا اور اختلاط سلاطین سے مراد یہ ہے کہ دین کو دُنیا کے عوض بیچ دیں۔ کمزوری اور سستی دکھائیں۔ ناحق اور غلط فتوے دیں۔" (نواں مکتوب)

---

[1] مدارج النبوت جلد ۱ ص ۱۷۱، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

[2] مدارج النبوت جلد ۱ ص ۳۴۹۔ عبدالحق محدث دہلویؒ

مشائخ اور اولیاء اللہ کے اقوال و افعال کو رد کرنے کا ضابطہ اس طرح بتاتے ہیں:

"اس باب کا قانون یہ ہے کہ جو چیز علم و حکم شریعت کے مقتضا کے مخالف ہو اس کا انکار واجب ہے اور جس چیز میں شبہ ہو اس میں اس وقت توقف لازم ہے جبکہ اس کا قائل یا فاعل ایسا شخص ہو جو علم و عمل میں امام اور تقویٰ و احتیاط میں صاحبِ استقامت ہو۔ ایسے شخص کے قول و فعل کی تاویل و توجیہ کرنی چاہیئے ہاں اگر مصلحتِ شرعی ایسے شخص کے قول و فعل کو رد کرنے میں بھی ہو تاکہ کم فہم لوگ گمراہ نہ ہوں تو اسے بھی رد کرنا چاہیئے اور یہ بات جان لینی چاہیئے کہ ولی ہفوات و زلات اور گناہوں میں مبتلا ہونے سے معصوم نہیں ہوتا[۱] (نواں مکتوب)

اکبر نے جو نیا دین ایجاد کیا وہ دراصل نبوت اور سلطنت کے درمیان سخت قسم کی غلط فہمی واقع ہو جانے کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ آپ نے ایک رسالہ لکھا اور نہایت حکمت کے ساتھ اور دلائل کی روشنی میں نبوت اور سلطنت کے فرق کو واضح کیا اور بتایا کہ نبوت کسبی نہیں بلکہ الہامی ہے اور اس کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فیض خاص سے اسی بندے کو اس شرف سے نوازتا تھا جو معصوم ہوتا تھا، نفس کی خواہشات سے پاک ہوتا تھا۔ اب اسلام مکمل ہو چکا ہے۔ اب کوئی نیا دین نہ آئے گا نہ کسی نئے مذہب کی ضرورت ہے[۲]

اسی طرح اپنے رسالہ اشعۃ اللمعات اور تکمیل الایمان میں ایمان کی تشریح و توضیح کی اور مثبت انداز میں اس کے اثرات و نتائج کا جائزہ لیا۔ ایک جگہ لکھا:

دریں جا قسمے دیگر است کہ باوجود تصدیق و اقرار چیزے کنند کہ شارع آں را علامت و امارت کفر ساختہ مثل سجدۂ صنم و شد زنار و امثال آں، پس مرتکب ایں امور نیز بہ حکم شرع کافر است اگرچہ فرضاً تصدیق و اقرار داشتہ باشد[۳]

یعنی ایک اور قسم بھی ہے کہ باوجود ایمان کی تصدیق و اقرار کے اس کا مرتکب کفر کا ارتکاب کر ڈالتا ہے مثال کے طور پر بتوں کو سجدہ کرنا، زنار پہننا وغیرہ، ان چیزوں کا مرتکب

---

[۱] مکتوبات حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ص ۳۶، ۳۷، قاضی احمد عبدالصمد

[۲] دیکھئے مرج البحرین ص ۲۷، عبدالحق محدث دہلویؒ،

[۳] اشعۃ اللمعات جلد اول ص ۴۰، عبدالحق محدث دہلویؒ

شرع کی نگاہ میں کافر ہے چاہے فرضی طور سے تصدیق و اقرار کرتا ہو۔

بہت سے لوگ نوافل و اذکار اور اوراد و وظائف میں چست ہوتے ہیں لیکن فرائض کی ادائیگی میں سُست ہوتے ہیں اس کے علاوہ محرمات اور نواہی سے بچنے کا اہتمام بھی نہیں کرتے۔ دیکھا گیا ہے کہ تسبیح کے دانوں کو ہر وقت پھیرنے والے بہتیرے دیندار فرائض اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں بہت پیچھے ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کو شیخ محدث نے تنبیہہ کی ہے اور بتایا ہے کہ فرائض کا اہتمام اور ممنوعات سے اجتناب نوافل و اوراد کی کثرت سے زیادہ ضروری ہے۔ فرماتے ہیں:

"مشائخ طریقت قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم نے فرمایا ہے کہ تقویٰ میں مبالغہ اور انتہائی کوشش کرنی ضروری ہے۔ حرام مکروہ، شبہ کی چیزوں اور شبہ کے کاموں سے بچنا لازمی ہے۔ تقویٰ، خدا کا خوف، خدا کے فرمانے کے مطابق کام کرنا، منع کئے ہوئے سے پرہیز کرنا سلوک کے لوازمات سے ہے۔ سچ ہے کہ تقویٰ و طہارت بڑا کام ہے۔ مقام قرب حاصل کرنے میں صرف فرائض، واجبات، سُنن، مُستحبات پر ہی اکتفا کرلیں، نوافل و عبادات کی کثرت میں کوشش نہ کریں تو اس قدر حصول کے لئے کافی ہے۔ نوافل و مُستحبات کی کثرت ہو، حرام اور منع کی ہوئی باتیں اور کام کرتے رہیں، تو یہ کثرتِ نوافل و مُستحبات کارآمد نہیں ہوتیں۔ اس سے کام نہیں بنتا۔ فرائض کا ترک، اس میں کچھ کا کچھ کہنا، نفل کی پابندی کی تاکید اس میں مبالغہ اور انتہائی کوشش کا حکم دینا یہ نفس کا غرور، شیطان کا فریب ہے۔"[1]

غرضیکہ آپ کی تصانیف ان تمام گمراہیوں کی نشاندہی کرتی ہیں جو اکبر کے دربار میں پنپ رہی تھیں، لیکن یہاں براہِ راست کشمکش اور انقلابیت کے بجائے احیائے سُنّت کا مثبت جذبہ ہے۔

دوسرا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اکبری دربار کے بعض مشہور امراء سے تعلقات قائم کئے اور انہیں سُنّت کے احیاء اور بدعات کے استیصال پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ خاص طور پر عبدالرحیم خان خاناں اور شیخ فرید سے آپ کے تعلقات بہت گہرے تھے۔

شیخ فرید کے نام آپ کے سات خطوط ملتے ہیں جن سے دونوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت

---

[1] مکتوبات حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ص ۵۵، ۵۸، قاضی احمد عبدالصمد

اور اس زمانہ کے مذہبی وسماجی حالات پر بڑی مفید روشنی پڑتی ہے اور ان سے شیخ کے بے چین اور مضطرب قلب کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ ایک خط میں طلب صادق پیدا کرنے، پاداش عمل کا خیال رکھنے اور ظاہر و باطن میں کامل امتزاج پیدا کرنے کی وصیت کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ بیکار بیٹھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ جو کچھ کر سکتے ہو کرو۔ یہ خیال نہ کرو کہ چھوٹا سا کام ہے اللہ نے ہر کام کے لئے اجر مقرر کیا ہے اور آخر میں یہ شعر پڑھتے ہیں:

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن[۱]

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ دین کے دو بازو ہیں التعظیم لامر اللہ اور الشفقة علیٰ خلق اللہ۔ ان دونوں کی وضاحت کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

"اما مقام التعظیم لامر اللہ عالی تر و شان و مرتبہ وے در اعلائے کلمۂ اسلام و تشئید و تایید امر دین و ملت بالا تر از آنست و بہ حقیقت ہیچ کارے کہ باعث قبول و سفید رُوئی مرد در بارگاہ عزت و درگاہ نبوت تواند شد، بالا تر ازاں نیست کہ در تقویت دین و ملت و ترویج و تایید سُنت کوشد و دراں بذل مجہود نماید و در سواد آں لشکر اگر چہ تن تنہا باشد بیفزاید[۲]"

یعنی "التعظیم لامر اللہ کا مقام بہت اعلیٰ ہے، اسلام کا کلمہ بلند کرنا، دین و ملت کی تایید و مدد کرنا، اس کو مضبوط و مستحکم کرنا ایسی شان اور ایسا مرتبہ ہے جو سب مرتبوں سے بالا ہے حقیقت یہ ہے کہ بارگاہ عزت، درگاہ نبوت میں قبولیت کا کوئی کام ہو سکتا ہے تو وہ یہی صفت ہے۔ اس سے بلند تر کوئی صفت نہیں۔ دین کی تقویت، ملت کی ترویج، اس کی تایید میں کوشش کرنا، انتہائی کوشش اس کام میں صرف کرنا، خود کو اس میں کھپا دینا، اس میدان میں جہاں لشکر کا پڑاؤ ہے اس میں خود کو شریک کرنا گنتی میں اضافہ کرنا ہے[۳]"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ امراء کو اعلائے کلمۂ حق کے لئے تیار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن

۱۔ کتاب المکاتیب والرسائل ص ۴، تا ۶، شیخ عبدالحق دہلویؒ

۲۔ کتاب المکاتیب والرسائل ص ۱۶۱۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

۳۔ مکتوبات حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ حصہ اول ص ۵۶۔ قاضی احمد عبدالصمد

شہرت و ناموری سے بچتے تھے اور ستر و کتمان کے قائل تھے۔[1]

عبدالرحیم خان خاناں کے نام " المکاتیب والرسائل" میں آپ کے پانچ خطوط ملتے ہیں جن میں کہیں آپ نے تربیت و اصلاح پر زور دیا ہے، کہیں ایمان، ہدایت اور شریعت کی توضیح کی ہے اور کہیں عمل پیہم کی تلقین کی ہے اور فقیر صابر اور غنی شاکر کا دل چسپ موازنہ پیش کیا ہے۔ ایک مکتوب میں ترویج دین کی اہمیت اس طرح بیان کی ہے:

اعظم امور دریں باب ارشاد و ہدایت است و تجدید و ترویج احکام سُنّت بالاتر ازیں کارے

کہ سعادت ابدی و دولت سرمدی گردد نیست ؎

وے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است[2]

یعنی اس باب میں سب سے اہم کام ارشاد و ہدایت اور احکام سُنّت کی ترویج و تجدید ہے۔ اس سے بالا کوئی کام جو سعادت ابدی اور دولت سرمدی کا باعث ہو، کوئی اور نہیں ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے زمانہ کی ضلالتوں سے آنکھ بند نہیں کر لی تھی بلکہ اس کا اپنے انداز میں مقابلہ کیا اور ایسے افراد تیار کرنے کی کوشش کی جو اس الحاد پر بند باندھ سکیں۔ مولانا سید احمد قادری ایک جگہ کہتے ہیں:

"حضرت شیخ کا جو چھپا ہوا مجموعہ مکاتیب و رسائل اس وقت موجود ہے، اس میں شیخ کے تمام مکاتیب نہیں ہیں۔ معلوم نہیں اور کن امراء سے ان کی خط و کتابت تھی اور ان ہی دونوں (شیخ فرید اور خانخاناں) کے نام اور خطوط بھی ہیں یا صرف یہی ہیں۔ بہرحال انہی مکاتیب سے اتنا بالیقین معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت شیخ امراء کی اصلاح سے غافل نہ تھے اور اکبر کی بے دینی کے خلاف ان کو اکسانے میں اپنے خاص طریقے سے کمی نہیں کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ عہد اکبری میں بھی ویسے ہی سرگرم کار رہے جیسے عہد جہانگیری و شاہجہانی میں۔ جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء"[3]

---

[1] دیکھئے کتاب المکاتیب والرسائل ص ۱۰۲، ۱۱۳۔

[2] کتاب المکاتیب والرسائل ص ۱۰۵۔

[3] تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۲۹، سید احمد قادری، شاد بکڈپو پٹنہ ۶۱ء

پروفیسر خلیق احمد نظامی حضرت شیخ محدثؒ کے اس اصلاحی کارنامے کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں:

"شیخ محدث نے عہدِ اکبری کے مشہور اعیان وامراءِ سلطنت کو اماتتِ بدعت اور احیائے سنت پر آمادہ کیا۔ عبدالرحیم خان خاناں اور نواب مرتضیٰ خاں المعروف بہ شیخ فرید کے نام ان کے مکتوبات ان کے جذبات کے آئینہ دار ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ملت کی پریشاں حالی نے ان کے قلب وجگر پر بہت گہرا اثر کیا تھا اور وہ اپنے مخصوص انداز میں امراء کی غیرتِ دینی کو جوش دلاتے تھے۔ ان کے خطوط میں ایک بے چین اور مضطرب قلب کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔"[1]

---

[1] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، خلیق احمد نظامی، ص ۳۰۲

چوتھا باب

تجدید واحیائے دین

شیخ احمد سرہندیؒ

مختصر سوانح حیات
اسلام کا جنازہ
دین الٰہی کی ایجاد
علمائے سوء کا کردار
اصلاحِ افکار
تحریک نفاذ شریعت

شاہ ولی اللہ دہلویؒ

مختصر حالات
قرآن سے اُمت کو جوڑنے کی کوشش
مکمل نظامِ حیات کا خاکہ
جدید علم کلام
ملک کے ہر طبقہ سے خطاب
سیاسی اصلاح کی کوشش

"حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں اللہ تعالیٰ دو شخصوں کو پیدا نہ کرتا اور ان سے اپنے دین کی دستگیری نہ فرماتا، تو یوں تو اللہ تعالیٰ اپنے دین کا نگہبان ہے، اس کی حفاظتِ دین کے طریقے ہزار ہیں، لیکن بظاہر تیرھویں صدی تک یا تو اسلام ہندوستان سے بالکل فنا ہو جاتا یا اتنا بگڑ جاتا جتنا ہندو مذہب، یہ دو بزرگ ہندوستان کے مسلمانوں کے جلیل القدر محسن اور اسلام کے عظیم الشان پیشوا حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں۔"

[1] (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

---

[1] سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اول ص ۶۲ چھٹا ایڈیشن

شیخ احمد سرہندیؒ

مختصر سوانح حیات

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

(اقبالؒ)

حضرت مجددِ الفِ ثانی کا اسمِ گرامی احمد ہے۔ سرہند کے مقام پر ۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد شیخ عبدالواحد کا شمار وقت کے مشائخ میں ہوتا تھا۔ چنانچہ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی پھر سیالکوٹ گئے وہاں منطق، فلسفہ اور کلام کا علم مولانا کمال الدین کشمیری سے حاصل کیا اور تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم مولانا محمد یعقوب کشمیری اور قاضی بہلول بدخشانی سے حاصل کی۔ سترہ برس کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہوکر اپنے وطن میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ سلوک و معرفت کی راہ میں قدم رکھا تو چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ طریقے اپنے والد سے حاصل کئے پھر نقشبندیہ سلسلے میں حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت ہوئے۔ حضرت خواجہ اس مرید کے روحانی احوال اور علمی صلاحیتوں سے بے حد متاثر ہوئے اور دل و جان سے ان کی تربیت کی۔ ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء کو ۶۲ سال کی عمر میں انتقال کیا اور وہیں سرہند میں مدفون ہوئے۔[1]

حضرت مجدد نے دعوت و تجدید کا جو شاندار کارنامہ انجام دیا اسے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس وقت کے سیاسی و مذہبی اور عوامی حالات بھی سامنے آجائیں تاکہ گفتگو مکمل ہوسکے اور آپ کا کارنامہ تجدید و احیائے دین کھل کر سامنے آسکے۔

---

[1] الفرقان مجدد الف ثانی نمبر، ص ۲۴۵، ۲۴۶، مضمون مختصر حالات مجدد الف ثانی، مولوی فاروق احمد ایم اے

اسلام کا جنازہ

آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی ظلم و جبر، خدا سے غفلت اور دین کی صراطِ مستقیم سے دُوری کا ماحول تھا۔ مسلمان عقلیت، تصوّف، تشیع اور علماء سو کے جدلی مباحثوں اور مناظرہ بازیوں کے دلدل میں پھنسے ہوئے تھے۔ اکبر کا دربار تمام فتنوں کو ہوا دے رہا تھا۔ وہ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی انفرادیت مٹا کر مذاہب کی مشترک اور مخلوط بنیادوں پر وطنی قومیت اور متحدہ کلچر کو فروغ دینا چاہتا تھا۔ اس کے دربار میں یہ رائے عام تھی کہ ملتِ اسلامیہ جاہل بدوؤں میں پیدا ہوئی تھی، کسی شائستہ اور مہذب قوم کے لئے یہ تعلیمات موزوں نہیں ہیں۔ نبوت، وحی، حشر و نشر، جنت و دوزخ ہر چیز کا مذاق اڑایا جا رہا تھا، قرآن کا کلام الٰہی ہونا مشتبہ، وحی کا نزول عقلاً مستبعد مرنے کے بعد ثواب و عذاب غیر یقینی البتہ تناسخ ممکن اور اقرب الی الصواب۔ معراج کو علانیہ محال قرار دیا جاتا۔ ذاتِ نبوی پر اعتراضات کئے جاتے خصوصاً آپؐ کی ازواج کے تعدد اور آپؐ کے غزوات و سرایا پر کھلم کھلا حرف گیریاں کی جاتیں یہاں تک کہ لفظ احمد اور محمدؐ سے بھی بیزاری ہونے لگی اور جن کے ناموں میں یہ الفاظ شامل تھے ان کے نام بدلے جانے لگے۔ علمائے سوء نے اپنی کتابوں میں نعت کے بجائے تبرّا شروع کر دیا بعض ظالم اس حد تک بڑھے کہ دجّال کی نشانیاں ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں کرنے لگے۔ العیاذ باللہ۔ دیوانِ خانہ شاہی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ نماز ادا کر سکے۔ ابوالفضل نے روزہ، نماز، حج اور دوسرے دینی شعائر پر سخت اعتراضات کئے اور ان کا مذاق اڑایا۔ فیضی نے علی الاعلان کہا کہ

کعبہ و تعلیم آدابم مکن   گرم رو را فرصت احرام نیست
کاروان کعبہ شد منزل نشین   رہروانِ عشق را آرام نیست

ایک غزل میں طواف کعبہ کو بتوں کی پرستش کے ہم معنی ٹھہراتا ہے:

آنکہ می کرد مرا منع پرستیدنِ بت
در حرم رفتہ طوافِ در و دیوار چہ کرد

ایک قصیدۂ فخریہ میں فیضی اپنے عقائد کا اعلان ان الفاظ میں کرتا ہے:

شکر خدا کہ عشق بتاں است رہبرم
در ملتِ برہمن و در دینِ آزرم

اس کا بانی زرتشت تھا

دین الٰہی کی ایجاد

۱۵۵۲ء میں ایک نئے مذہب دین الٰہی کی بنیاد رکھی گئی اس کے خلیفہ اوّل شیخ ابوالفضل منتخب ہوتے یہ اکبر کی ذہنی اختراع اور جدت کی انتہا تھی۔ اس کے اصول و عقائد فرنگیوں، پارسیوں اور ہندوؤں سے ماخوذ تھے۔ اس کا کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَکْبَرُ خَلِیْفَۃُ اللّٰہ قرار پایا۔ سلام مسنون کے بجائے اللہ اکبر اور جل جلالہ کا شعار اختیار کیا گیا۔ بیعت کے وقت عوام اپنا سر اکبر کے پاؤں پر رکھ دیتے۔ انہیں تعلیم دی جاتی کہ اخلاص چارگانہ کا خاص خیال رکھیں یعنی ترک مال، ترک جان، ترک ناموس اور ترک دین۔ دربار شاہی میں تمام ہندوانہ رسوم و رواج رائج کیے گئے اور ایک ایک کر کے اسلامی شعار کو رخصت کر دیا گیا۔

حلال و حرام کی نئی شریعت وضع کی گئی۔ سود اور جوا حلال کر دیا گیا اور خود ریاست کی سرپرستی میں قمار خانہ قائم ہوا۔ قمار خانوں کو ریاست کے شاہی خزانوں سے سودی قرض دیا جاتا تھا۔ شراب بھی طبی استعمال کے پردے میں جائز ہو گئی۔ عائلی قوانین بدل دیئے گئے۔ چچا، ماموں اور خالہ وغیرہ کی بیٹیوں سے شادی حرام قرار دے دی گئی۔ سولہ سال سے کم عمر لڑکے اور چودہ سال سے کم عمر لڑکی کا نکاح ناجائز قرار دے دیا گیا۔ عزت و ناموس اور غیرت و حمیت سے بیگمات کو عاری کرنے کے لئے مینا بازار لگوائے گئے جس میں شاہی گھرانوں کی خواتین کو سیر و تفریح کے لئے دعوت دی جاتی۔ بادشاہ خود اس میلے میں شریک ہوتا، عورتوں کے جھگڑے چکاتا اور لڑکے لڑکیوں کے بر منتخب کرتا۔ شیر اور بھیڑیئے کا گوشت حلال ٹھہرایا گیا اور گائے، بھینس، گھوڑا، بھیڑ، بکری اور اونٹ کے گوشت کی تحریم کا قانون نافذ کیا گیا۔ سور کو پاک جانور کہا گیا اور یہ فلسفہ تراشا گیا کہ یہ ان دس مظاہر میں سے ہے جن میں خدا نے حلول کیا ہے۔ اوقاف پر قبضہ کر لیا گیا تاکہ منبر و محراب اور خانقاہوں سے حق کا کلمہ بلند نہ ہو سکے۔ جمعہ، عیدین اور اسلامی تقریبات کا اہتمام بھی اکبر نے اپنے ہاتھ میں کر لیا۔ شرعی ثبوت کے بغیر عید کا اعلان کر دیا جاتا اور لوگوں کے روزے تڑوا دیئے جاتے۔ عربی پڑھنا اور عربی جاننا عیب قرار پایا اور فقہ و تفسیر اور حدیث کے پڑھنے والے مردود اور مطعون گردانے گئے۔ اعلان کیا گیا کہ عربی علوم کا پڑھنا پڑھانا ترک کیا جائے اور علوم نادرہ یعنی نجوم، حساب، طب اور فلسفہ کے سوا اور کوئی علم نہ پڑھا جائے۔[1]

---

[1] علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد اول ص ۲۰ تا ۲۲، مولانا سید محمد میاں صاحب

علمائے سو کا کردار

اس المیہ کا افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ اس بدعت و انحراف کا ساتھ علمائے سو کی ایک بڑی تعداد نے دیا۔ مثال کے طور پر زعفران اور لال کپڑے کے جواز کا فتویٰ حاجی ابراہیم سرہندی نے دیا۔ بادشاہ کو سجدہ کرنے کا فتویٰ قاضی خاں بدخشانی نے دیا اور ملا عالم کابلی کو اس کا افسوس رہا کہ ہائے یہ مجھے کیوں نہ سوجھا۔ داڑھی منڈانے کی حدیث ملا ابوسعید نے نکالی تھی۔ اسلام کے ساتھ ہندو مذہب کا جوڑ، کلام پاک اور پران کی تطبیق شیخ تاج الدین اجودھنی دہلوی نے کی۔ شیعی عالم ملا شریف آملی نے تیموری عہد کے ایک مصنف محمود بسخوانی کی ایک کتاب سے یہ شہادت پیش کی کہ "نوسو نوے ہجری میں باطل کا مٹانے والا ایک شخص صاحب دین حق پیدا ہوگا جمل کے قاعدے سے جس کے نو سو نوے عدد نکلتے ہیں۔" ابوالفضل نے لکھا کہ "جب بنی نوع انسان کی خوش نصیبی سے ایسا وقت آجاتا ہے کہ حق پرستی کا دور دورہ ہو تو بادشاہ دوراں ہی کو پیشوائی جہاں بخش دی جاتی ہے جو جلوہ زار کثرت میں حدیث کا سر رشتہ ڈھونڈھ لیتا ہے۔" ملا عبداللہ سلطان پوری نے حج کے اسقاط فرض کا فتویٰ اس استدلال کی بنیاد پر دیا تھا کہ حج کے لئے خشکی کا راستہ قزلباشوں کی ترکتازیوں سے پُرخطر ہے اور سمندر کے راستے میں فرنگیوں سے پروانہ راہداری لینے کی ذلت گوارا کرنی پڑتی ہے اس پر حضرت عیسیٰ اور بی بی مریم کی تصویریں چھپاں ہوتی ہیں اور یہ بُت پرستی کے مترادف ہے بنا بریں حج کے دونوں راستے مسدود ہوگئے ہیں اور خود حیلہ بہانہ کرکے عمر بھر کبھی زکوٰۃ نہ دی[1]۔ اختلاف مذاہب مٹانے اور اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کا مطالعہ کرنے اور اوران سب کو ملاکر ایک جدید معجون مرکب تیار کرنے کا سبق بھی انہی بزرگوں نے دیا تھا[2]۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب اکبری الحاد و زندقہ کی پشت پر مذہبی قائدین اور متصوفین کی ایک فوج ظفر موج تھی، کام کس قدر دشوار اور مشکل تھا لیکن حضرت مجددؒ نے گردنوں کو مروڑنے اور طاغوت کا سر کچلنے کے لئے کمر ہمت کس لی۔

اصلاحِ افکار

سب سے پہلے آپ نے اسلامی نظریات کے صحیح خدوخال کو نمایاں کرنے اور غلط عقائد و

---

[1] الفرقان مجدد الف ثانی نمبر، الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ، مولانا مناظر احسن گیلانی، ص ۱۴۶ - ۱۴۹

[2] رود کوثر، ص ۸۷، شیخ محمد اکرام۔

نظریات کی بیخ کنی کا آغاز کیا۔ اکبری الحاد میں شیعہ اثرات کا بہت زیادہ دخل تھا چنانچہ آپ نے ردِّ روافض کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔[1] اپنے مکتوبات میں اس فرقے کی مخالفت کی اور اس کے تار و پود بکھیر دیئے ابوالفضل اور فیضی جیسے لوگ توحید اور رسالت کے سلسلے میں ملحدانہ خیال رکھتے تھے چنانچہ "اثبات النبوت" نامی رسالہ لکھ کر ملحدین کے اقوال کی تردید کی اور ختمِ نبوت اور نبوتِ محمدی کو عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ ثابت کیا۔

تصوف میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں اور "ہمہ اوست" کا جو اشراقی اور ہندی تصور پھیل گیا تھا اس کے مقابلے میں "ہمہ از اوست" کا تصور پیش کیا۔ شریعت اور طریقت میں تطبیق پیدا کی اور واضح لفظوں میں اس حقیقت کی تبلیغ کی کہ اگر صوفیاء کے حال، وجد، علوم، معارف، رموز اور اشارات شریعت کے مطابق ہوں تو بہتر ورنہ سراسر خرابی اور عتابِ ربانی کا سرمایہ ہیں۔ اسی طرح آپ نے مدار فضیلت اتباعِ سنت کو قرار دیا اور بتایا کہ اہلِ ریاضت کے تمام مجاہدے اور ریاضتیں اگر سنتِ مطہرہ کے مطابق نہ ہوں تو بے کار اور بے سود ہیں۔ اب اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل یہاں دی جاتی ہے۔

آپ نے درباری امراء اور سرداروں سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی طرح تعلقات قائم کئے، ان سے خط و کتابت کی اور ان کی اصلاح احوال اور تعمیر کردار کی کوشش فرمائی۔[2] اس وقت جو اعتقادی و عملی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ان پر تبصرہ کیا اور خدا کی ذات و صفات، شریعت کی ابدیت اور سنت اور تصوف میں تطابق، دُنیا اور زخارفِ دُنیا کی ناقدری اور بے وقعتی، خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کی توقیر و اتباع، وغیرہ کے مضامین پر ان کی اُلجھنوں کو رفع کیا۔ توحید کے متعلق ایک مکتوب میں لکھا:

> "چاہیئے کہ پہلے باطل خداؤں کی نفی اور معبودِ برحق جلّ شانہ کا اثبات کریں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سب سے بڑھ کر عبادت کلمۂ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی نفی و اثبات میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ اگر میرے سوا سات آسمان اور سات زمینیں ایک پلڑے میں اور کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو کلمہ والا پلڑا بھاری رہے گا کلمہ کی یہ افضلیت اس لئے ہے کہ اس کا ایک ٹکڑا ماسوائے حق یعنی

---

[1] مکتوباتِ امامِ ربانی مجدد الف ثانی، چوتھا جوہر ص ۹، تا ۸۱، قاضی عالم الدین

[2] تذکرہ مجددِ الف ثانی ص ۹۵، ۹۶، مولانا محمد منظور نعمانی۔

ارض وسماوات، عرش وکرسی، لوح وقلم اور علم وآدم کی نفی کرتا ہے اور دوسرا ٹکڑا معبود برحق کا اثبات کرتا ہے جو ارض وسماوات کا خالق ہے۔ ماسوا اللہ انفس وآفاق میں جو کچھ ہے، سب چون وچند کے داغ سے آلودہ ہے اس لحاظ سے انفس وآفاق کے آئینوں میں جو شے بھی جلوہ گر ہے، وہ کہیں زیادہ چون وچند سے داغدار ہوگی۔ اور اس کی نفی لازمی ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: اَتَعْبُدُوْنَ مَاتَنْحِتُوْنَ وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَاتَعْمَلُوْنَ۔ کیا تم ان چیزوں کی عبادت کرتے ہو جنہیں تم اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو حالانکہ اللہ نے تمہیں اور تمہارے اعمال وصنائع کو پیدا کیا ہے۔

ہر وہ شے جو ہماری تراشیدہ اور بنائی ہوئی ہے، خواہ ہاتھ کی یا عقل ووہم کی، اللہ کی مخلوق ہے اور عبادت کی سزاوار نہیں۔ سزاوار عبادت وہی خدائے بیچون وبیچگوں ہے جس کے ادراک سے ہماری عقل ووہم قاصر ہے[1]۔

شرک کی تردید ان الفاظ میں کی:

"کسی کو اللہ تعالیٰ کا ساجھی نہ بنایا جائے نہ ذات وصفات میں نہ عبادت میں جس شخص کے اعمال ریا وسمعہ سے پاک نہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے اجر طلب کرتے کے فتنے میں مبتلا ہے وہ دائرہ شرک سے باہر نہیں ہے اور نہ وہ مؤحّد اور مخلص ہے...... کفر سے بیزار ہونا اسلام کی شرط ہے اور شرک سے پاک ہونا توحید کی علامت دکھ اور بیماری کے ازالے کے لئے اصنام اور طاغوت سے استعانت، جو جاہل مسلمانوں میں رائج ہے، عین شرک اور ضلالت ہے۔ تراشیدہ وناتراشیدہ پتھروں سے حاجت روائی کفر محض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا۔ یہ لوگ اپنے معاملات کا فیصلہ کروانے کے لئے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں طاغوت کے انکار کا حکم دیا گیا ہے

دین الٰہی :-

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم

---

[1] مکتوب ۹ دفتر دوم

اور شیطان تو چاہتا ہے کہ انہیں شدید ترین گمراہیوں میں گم کر دے [1]۔"

اس کے بعد سب سے زیادہ زور اتباعِ رسول اور اطاعتِ خداوندی پر دیا ہے کہ اسی سے آخرت کی نجات وابستہ ہے اور دُنیا کی تمام گمراہیوں سے انسان اس اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر محفوظ رہ سکتا ہے [2]۔ شیخ فرید کو لکھا:

"حق تعالیٰ آپ کو ظاہری دولت اور باطنی سعادت سے نوازے۔ فی الحقیقت ظاہری دولت یہ ہے کہ اپنے ظاہر کو شریعتِ مصطفویؐ کے رنگ میں رنگ دے اور باطنی سعادت یہ ہے کہ اپنے باطن کو ماسوا اللہ کی گرفتاری سے آزاد کیا جائے۔ دیکھیں کون خوش نصیب ان دونوں عظمتوں سے مشترف ہوتا ہے ؎

کار ایں است وغیر ایں ہمہ ہیچ [3]"

اسی امیر کو ایک دوسرے مکتوب میں لکھا کہ:

"دیکھئے کس خوش نصیب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کی اتباع سے نوازا اور حضورؐ کی پسندیدہ شریعت کی پیروی سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کی صداقت پر ایمان لانے کے بعد تھوڑے سے عمل کی بجا آوری بھی عمل کثیر کے برابر ہوتی ہے مثلاً اگر سپاہی دشمنوں اور مخالفین کے غلبہ کے وقت تھوڑا سا فکر و تردد بھی کرتے ہیں تو زمانہ امن کے مقابلے میں اسے کئی گنا زیادہ مقام اعتبار حاصل ہوجاتا ہے [4]۔"

ایک دوسرے مکتوب میں اطاعتِ رسول کی یوں تلقین کی:

"اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسولؐ کی اطاعت کو عین اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ یعنی جو شخص رسول کے احکام و فرامین کے آگے سرِ اطاعت خم نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرماں بردار بھی نہیں ہوسکتا۔ قَدْ کا کلمہ

---

[1] حضرت مجدد کے سیاسی مکتوبات ص ۱۴۴۔

[2] حضرت مجدد اور ان کے ناقدین، ص ۵۳، شاہ ابوالحسن زید فاروقی

[3] مکتوب ۴۹: دفتر اول [4] مکتوب ۵۰ دفتر اول

اسی حقیقت کو مؤکد کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے تاکہ کوئی بے شعور ان دونوں اطاعتوں کے درمیان فرق و امتیاز نہ کرنے پائے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: يُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض رسولوں پر تو ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ ایمان و کفر کے بین بین چلنا چاہتے ہیں بلاشبہ یہی لوگ کافر ہیں[1]۔

عبدالرحیم خان خاناں کو سنت کی اتباع پر ابھارتے ہوئے لکھا:

"ہمیں اپنی چند روزہ زندگی صاحب شریعت کی اتباع میں گزارنی چاہیئے۔ عذاب آخرت سے بچنے اور ابدی نعمتوں سے ہمکنار ہونے کا انحصار اسی اتباع و اطاعت پر ہے پس مال و دولت اور مویشیوں کی زکوٰۃ پوری پوری ادا کرنی چاہیئے اور بجز اطاعت رب اور کوئی مقصد نہ ہونا چاہیئے۔ کھانے پینے کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ادائے طاعت کے لئے قوت حاصل ہو۔ نفیس کپڑے پہننے سے خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ کے سوا اور کوئی مقصود نہ ہونا چاہیئے۔ علیٰ ہٰذا القیاس ہر معاملے میں ان علمائے حق کے فتوے کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیئے جنہوں نے رخصت سے گزر کر راہ عزیمت اختیار کی اور اس کو وسیلۂ نجات بنانا چاہیئے[2]"

خواجہ جہاں کو اسی اتباع و اطاعت کی تلقین اس طرح کی:

"اللہ تعالیٰ آپ کے دل کو زندہ و سلامت رکھے، آپ کو شرح صدر اور نفس کی پاکیزگی عطا کرے ..... یہ سب کچھ بلکہ روح، سر، خفی اور اخفیٰ کے سارے کمالات حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع کے ساتھ وابستہ ہیں آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور خلفائے راشدین کی پیروی کو لازم پکڑنا چاہیئے کیونکہ وہ ہدایت کے ستارے اور ولایت کے آفتاب ہیں۔ جس شخص کو ان کے اتباع کا شرف حاصل

---

[1] مکتوب ۱۵۲، دفتر اول [2] مکتوب ۷۰، دفتر اول

ہوا فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا اور جس نے ان کی مخالفت کی فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِیْدًا وہ سخت گمراہ ہوگیا۔[1]

شریعت اور طریقت کی بحثیں اس وقت زوروں پر تھیں۔ جاہلانہ تصوف نے ان دونوں میں تفریق پیدا کردی تھی یہ خیال عام ہونے لگا تھا کہ شریعت کی اتباع سلوک و طریقت کے ہر پیرو کے لئے ضروری نہیں ہے۔ حضرت مجدد نے اس گمراہ کن نظریہ پر کاری ضرب لگائی اور اس خیال کا خلافِ شرع ہونا ثابت کیا۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"مرشد یا پیر طریقت وہ ہے جو مرید کو انابت الی اللہ کی ترغیب دے اور اس تک پہنچنے کا راستہ دکھائے۔ شریعت کا مقصود یہ ہے کہ نفس امارہ کی خواہشات مغلوب ہوجائیں۔ لہٰذا جو شخص اپنے نفس کو مغلوب کرنے کا خواہاں ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ شریعت کی پابندی کرے۔ جو شخص جس قدر اتباع شریعت کی پابندی کرے گا اسی قدر خواہشات نفس سے دور ہوتا جائے گا کیونکہ نفس پر اتباع شریعت سے بڑھ کر گراں کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جو ریاضتیں اور مجاہدے اتباع شریعت کے مطابق نہیں ہیں وہ نہ قابل اعتبار ہیں نہ مفید ہیں۔"[2]

ایک دوسرے خط میں ولایت کی علامت اتباعِ شریعت کو قرار دیتے ہیں:

"وہ علامت جس سے یہ امتیاز ہوسکتا ہے کہ کون سچا ولی ہے اور کون جھوٹا، یہ ہے کہ جو شخص شریعت کا پابند ہے، جس کی مجلس میں انسان کا دل اللہ کی طرف راغب و متوجہ ہو اور ماسوا کی طرف سے سرد ہوجائے وہ سچا ہے اور اختلافِ مدارج کے ساتھ اولیا میں شامل ہے لیکن جن لوگوں کے اعمال اس گروہ سے مطابقت نہیں رکھتے وہ محروم مطلق ہیں۔"[3]

حضرت مجدد نے ظاہر شریعت کی مخالف باتوں کو کفر طریقت قرار دیا:

"مشائخ قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم میں سے جس بزرگ نے سطحیات زبان سے نکالی ہیں اور ظاہر شریعت کی مخالف باتیں کہی ہیں، وہ سب کفر طریقت کے مقام میں ہوئی ہیں۔ جو مستی و بے تمیزی کا مقام ہے جو بزرگ اسلام کی دولت حقیقت سے مشرف ہوئے ہیں وہ اس

---

[1] مکتوب ۲۵، دفتر اول [2] حضرت مجدد کے سیاسی مکتوبات ص ۱۱، مرتب آباد شاہ پوری

[3] مکتوب ۹۲، دفتر دوم

قسم کی باتوں سے پاک اور بری ہیں وہ ظاہر و باطن میں انبیاء کے پیروکار اور متبع ہیں[1]۔"

سماع و مزامیر، وجد و حال اور رقص و سرود کو حضرت مجدد نے صوفیان خام کا نجی عمل قرار دیا اور صاف لکھا کہ ان چیزوں کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نہ عبادت و طاعت سے ان کا کوئی تعلق ہے فرمایا:

"غنا کی حرمت میں آیات و احادیث اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا شمار کرنے سے انسان معذور ہے کسی زمانے اور کسی دور میں کسی ایک فقیہہ نے بھی سرود کے مباح ہونے کا فتویٰ نہیں دیا اور نہ رقص اور پاکوبی کو جائز قرار دیا ہے۔ آج کے صوفیانِ خام نے سرود و رقص کو دین و طاعت اور عبادت بنالیا ہے اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا یہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے اپنے دین کو لہو و لعب بنالیا ہے[2]۔"

دنیا طلبی، مناصب و اعزازات کی پرستش، جاہ و حشم کی غلامی اور ریاست و اقتدار سے عشق یہ وہ بیماریاں تھیں جو اُمت کے اندر سرایت کر گئی تھیں اور انہیں امراض نے اکبر کے دین الٰہی کی جڑیں پھیلانے میں مدد دی تھی چنانچہ حضرت مجدد نے اپنے ارادت مند امراء اور عام مسلمانوں کو اس سے بچانے کی کوشش کی اور دنیا کی فتنہ سامانیوں سے انہیں متنبہ کیا۔ شیخ فرید کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

"دنیا بظاہر شیریں ہے اور تر و تازہ نظر آتی ہے لیکن فی الحقیقت زہر قاتل، متاعِ کاذب اور دامِ بلا ہے اس کا منظور نظر ذلیل و خوار اور اس کا عاشق فاطر العقل ہوتا ہے اس کی مثال سونے میں مڑھی ہوئی نجاست اور شکر ملی ہوئی زہر کی ہے دانا وہی ہے جو اس کھوٹی متاع پر فریفتہ نہ ہو اور خراب اسباب کا اسیر دام نہ ہو[3]۔"

ایک دوسرے خط میں لکھا:

"انسان کے نفس امارہ کی فطرت میں جاہ و ریاست کی محبت گندھی ہوئی ہے اس کا مقصود اپنے ہمسروں پر ہمہ تن تفوق حاصل کرنا ہے وہ چاہتا ہے کہ ساری مخلوق اس کی محتاج اور

---

[1] مکتوب ۹۵، دفتر دوم
[2] مکتوب ۲۶۶ دفتر اوّل
[3] مکتوب ۵۰، دفتر اول

اس کے اوامر و نواہی کی پابند ہو جائے اور وہ کسی کا محتاج و محکوم نہ ہو گویا وہ خدائے بے مثل کے ساجھی اور شریک ہونے کا مدعی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ وہ اس نامسعود شرکت پر بھی راضی نہیں ہوتا اور خواہاں ہوتا ہے کہ اکیلا وہی حکمراں ہو اور ساری دُنیا اسی کے آگے محکوم و نگوں سار !

حدیث قدسی میں ہے: "اپنے نفس کو دُشمن رکھ کیونکہ وہ میری دشمنی میں کھڑا ہے۔"

لہٰذا جاہ و ریاست اور برتری و تکبر وغیرہ جو نفس کا مطلوب و مقصود ہیں ان کے حصول کے لئے نفس کو پالنا درحقیقت اسے اللہ تعالیٰ کی دشمنی میں مدد اور قوت دینے کے مترادف ہے[1]۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مجدد نے تربیت فکر و شعور اور تطہیر کردار و عمل کا زبردست کارنامہ انجام دیا۔ اسلام کی صحیح تعلیمات عوام اور امرا تک پہنچائیں، تصوف و طریقت اور تشیع و الحاد کی بیخ کنی کی، اسلام سے محبت اور اس پر عمل پیرا ہونے کا جذبہ پیدا کیا، معروفات کو اپنانے اور منکرات سے بچنے کا داعیہ اُبھارا اور دعوت و اصلاح کو اپنی زندگی کا مقصد اور نصب العین بنایا۔

تحریک نفاذ شریعت

عام مسلمانوں کے اندر ہمیشہ اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے وابستگی اور والہانہ عقیدت موجود رہی ہے انہوں نے اپنی ساری کوتاہیوں اور خرابیوں کے باوجود اسلام کے خلاف خطرات اور فتنوں کا مقابلہ کیا ہے چنانچہ تاریخ کا ایک طالب علم یہ دیکھتا ہے کہ اکبری الحاد و زندقہ کو ختم کرنے کے لئے بھی متعدد بار مسلح بغاوتیں ہوئیں اور اس کا تختہ اُلٹنے کی کوشش ہوئی ۱۵۸۱ء کا سال اکبر کی زندگی کا نازک ترین سال تھا۔ ملا محمد یزدیؒ نے ۱۵۸۰ء کے شروع میں اکبر کے خلاف فتویٰ دیا تھا، شیخ سلیم چشتی کے صاحبزادے شیخ بدرالدین نے دین جدید کے رسوم و شعائر کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، مخدوم الملک اور صدر الصدور کو ۱۵۸۰ء کے اوائل میں مخالفت کے جرم میں حج پر بھیج دیا گیا اور بلا اجازت واپس آنے پر پابندی لگا دی گئی۔ قاضی جلال الدین ملتانی نے اکبری الحاد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اس جرم میں جعلی مقدمہ چلا کر اکبر نے انہیں

---

[1] مکتوب ۵۲، دفتر اوّل

دکن کی طرف جلا وطن کر دیا۔ اس کے رضاعی بھائی خانِ اعظم نے ہر خطرہ مول لے کر ان خرافات سے اسے روکنے کی کوشش کی تھی، امیر قطب الدین محمد خاں آتکہ نے اس دین کی مخالفت کی تھی امیر شہباز خاں کنبوہ نے اپنی حق گوئی کی پاداش میں قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں اور دوسرے بہت سے امراء اور مسلمان اس دینِ الٰہی سے ناخوش تھے۔ حتیٰ کہ بہار، بنگال میں بغاوت بھی ہوئی اور مرزا محمد حکیم حاکم کابل کو جو اکبر کا بھائی تھا، ہندوستان کا بادشاہ بنانے کی کوشش کی گئی جس میں اکبر کے خواجہ منصور جیسے لائق اور قابل دیوان بھی شریک تھے اور جنہوں نے ہندوستان میں دہ سالہ بندوبست کا سلسلہ شروع کیا تھا اور مرزا حکیم سے خط و کتابت کی پاداش میں انہیں پھانسی دی گئی تھی[1]

لیکن یہ ساری کوششیں ایک محدود دائرے کے اندر تھیں اور روز بروز ان کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا تھا اور یہ مزاحمت بھی کمزور پڑتی جا رہی تھی ان پرآشوب حالات میں حضرت مجددؒ نے اقتدار کا رخ بے دینی سے موڑنے اور اکبر کے دین جدید کو ختم کرنے کی کوشش کی، آپ کے ارادتمند دل میں اکبر کے متعدد درباری بھی تھے آپ نے ان کے نام متعدد خطوط لکھے اور انہیں اسلام کی غربت و بے کسی کو ختم کرنے اور شریعت کی ترویج و اشاعت اور اقامتِ دین کی دعوت دی۔ ان کے دلوں میں دین کی غیرت و حمیت کی آگ روشن کی اور پھر انہی کے ذریعہ حالات کا دھارا موڑنے کی کوشش کی۔

جہاں گیر کی تخت نشینی کے بعد شیخ فرید کو لکھا:

"آج کہ دولت اسلام کی ترقی میں مانع اسباب کے زوال اور بادشاہِ اسلام کی تخت نشینی کی خوش خبری خاص و عام کو پہنچی، اہل اسلام نے ضروری سمجھا کہ بادشاہ کے ساتھ تعاون اور ترویج شریعت اور تقویتِ ملّت کے متعلق اس کی رہنمائی کریں خواہ یہ امداد و تقویت زبانی ہو یا عملی۔ اوّلین امداد یہ ہے کہ مسائل شرعیہ اور کتاب و سنّت اور اجماعِ امّت کے مطابق عقائد اسلام کو واشگاف بیان کیا جائے تاکہ کوئی بدعتی اور گمراہ بادشاہ کو غلط راستے پر نہ ڈال سکے اور کام کو بگاڑ نہ ڈالے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بادشاہ کا قرب بنایا اور اس کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی استطاعت بخشی ہے اس لئے آپ سے توقع ہے کہ خلوت و جلوت میں شریعت محمدی کی ترویج کی پوری کوشش کریں گے اور مسلمانوں کو غربت و

---

[1] چراغ راہ کراچی کا نظریۂ پاکستان نمبر ص ۱۳۸، مضمون پاکستان ـ تاریخ کے پس منظر میں

بے چارگی کے عالم سے نکالیں گے۔"[1]

خان جہاں کے نام لکھا:

"آپ جانتے ہیں کہ بادشاہ روح کی مانند ہوتا ہے اور باقی انسان جسم کی مثال۔ اگر روح صالح ہوتی ہے تو جسم بھی صالح اور سالم ہوتا ہے اور اگر روح میں کوئی بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے تو سارا جسم اس بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بادشاہ کی اصلاح کی کوشش کرنا تمام انسانوں کی اصلاح کی کوشش کے مترادف ہے اور یہ اصلاح اسلامی تعلیمات کے اظہار سے ہو سکتی ہے اس طرح کہ جب بھی موقع ہاتھ آئے اہل سنت والجماعت کے معتقدات کے موافق صحیح اسلامی تعلیمات بادشاہ کے کان میں ڈالی جائیں اور مخالفین کے مذاہب کی تردید کی جائے۔ اگر یہ دولت حاصل ہو جاتی ہے تو گویا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی وراثت عظمیٰ ہاتھ آجاتی ہے اور آپ کو تو یہ دولت مفت مل رہی ہے اس کی قدر و قیمت جانی چاہیے۔"[2]

خان اعظم کے نام لکھتے ہیں:

"اسلام کی غربت اور بے چارگی اس انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ کفار برملا اسلام پر زبان طعن دراز کرتے ہیں اور مسلمانوں کی مذمت کرتے ہیں۔ احکام کفر کو بے دھڑک جاری کرتے ہیں اور مسلمان ہیں کہ انہیں اسلامی احکام کے اجراء سے روکا جاتا ہے اور ان کی بجا آوری پر انہیں مقہور و مطعون گردانا جاتا ہے۔"[3]

حضرت مجددؒ نے اپنے ان ارادتمندوں کو وقت کی قدر و قیمت اور نزاکت کا احساس دلایا اور انہیں ابھارا کہ یہ وقت کام کرنے کا ہے اگر اسے ہاتھ سے جانے دیا تو منزل مقصود آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گی اور پھر ماضی کے شب و روز پلٹ آئیں گے۔ خان اعظم کے نام لکھتے ہیں:

"جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے کام اور باتوں میں تاثیر بخشی ہے اور آپ کی دینی عظمت اپنے ہم عصروں کی نگاہ میں ظاہر ہو گئی ہے، یہ کوشش فرمائیں کہ اہل کفر کے وہ بڑے بڑے رسوم و شعائر جو مسلمانوں میں رائج کر دیئے گئے ہیں، مٹا دیئے جائیں اور مسلمان ان

---

[1] مکتوب ۴۷، دفتر اوّل   [2] مکتوب ۶۷، دفتر دوم

[3] مکتوب ۶۵، دفتر اوّل

منکرات سے محفوظ ہو جائیں ..... " پچھلی حکومت کو دین مصطفوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ عناد معلوم ہوتا تھا موجودہ حکومت میں بظاہر وہ عناد نہیں ہے اور اگر ہے تو لاعلمی کی بنا پر۔ ڈر یہ ہے کہ کہیں یہاں بھی عناد کارفرما نہ ہو جائے اور مسلمانوں کے لئے معاملہ اور بھی تنگ ہو جائے ع

چو بیدار بر سر ایمانِ خویش می لرزم[1]

صدر جہاں کے نام لکھتے ہیں :

"اب جبکہ سلطنت میں انقلاب آگیا ہے اور غیر مسلموں کا جذبہ عناد ٹوٹ چکا ہے، ائمہ اسلام وزراء اور علمائے کرام پر لازم ہے کہ باہمہ قوت احکام شریعت کی ترویج میں لگ جائیں سب سے پہلے ان ارکان اسلام کو قائم کریں جنہیں عہد ماضی میں منہدم کر دیا گیا تھا۔ تاخیر میں کچھ بھی بھلائی نہیں ہے۔ اس تاخیر و تعویق سے ہم غریبوں کے دلوں میں سخت اضطراب برپا ہے۔ زمانہ ماضی کے شدائد و مصائب سے مسلمانوں کے دل ابھی تک متاثر ہیں ایسا نہ ہو ان کا تدارک نہ ہونے پائے اور اسلام کی غربت اور بڑھ جائے"[2]

لالہ بیگ کے نام رقمطراز ہیں :

"اگر آغازِ حکومت ہی سے اسلامیت نے رواج پا لیا اور مسلمانوں نے اپنا وقار قائم کر لیا تو فبہا، لیکن اگر معاذ اللہ کچھ بھی وقفہ پڑ گیا تو مسلمانوں کا معاملہ بہت مشکل ہو جائے گا۔ الغیاث ثم الغیاث، الغیاث"[3]

حضرت مجدد اس کام کی عوام و خواص کو بار بار تاکید کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر اس تبلیغ حق اور دعوت دین کی پاداش میں سختیاں اور مصائب بھی جھیلنا پڑیں تو گریز نہ کرنا چاہیئے۔ شیخ فرید کو لکھتے ہیں :

"بہر حال مسائل شرعیہ کی حقیقت سے بادشاہ کو مطلع کرنا ضروری ہے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا علماء اور بادشاہ کے مقربین اس کے ذمہ دار ہوں گے۔ ایسی گفتگوؤں کی پاداش میں اگر تکلیف بھی اٹھانی پڑے تو بڑی سعادت ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے احکامِ شرع

---

[1] مکتوب ۶۵، دفتر اول
[2] مکتوب ۱۹۵، دفتر اول
[3] مکتوب ۸۱ دفتر اول

کی تبلیغ میں کیا کیا مصائب و شدائد نہیں جھیلے اور کیا کیا دُکھ اور رنج نہیں دیکھے۔ ان کے گُل سرسبد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَا اُوذِیَ نَبِیٌّ مِثْلَ مَا اُوذِیْتُ

کسی نبی کو اتنی تکلیفیں نہیں دی گئیں جتنی مجھے۔[1]

اسی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ بادشاہ چار علماء کو دربار میں رکھنے پر آمادہ ہو گیا جو نفاذ شریعت میں اس کی رہنمائی کر سکیں۔ حضرت مجدد نے بادشاہ کے اس اقدام پر اظہار مسرت فرمایا مگر اس تجویز میں جو خطرات پنہاں تھے ان سے اپنے ارادت مند درباری امراء کو متنبہ فرمایا اور رہنمائی کی کہ چار کے بجائے ایک حق پرست عالم ہونا چاہیئے نیز علمائے سوء سے خبردار رہنے کی تلقین فرمائی۔ شیخ فرید کے نام لکھا:

"الحمد للہ علیٰ ذالک۔ مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر خوش خبری اور کیا ہوگی اور ماتم زادوں کو اس سے زیادہ مژدۂ جانفزا کون سا ہوگا..... یہ حقیر اس سلسلے میں کچھ لکھنا ضروری سمجھتا ہے۔

عرض یہ ہے کہ ایسے دیندار علماء بہت تھوڑے ہیں جن کے دل جاہ و امارت کی محبت سے خالی ہوں اور جو ترویج شریعت اور حمایت ملت کے سوا اور کوئی غرض نہ رکھتے ہوں۔ ان علماء میں اگر حُبِّ جاہ و منصب پیدا ہو گئی تو وہ ایک دوسرے کے حریف بن جائیں گے۔ ہر ایک اپنی فضیلت و علمیت جتائے گا۔ پھر وہ اختلافی باتوں کو بیچ میں لے آئیں گے اور انہیں بادشاہ کا تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ بنائیں گے۔ لامحالہ اس کام میں سخت مشکل پیدا ہو جائے گی۔ عہدِ ماضی میں علماء کے اختلافات ہی نے دُنیا کو مصیبت میں ڈالا تھا اور اب پھر وہی معاملہ درپیش ہے ترویج شریعت تو درکنار اندیشہ ہے کہ یہ تجویز پھر تخریب دین کا سبب نہ بن جائے، اگر اس مقصد کے لئے ایک عالم منتخب کیا جائے تو سعادت و خوش بختی کے کیا کہنے کہ ایسے عالم کی صحبت تو اکسیر ہے لیکن اگر ایسا عالم نہ ملے تو پھر اچھی طرح سوچ بچار کر کے گروہ علماء میں سے جس کو بہترین سمجھیں اسے اختیار کر لیں۔"

---

[1] مکتوب ۱۹۳، دفتر اول

پھر اسی مکتوب میں علمائے دین کا کردار اور معاشرے میں ان کی اہمیت و افادیت ان الفاظ میں بیان فرمائی :

"جس طرح مخلوق خدا کی نجات علماء کے وجود سے ہے اسی طرح دُنیا کا خسران بھی ان سے وابستہ ہے ایک بزرگ نے ابلیس لعین کو دیکھا کہ بیکار اور مطمئن بیٹھا ہے۔ اس سے اس کا سبب پوچھا۔ بولا کہ اس زمانے کے علماء میرا کام انجام دے رہے ہیں اور دُنیا کو بہکانے اور گمراہ کرنے کے لئے وہی کافی ہیں ؎

عالم کہ کامرانی و تن پروری کند ۔۔۔ او خویشتن گم است کرا رہبری کند

الغرض اس سلسلے میں صحیح غور و فکر کے بعد اقدام کی ضرورت ہے جب معاملہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو پھر اس کا کوئی مداوا ہونے نہیں پاتا"[۱]

صدر جہاں کے نام لکھتے ہیں :

"سُنا ہے بادشاہِ اسلام اپنے اسلامی رُجحانات کی بنا پر کچھ علماء چاہتے ہیں اَلحمدُ للہِ علیٰ ذالِکَ ۔ جناب کو معلوم ہو کہ گزشتہ دور میں جو بگاڑ بھی پیدا ہوا، علمائے سوء کی بدبختی سے پیدا ہوا اس معاملے میں خوب اچھی طرح دیکھ بھال کر دیندار علماء کا انتخاب کیا جائے۔ علمائے سوء دین کے چور ہیں ان کا مقصد جاہ و مال اور خلق خدا کی نگاہوں میں قدر و منزلت کا حصول ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ان کے فتنے سے پناہ میں رکھے۔ ہاں جو اچھے علماء ہیں وہ بہترین لوگ ہیں۔ انہی کی روشنائی قیامت کے روز شہدائے فی سبیل اللہ کے خون کے ساتھ تولی جائے گی اور اس روشنائی کا پلہ بھاری رہے گا"[۲]

حضرت مجدد نے امرائے دربار کو تنفیذ شریعت کی ترغیب و تحریک پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنے ایک مرید شیخ بدیع الدین کو لشکر شاہی میں ارشاد و ہدایت کے لئے بھی بھیجا اور انہیں اس سلسلہ میں بڑی کامیابی ہوئی اور فوجی سپاہی اور افسر بڑی تعداد میں آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے لگے[۳] جس سے ملحد امرائے لشکر و دربار کو سخت تشویش ہوئی، چنانچہ انہوں نے سر توڑ مخالفت کی۔

---

[۱] مکتوب ۵۳، دفتر اوّل ۔۔۔ [۲] مکتوب ۱۹۴، دفتر اوّل

[۳] حضرت مجدد الف ثانی، ص ۱۹۶، مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب، کراچی،

علمائے سو، جاہل صوفیوں اور اہل بدعت نے آلۂ کار کا کام کیا۔ گوں ناگوں اتہامات تراش کر حضرت مجدّد کے خلاف ایک عام شورش کھڑی کردی اور قتل تک کا فتویٰ دے دیا گیا[1] چنانچہ آپ کو جہاں گیر نے دربار میں طلب کیا۔ وہاں آپ نے دربار کے دستور کے مطابق بادشاہ کو سجدہ نہ کیا اور بڑی جرأت و بے باکی کے ساتھ باتیں کیں اور اپنے خلاف پھیلی ہوئی باتوں کے سلسلے میں حقیقی موقف پیش کیا چنانچہ جہاں گیر نے غضبناک ہو کر قلعۂ گوالیار میں قید کرنے کا حکم دیا۔ ایک سال تک قید میں رہے لیکن قید و بند کی صعوبتیں آپ کو شکست نہ دے سکیں بلکہ آپ کے جذبہ و شوق میں مزید اضافہ ہوا۔ چنانچہ قید خانے سے عبدالحق محدث دہلویؒ کو لکھتے ہیں:

"مصائب و شدائد میں اگرچہ تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں تاہم اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائیوں سے بہرہ ور ہونے کی امید ہوتی ہے اس دنیا کی بہترین دولت غم و اندوہ اور اس کے دسترخوان کی بہترین خوش ذائقہ نعمت درد و الم ہے۔ ان شکر پاروں کو اللہ تعالیٰ نے تلخ دوا کے باریک خول میں لپیٹ دیا ہے اور اس طریقے سے آزمائش کا راستہ کھول دیا ہے۔ سعادتمند لوگ ان کی شیرینی پر نظر رکھتے ہیں اور ان کی تلخی سے شیرینی کی طرح شادکام ہوتے ہیں[2]۔"

قید سے رہا ہوئے تو تین چار سال تک لشکر میں رکھے گئے وہاں رشد و ہدایت، اصلاح کردار اور تزکیۂ نفس کا فیضان جاری رہا اپنے صاحبزادوں کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"لشکر میں ہمارا یہ غیر اختیاری اور بے خواہش قیام بے حد مفید ہے یہاں کی ایک ساعت دوسرے مقامات کی بہت سی ساعتوں سے بہتر نظر آتی ہے یہاں وہ کچھ میسر ہے جو دوسرے مقام پر نہیں ہوتا۔ یہاں کے علوم و معارف اور اس مجمع کے احوال و مقامات بالکل نرالے ہیں۔ بادشاہ کی طرف سے جو تکلیف ہے اسے اپنے بزرگ و برتر آقا کی کمال مہربانی اور رضامندی کا دروازہ سمجھتا ہوں اور اس قید کو اپنے لئے باعث سعادت گردانتا ہوں[3]۔"

لشکر شاہی میں اس قیام کے دوران بادشاہ کے ساتھ بھی آپ کی صحبتیں رہیں اور آپ

---

[1] حضرت مجدد کے سیاسی مکتوبات، آبادشاہ پوری ص ۷۰، ۷۱

[2] مکتوب ۲۹، دفتر دوم، [3] مکتوب ۸۷، دفتر سوم

نے اسے اسلام کی تعلیمات، اس کے فرائض و مستحبات اور حقوق و ذمہ داریوں سے روشناس کرانے کے لئے کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا[1]۔ چنانچہ صاحبزادگان کے نام ایک خط میں اس گفتگو کی ایک جھلک موجود ہے جو آپ نے مجلس شاہی میں کی تھی، لکھتے ہیں:

"عجیب و غریب صحبتیں گزر رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امور دینیہ اور اصول اسلامیہ میں سستی اور مداہنت راہ نہیں پاتی۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں بھی وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں۔ اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جاتے۔ خاص کر آج ماہ رمضان کی سترھویں رات کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت، عقل کی عدم استقلال، آخرت کے ایمان، اس کے عذاب و ثواب، اللہ تعالیٰ کے دیدار، ختم نبوت، ہر صدی کے مجدد، خلفائے راشدین کی پیروی، تراویح کی سنتوں، تناسخ کے باطل ہونے اور جنوں اور جنیوں کے احوال اور ان کے عذاب و ثواب کا مسئلہ مذکور ہوا۔ بادشاہ دل جمعی سے سنتا رہا اور کسی قسم کا کوئی تغیر اس کی حالت میں رونما نہ ہوا[2]۔"

چنانچہ ان صحبتوں سے بادشاہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اس نے نہایت عزت و اکرام سے آپ کو جیل سے رہا کیا اور شاہزادہ خرم (شاہ جہاں) کو ان کے حلقۂ ارادت میں داخل کیا۔

آخر کار حضرت مجدد کی ان کوششوں اور مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق کو فتح ملی اور باطل کو ذلت و رسوائی سے دوچار ہونا پڑا۔ جہاں گیر جیسا شراب کا متوالا شریعت اسلام کا معتقد ہوا اور ترویج شریعت کے سلسلے میں اس نے متعدد اقدامات کئے۔ خود لشکر شاہی اور امرائے دربار میں ایسا دیندار عنصر پیدا ہوا جس نے آگے چل کر مملکت کے نظام کو اسلامی شریعت میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

دوسری طرف ہند و مسلم تہذیب کا معجون مرکب جو تیار ہو رہا تھا اور بھگتی تحریک کے اثرات اپنا رنگ لا رہے تھے وہ سب آپ کی کوششوں سے نیم جان ہو گئے۔ اور رفتہ رفتہ غیر مسلم اثرات

---

[1] حضرت مجدد الف ثانی ص ۲۱۰، مولانا سید زوار حسین شاہ

[2] مکتوب ۴۳، دفتر سوم

مسلمانوں کے ذہن و فکر سے زائل ہوتے گئے اور اسلامی تہذیب و تمدن کو برگ و بار لانے کا موقع ملنے لگا۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے اپنے خطوط میں شیخ احمد سرہندیؒ کے سلسلے میں جو پیشگوئی کی تھی اور انہیں مستقبل کا ایسا روشن چراغ بتایا تھا جس کے نور سے ظلمتیں کافور ہوجائیں گی، وہ پوری ہوئی اور آپ ہی کے ہاتھوں اکبری الحاد کا قلع قمع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مجددؒ کو اپنوں کے سوا غیروں نے بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ڈاکٹر آرنلڈ اپنی مشہور کتاب PREACHING OF ISLAM میں لکھتا ہے:

"شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں ایک سنّی عالم شیخ احمد مجدد نامی تھے جو شیعی عقائد کی تردید میں خاص طور پر مشہور تھے۔ شیعوں کو اس وقت دربار میں رسوخ حاصل تھا۔ ان لوگوں نے کسی بہانے سے انہیں قید کرادیا دو برس قید میں رہے اور اس مدت میں انہوں نے اپنے رفقائے زنداں میں سے سینکڑوں بُت پرستوں کو حلقہ بگوش بنالیا" (ص ۴۱۲)

اسی طرح انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں ہے کہ:

"ہندوستان میں سترھویں صدی میں ایک عالم جن کا نام شیخ احمد مجدد تھا جو ناحق قید کرلئے گئے تھے ان کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے قید خانہ کے ساتھیوں میں سے کئی سو بُت پرستوں کو مسلمان بنالیا"[1] (جلد ۸ ص ۷۴۵)

---

[1] ماخوذ تذکرہ مجدد الف ثانی ص ۳۰۹، مولانا منظور نعمانی

شاہ ولی اللہ دہلویؒ

(۱۷۰۳ء ــــ ۱۷۶۳ء)

مختصر حالات

نام قطب الدین احمد تھا شاہ ولی اللہ کے نام سے عوام میں مشہور ہوئے۔ ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں تعلیم حاصل کرنا شروع کر دیا اور پندرہ سال کی عمر میں اس زمانے کا رائج نصاب تعلیم ختم کر لیا۔ درسی کتابوں کے ساتھ عمدہ اور پاکیزہ اخلاق، بہادری، باریک فہمی، کفایت شعاری، غیرت و حمیت جیسے اوصاف و کمالات اپنے والد سے حاصل کیے۔ ۱۷۱۸ء میں مسند تدریس پر بیٹھے اور بارہ سال تفسیر، حدیث، فقہ، اصول اور دینی عقلی علوم نہایت محنت سے پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد آپ حجاز گئے وہاں کے بزرگوں سے ملے اور ان سے حدیث کی سند بھی حاصل کی۔ ۱۷۳۱ء میں حج سے فارغ ہوتے اور ۲۰ دسمبر ۱۷۳۲ء کو دہلی واپس پہنچے۔ بقیہ عمر تعلیم و تصنیف اور تدریس میں بسر کی۔ ترسٹھ سال کی زندگی پا کر ۱۱۷۶ھ مطابق ۱۷۶۳ء میں دہلی میں وفات پائی۔

اساتذہ میں والد ماجد شیخ عبد الرحیم ان کے علاوہ شیخ محمد افضل سیالکوٹی، شیخ ابو طاہر کردی، شیخ وفد اللہ مکی، اور شیخ تاج الدین قلعیؒ شامل ہیں۔ آپ کے اہم اور نامور شاگرد یہ ہیں:

شاہ عبد العزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبد القادر، شیخ محمد عاشق دہلوی، شیخ محمد امین کشمیری، مرتضیٰ بلگرامی، شیخ جار اللہ ابن عبد الرحیم لاہوری، شیخ محمد ابو سعید بریلوی، شیخ رفیع الدین مراد آبادی، شیخ محمد بن ابو الفتح بلگرامی، شیخ محمد معین سندھی اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہم اللہ۔

نہایت متقی اور خدا رسیدہ شخص تھے، طلبہ، فقراء اور صالحین سے محبت کرتے تھے۔ مسلک اعتدال کا تھا فقہ و حدیث کو اور حدیث و قرآن کو جمع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

آپ کا دور وہ ہے جب مغلیہ سلطنت کے شیرازے بکھر رہے تھے، اورنگ زیب کی لائی ہوئی اصلاحات خطرہ میں پڑ گئی تھیں اور مغرب معاشی، تہذیبی، نفسیاتی اور سیاسی ہر لحاظ سے غالب ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسے ماحول میں شاہ صاحب نے اپنی گہری بصیرت، وسیع علم اور بے مثالی جرأت سے مسلمانوں کے عہد تاریک میں اپنی کھوئی ہوئی عظمتوں کو دوبارہ حاصل کرنے اور اسلام کو مکمل نظام کی حیثیت سے غالب کرنے کی راہ دکھائی مولانا مودودی کا یہ تجزیہ کتنا درست ہے!

"ایک طرف ان کے زمانے اور ماحول کو اور دوسری طرف ان کے کام کو جب آدمی بالمقابل رکھ کر دیکھتا ہے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اس دور میں اس نظر، ان خیالات، اس ذہنیت کا آدمی کیسے پیدا ہوگیا۔ فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلے، اور شاہ عالم کے ہندوستان کو کون نہیں جانتا۔ اس تاریک زمانے میں نشوونما پاکر ایسا آزاد خیال مفکر و مبصر منظر عام پر آتا ہے جو زمانہ اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے۔ تقلیدی علم اور صدیوں کے جمے جماتے تعصبات کے بند توڑ کر ہر مسئلہ زندگی پر محققانہ و مجتہدانہ نگاہ ڈالتا ہے اور ایسا لٹریچر چھوڑ جاتا ہے جس کی زبان، انداز بیان، خیالات نظریات، مواد تحقیق اور نتائج مستخرجہ کسی چیز پر ماحول کا کوئی اثر نہیں دکھائی دیتا حتیٰ کہ اس کے اوراق کی سیر کرتے ہوئے یہ گماں تک نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں اس جگہ لکھی گئی تھیں جس کے گردو پیش عیاشی، نفس پرستی، قتل و غارت، جبر و ظلم اور بدامنی اور طوائف الملوکی کا طوفان برپا تھا۔"[1]

مولانا شبلی نعمانی اس شخصیت کے بارے میں اپنی تصنیف "علم الکلام" میں یوں تبصرہ کرتے ہیں:

"ابن تیمیہؒ اور ابن رشدؒ کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا، اس کے لحاظ سے یہ اُمید نہیں رہی تھی کہ کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہوگا لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشہ دکھانا مقصود تھا کہ اخیر زمانے میں جبکہ اسلام کا نفس بازپسیں تھا، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے

---

[1] تجدید و احیائے دین، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ص ۸۹، ۹۰۔

غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے ہیں[1]

علامہ اقبال نے شاہ ولی اللہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"ان کی ذات پر گویا الٰہیات اسلامیہ کا خاتمہ ہو گیا ہے[2]

ایک دوسری جگہ فرمایا کہ:

"ہم مسلمانوں کو ایک بہت بڑا کام درپیش ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سر نو غور کریں۔ یہ غالباً شاہ ولی اللہ دہلوی تھے جنہوں نے سب سے پہلے ایک نئی رُوح کی بیداری محسوس کی ہے[3]

مولانا ابوالکلام آزاد بارھویں صدی ہجری کے دیگر مسلمان علماء اور مفکرین سے شاہ صاحب کا موازنہ کرتے ہوئے تذکرہ میں رقمطراز ہیں:

"پھر بارھویں صدی کا ایک عظیم ترین ظہور علم و معارف دیکھو۔ زمین بنجر ہو چکی تھی، پھر بھی کھیتوں کی سرسبزی اور چمنوں کی لالی سے کوئی گوشہ بالکل خالی نہ تھا۔ تیرھویں صدی کے تمام کاروبار علم و طریقت کے اکابر و اساتذہ اس صدی میں سربرآوردہ ہوئے، بعض بڑے بڑے سلاسلِ درس و تدریس کی بنیادیں اسی میں استوار ہوئیں جیسے خاندان مشہور فرنگی محل اور ہندوستان سے باہر بلادِ عربیہ و عثمانیہ میں اکثر مشاہیر علم و ارشاد جیسے شیخ ابراہیم کورانی، محمد بن احمد سفارینی نجدی، سید عبدالقادر کوکباری، شیخ عمر فاسی تیونسی، شیخ سالم بصری، امیر محمد بن اسمٰعیل یمانی، شیخ عبدالخالق زبیدی، علامہ خلاصی صاحب ایقاظ، شیخ محمد حیات سندھی مدنی وغیرہم کہ شاہراہ عام سے اپنی الگ راہ رکھتے تھے اور حقیقت مستورہ کے شناسا و حق آگاہ تھے۔ بایں ہمہ معلوم ہے کہ وہ جو دورۂ آخر کے "فاتح" اور سلطانِ عصر ہونے کا مقام تھا اور قطبیت وقت کا، وہ صرف حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ (رضی اللہ عنہ)

---

[1] علم الکلام جلد اول ص ۸۷، شبلی نعمانی،

[2] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۱۴۴، اردو ترجمہ سید نذیر نیازی

[3] ایضاً ص ۱۴۵،

ہی کے لئے تھا۔ اور لوگ بھی بیکار نہ رہے، کام کرتے رہے مگر جو کام یہاں انجام پایا وہ صرف یہیں کے لئے تھا[1]

مولانا رحیم بخش دہلوی اپنے مخصوص انداز میں شاہ صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"جب ہندوستان کے اقبال دیاوری کا ستارہ چمکا تو فطرت نے جولانگاہ حدیث کے شہسوار کو پیدا کیا یعنی جناب شاہ ولی اللہ صاحب اس سرزمین میں ظاہر ہوئے جن کے علم وفضل کی صدائیں ہندوستانی حدود سے نکل کر عرب وعجم میں پہنچیں اور جن کی رُوحانی مقبولیت تمام بلادِ اسلامیہ میں پھیل گئی۔ کیونکہ آپ علم وعمل دونوں میں خاص طور پر مشہور تھے اور آپ کا علمی کمال اعلیٰ درجے کی وقعت کے ساتھ لوگوں کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ لہٰذا اطرافِ عالم کے لوگ بے اختیارانہ جوش کے ساتھ آپ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور آپ کے درس وتدریس کا بازار ہر وقت گرم رہتا تھا۔ آپ نے بڑی مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ علم نبوی کی اشاعت میں کوشش کی اور اپنی انتھک کاوشوں سے علم نبوی کو اس قدر رواج دیا کہ اب جناب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ڈالی ہوئی بنیادیں آسمان سے بات کرنے لگیں۔ اس لحاظ سے اگر ہم اس اولیت کے تمغہ کا جو جناب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے لئے تجویز کیا گیا ہے، حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کو مستحق قرار دیں تو شاید بے جا نہ ہوگا کیونکہ جس قدر حدیث کی اشاعت آپ کے زمانہ میں ہوئی، اس کا ننانویں حصہ نے بھی سابق کے زمانے میں اشاعت نہ پائی تھی"[2]

قرآن سے اُمت کو جوڑنے کی کوشش

شاہ صاحب کا اوّلین کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اُمت کو براہِ راست قرآن سے جوڑنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس کے لئے آپ نے قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا جو فتح الرحمٰن کے نام سے شائع ہوا اس سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ مسلم طبقہ کو براہِ راست قرآنی تعلیمات سے روشناس

---

[1] تذکرہ ص ۹۸ - ۲۹۷، مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی

[2] حیات ولی ص ۳۰۵، مولانا رحیم بخش دہلوی

کرایا جائے۔ چنانچہ یہ ترجمہ اپنی بعض منفرد خصوصیات کی وجہ سے کافی مقبول ہوا۔ خود شاہ صاحب نے فتح الرحمٰن کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"متن قرآن کے بعد بچوں کو چند مختصر فارسی کتابیں پڑھائی جائیں تاکہ وہ فارسی زبان سمجھنے کے لائق ہو جائیں پھر یہ کتاب (فتح الرحمٰن) پڑھائی جائے۔ چونکہ اہل حرفہ اور سپاہیوں کے بچوں کو عربی کی تعلیم پوری حاصل کرنے کی امید نہیں ہوتی اس لئے یہ کتاب بچپن ہی میں پڑھا دینی چاہیئے تاکہ سب سے پہلے جو چیز ان کے دماغ میں اُترے وہ اللہ کی کتاب کے مطالب ہوں۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"اللہ نے چاہا تو اس سے عام مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔"[1]

ترجمہ کے علاوہ فارسی میں اس کا مقدمہ بھی تحریر فرمایا اور قرآن پاک پر بہتیرے حواشی بھی لکھے جو فوائد فتح الرحمٰن کے نام سے مشہور ہیں۔ تیسری طرف آپ نے قرآن حکیم کی تفسیر کے اصول بھی مدون کئے اور الفوز الکبیر فی اصول التفسیر کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی جس میں چار ابواب قائم کرکے قرآن کے علوم، قرآن فہمی کی راہ میں دقتیں، نزول کی ترتیب و تدوین، اور تفسیر کے مختلف فنون زیر بحث آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ کا پانچواں رسالہ فتح الخبیر ہے جو قرآن حکیم کے مشکل الفاظ کی معنیٰ خیز تشریح پر مشتمل ہے۔

آپ کے بعد شاہ صاحب کے دو صاحبزدوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے قرآن حکیم کا پہلی بار اُردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ایک بہت بڑی خدمت تھی جسے ولی اللّٰہی خاندان نے انجام دیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے جریدہ الفرقان کے مدیر کے نام لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں یہ قرآن فہمی کا چرچا آج جو کچھ نظر آتا ہے اور یہ اُردو انگریزی اور دوسری زبانوں میں جو بیسیوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں، شائع ہو رہے ہیں یا آئندہ شائع ہوں گے ان کے اجر کا جزو اعظم یقیناً شاہ صاحب کے حسنات میں لکھا جائے گا۔ یہ

---

[1] مقدمہ قلمی فتح الرحمٰن ماخوذ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفۂ عمرانیات و معاشیات ص ۳۲، شیخ بشیر احمد، بی۔ اے

سارے چراغ اسی چراغ سے روشن ہوتے ہیں[۱]۔"

علامہ عبیداللہ سندھی فتح الرحمٰن کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"فتح الرحمٰن قرآن حکیم کا فارسی میں ترجمہ ہے اس میں کوشش کی گئی ہے کہ قرآن حکیم کے الفاظ مختصر موزوں فارسی الفاظ میں ترجمہ ہو جائیں ترجمے کی نزاکت پر اضافہ یہ ہے کہ کہیں کہیں فوائد بھی لکھ دیئے ہیں جن سے قرآن عظیم کی یہ تفسیر، عام تفسیر سے ممتاز ہو گئی ہے مثلاً انبیاء کا سلاطین و ملوک سے جہاد کرنا، تہذیب و شائستگی کو قانونی شکل دینا عامۃ انسانیت کے مسلمات سے ہے، چونکہ عام تفاسیر قرآنی اس زمانے میں لکھی گئی ہیں، جب اسلامی نظام برسر اقتدار تھا اندا اس زمانے میں بادشاہ اور امیر کی موجودگی کی وجہ سے اس کی سرکردگی کے بغیر لڑنا منصور نہ تھا اس لئے ان تفاسیر میں قرآنی واقعات کو ایسے انداز میں بیان کیا گیا ہے جس کا پڑھنے والے کے دل پر یہ اثر پڑتا ہے کہ گویا قرآن حکیم کا ماننے والا جب تک اپنے آپ کو کسی بادشاہ اور فوج کے ساتھ منسلک نہ کر دے، اس کا مخالفین سے لڑنا اور مقابلہ کرنا جائز نہیں لیکن حضرت امام ولی اللہ دہلوی اس زمانے میں پیدا ہوئے، جب یہ نظام ٹوٹتا ہوا صاف نظر آ رہا تھا اس لئے انہیں سوچنا پڑا کہ جس زمانے میں سلاطین شکست کھا جائیں، کیا اس زمانے میں قرآنی تعلیم معطل ہو جائے گی؟ اس کا جواب حضرت امام "فتح الرحمٰن" کے حواشی میں دیتے ہیں یعنی یہ کہ سلاطین اور جنگ کے بغیر بھی قرآن کی حکومت کا ایک درجہ پیدا کیا جا سکتا ہے یہ محض اس اجتماعی قوت سے ہو سکتا ہے جو دعوت کے ذریعہ سے تکمیل پاتی ہے[۲]۔"

ایک دوسرے مقام پر مولانا ممدوح فرماتے ہیں :

"قرآن حکیم کا مذکورہ بالا ترجمہ میرے نزدیک ایک ہندوستانی کے لئے تمام تفاسیر سے بہتر ہے اس کے ازبر کر لینے کے بعد دوسری تفاسیر پڑھنی چاہئیں تب کہیں ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے[۳]۔"

---

[۱] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص ۲۱

[۲] امالی حضرت مولانا عبیداللہ سندھی ماخوذ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفۂ معاشیات و عمرانیات ص ۲۳، ۲۴

[۳] امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف ص ۱۰، مولانا عبیداللہ سندھی۔

علم حدیث

دوسری طرف عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ شاہ صاحب نے برصغیر میں اوّلین طور پر ایک مستقل دار الحدیث کی بنیاد رکھی تھی۔ اس مکتب میں وہ طالب علموں کے ساتھ مختلف مسائل پر بحث کرتے اور حنفی و شافعی مسالک کے درمیان اختلاف کو کم کرنے کی کوشش کرتے اس طریقے سے انہوں نے تنگ نظری اور تقلید کے خلاف جہاد کرتے ہوئے میکانکی سوچ کی جگہ تخلیقی سوچ کو ابھارنے کی کوشش کی۔ الانصاف، مصفّٰی اور تفہیمات وغیرہ اس کوشش کی آئینہ دار ہیں۔ "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" میں ایک جگہ اہل حدیث اور اہل الرائے کے درمیان تطابق اور اعتدال کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین یوں کرتے ہیں :

"حقیقت یہ ہے کہ استنباط کے مذکورہ بالا دونوں طریقوں — طریقِ تخریج اور طریقِ تتبع احادیث میں سے ہر طریقہ اپنے لئے ایک مضبوط دینی بنیاد رکھتا ہے۔ اور علمائے محققین ہر زمانہ میں بیک وقت ان دونوں طریقوں کو اختیار کرتے رہے ہیں۔ بعض نے طریقِ تخریج سے زیادہ کام لیا اور الفاظ احادیث کے اتباع کا کم لحاظ کیا اور بعض کا رُجحان اتباعِ روایات کی طرف زیادہ اور طریقِ تخریج کی طرف کم رہا۔ پس یہ مناسب نہیں ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک طریقہ کو بالکلیہ چھوڑ دیا جائے جیسا کہ بدقسمتی سے دونوں جماعتوں کے عام لوگوں کا شیوہ ہے۔ حق خالص یہ ہے کہ ان میں باہم مطابقت پیدا کی جائے اور ایک کے اندر جو نقص ہے، دوسرے کی مدد سے اس کی تلافی کی جائے"[1]

عِقْدُ الْجِیْدِ فِیْ اَحْکَامِ الْاِجْتِہَادِ وَ التَّقْلِیْدِ میں ایک جگہ تقلید کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"تقلید دو قسم کی ہے، واجب اور حرام۔ تقلید واجب جو دلالۃً اتباعِ روایت حدیث سے متعلق ہو تفصیل اس کی یہ ہے کہ کتاب و سنّت سے جاہل از راہ خود تتبع و استنباط نہیں کر سکتا اب اس کا یہ فرض ہوگا کہ کسی فقیہ سے پوچھے کہ رسول اللہ نے اس مسئلہ میں کیا حکم دیا ہے، جب بتا دے تو اس کی اتباع کرے ...... تقلید حرام یہ ہے کہ فقیہ یہ گمان کرے کہ وہ نہایت بلندی پر پہنچ گیا، اب اس سے غلطی ممکن نہیں، اب جب ایسی حدیث صحیح و صریح پہنچے جو اس کے قول کے مخالف بھی ہے تو وہ اس کے قول کو

---

[1] اُردو ترجمہ اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ ص ۹۳، ۹۴، مولانا صدر الدین اصلاحی

نہیں چھوڑتا یا یہ گمان کرتا ہے کہ جب میں نے اس کی تقلید کرلی تو خدا نے مجھے اس کے اقوال کا مکلف بنا دیا۔[۱]

چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہندوستان میں غیر مقلدیت کی ابتدا، آپ کی ذات سے ہوئی اور دوسری طرف شاہ صاحب کی فراہم کردہ معلومات نہ ہوتیں تو غلام ہندوستان میں مشکل ہی سے کوئی حنفی نظر آتا۔[۲]

مکمل نظامِ حیات کا خاکہ

شاہ صاحب کا دوسرا زبردست کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو مرتب شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے آپ کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسفے سے لے کر عبادات کے مسائل تک، نجی زندگی سے لے کر سیاست و معیشت اور تمدن کے ارتقاء کے اصولوں تک، فقہ کے مسائل سے لے کر تصوف کے حقائق تک تمام سے شاہ صاحب نے بحث کی ہے اور ان کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ آپ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ' اور البدور البازغہ میں یہی موضوع زیر بحث ہے۔ ان کتابوں میں حیات و کائنات کے مسائل سے بحث کی ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے فلسفہ کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ نظامِ اخلاق پر آپ نے ایک اجتماعی فلسفہ کی عمارت اٹھائی ہے جس کے لئے ارتفاقات کا عنوان تجویز کیا ہے اور اس سلسلہ میں تدبیر منزل، آداب معاشرت، سیاست مُدُن، عدالت، ضرب محاصل، انتظام ملکی اور تنظیم عسکری وغیرہ کی تفصیلات بیان کی ہیں پھر نظام شریعت، عبادات احکام اور قوانین کو بھی پیش کیا ہے اور ہر ایک کی حکمتیں سمجھائی ہیں یہ وہ کام ہے جس میں آپ اپنے پیش رؤوں سے بھی بازی لے گئے ہیں۔

ازالۃ الخفاء کی فصل ششم میں اجتماعی زندگی کی ضرورت و اہمیت اور خلافت اور اسلامی حکومت کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کی تاریخ کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور ان کے اندر عقائد علوم، اخلاق اور سیاست میں جو جاہلی آمیزش ہوگئی تھی، اس کی نشاندہی کی ہے۔ ایک جگہ اپنے زمانے کی مسلم حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

---

[۱] اردو ترجمہ ساجد الرحمٰن صدیقی ص ۱۲۰، ۱۲۳۔

[۲] تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ، مولانا مناظر احسن گیلانی

"ان لوگوں کی حکومت مجوسیوں کی حکومت کے مانند ہی ہے بس فرق یہ ہے کہ نماز پڑھتے اور کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرتے ہیں۔ ہم اسی تغیر کے دامن میں پیدا ہوتے ہیں معلوم نہیں آگے چل کر خدا تعالیٰ کیا منہ دکھانا چاہتا ہے[۱]"

سیاسی اقتدار کا خلافت سے ملوکیت کی طرف منتقل ہو جانا شاہ صاحب کے نزدیک جملہ نقائص اور خرابیوں کی جڑ تھی چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"پہلے وعظ اور فتویٰ دونوں خلیفہ کی رائے پر موقوف تھے۔ خلیفہ کے بغیر نہ وعظ کہا جا سکتا تھا اور نہ کوئی فتویٰ دینے کا مجاز تھا مگر اس انقلاب کے بعد وعظ اور فتویٰ دونوں اس نگرانی سے آزاد ہو گئے بلکہ بعد میں تو فتویٰ دینے کے لئے جماعت صالحین کے مشورے کی بھی قید نہ رہی[۲]"

شاہ صاحب کے نزدیک مسلم تاریخ کی دوسری بنیادی خرابی یہ تھی کہ ان کے اندر اجتہاد کی روح مُردہ ہو چکی تھی اور تقلید جامد کا بھوت ان کے دماغوں پر مسلط ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ بڑے طنز کے ساتھ لکھتے ہیں کہ:

"ہمارے زمانے کے سادہ لوح اجتہاد سے بالکل برگشتہ ہیں اونٹ کی طرح ناک میں نکیل پڑی ہے اور کچھ نہیں جانتے کہ کدھر جا رہے ہیں۔ ان کا کاروبار ہی دوسرا ہے یہ بے چارے ان امور کی سمجھ بوجھ کے مکلف ہی نہیں ہیں[۳]"

اسلام کے مکمل نظامِ حیات کو پیش کرنے کی ان مساعی پر مولانا مودودیؒ نے شاہ صاحب کو جو خراج تحسین پیش کیا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ابتدائی تین چار صدیوں میں ایسے ائمہ اور علماء بکثرت گزرے ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسلام کے مکمل نظامِ حیات کا تصور رکھتے تھے اور بعد کی صدیوں میں بھی ایسے محققین ملتے ہیں جن کے یہاں یہ تصور موجود ہے لیکن

"ان میں سے کسی نے بھی جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ اسلامی نظام کو بحیثیت

۱؎ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ص ۱۵۷،

۲؎ 〃 〃 〃 ص ۱۳۰،

۳؎ مصفّٰی جلد اوّل ص ۱۱، شاہ ولی اللہؒ

ایک نظام کے مُرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ شرف شاہ ولی اللہؒ ہی کے لئے مقدر ہو چکا تھا کہ اس راہ میں پیش قدمی کریں[۱]"

جدید علم کلام کی بنیاد

شاہ صاحب کا ایک زبردست کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک جدید علم کلام کی بنیاد رکھی ہے جس میں قرآن کے طرز استدلال کو بنیاد بنایا گیا ہے اور اسی طریقے سے استفادہ کیا گیا ہے جو نبوت سے ہم آہنگ ہے۔ اب تک لوگوں نے جس چیز کو فلسفۂ اسلام کا نام دے رکھا تھا وہ دراصل فلسفۂ مسلمین تھا جس پر یونان و روم اور ایران و ہندوستان کی چھاپ تھی۔ اس فلسفہ میں سیدھی سادی دلیلیں ہیں جو دل و دماغ کو مطمئن کر دیتی ہیں، فلسفیانہ موشگافیوں اور لاطائل کلامیات کا ان کے یہاں گزر کم ہوا ہے بس زندگی کے بنیادی مسائل اور معروضی حقائق زیر بحث آئے ہیں۔

شاہ صاحب کے اس علم کلام کی بنیاد اس تصور اور فکر پر ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا دارومدار مذہب پر ہے اسی سے انہیں عروج مل سکتا ہے اور اجتماعی زندگی کے مختلف شعبہ جات میں مسلمانوں کے زوال کا سبب بھی یہی ہے پس کھوئی ہوئی عظمتوں کی بازیافت کی خاطر مذہب کی طرف رجعت ناگزیر ہے لہٰذا آپ نے تمام تر توجہ اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے، اسلام سے غیر اسلامی عناصر خارج کرنے اور اسلام کی اٹھارویں صدی کے برصغیر کے معروضی حالات کے مطابق تشریح کرنے پر مرکوز کر دی[۲]۔ آپ کے اس کارنامے کی داد دیتے ہوئے علامہ مناظر احسن گیلانی رقمطراز ہیں:

> "آپ نے بجائے اوہام و خرافات کے قرآن و حدیث کے کلیات سے خود ایک فلسفہ تیار کیا اور جو لوگ ذہنی تمرین و تشحیذ کے لئے لایعنی خیالات میں وقت ضائع کرتے تھے ان کے لئے شاہ صاحب نے غور و فکر کا ایک بڑا میدان پیش کر دیا[۳]"

علامہ گیلانی کے نزدیک انگریزی حکومت کے بعد ہندوستان میں مذہب اور مذہبی

---

[۱] تجدید و احیائے دین ص ۱۰۹، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

[۲] افکار شاہ ولی اللہ ص ۷۷، قاضی جاوید

[۳] تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ، ص ۲۵۰، علامہ مناظر احسن گیلانی،

امور کے متعلق شک وارتیاب کا جو دور آنے والا تھا، شاہ صاحب کے کاموں کا ایک بڑا حصہ اس سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغہ میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو سوالات آئندہ پیدا ہونے والے ہیں، ان کا جواب پہلے سے تیار کر کے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دُنیا کے مسلمانوں کو سپرد کر رہے ہیں[1] اور امر واقعہ یہ ہے کہ آج مغربی تہذیب کی آفتوں کی وجہ سے جو سوالات مسلمانوں کے ذہنوں میں اُٹھ رہے ہیں ان کا پیشگی جواب دینے کی شاہ صاحب نے بڑی حد تک کوشش کی ہے اور علامہ گیلانی کا یہ ریمارک بڑی حد تک صحیح ہے کہ مغربی الحاد و زندقہ کے زہر کا تریاق شاہ ولی اللہ کا کلام ہے۔

ملک کے ہر طبقہ سے خطاب

شاہ صاحب نے مسلم معاشرے میں پھیلنے والی بدعلیوں اور خرابیوں کو روکنے کی کوشش کی ملک کے ایک ایک طبقے کو پکارا، انہیں ان کا فرض یاد دلایا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری ادا کرنے کی کوشش کی۔ یہ پیغامات آپ کی معروف تصنیف التفہیمات الالٰہیہ کی تفہیم ۶۹ میں درج ہیں ان سے آپ کی برپا کردہ تحریک کے خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں مختلف سماجی طبقات کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "میں ان پیرزادوں سے جو کسی استحقاق کے بغیر باپ دادا کی گدیوں پر بیٹھے ہیں، کہتا ہوں کہ یہ کیا دھڑے بندیاں تم نے کر رکھی ہیں؟ کیوں تم میں سے ہر ایک طریقے پر چل رہا ہے اور کیوں اس طریقے کو سب نے چھوڑ رکھا ہے جسے اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتارا تھا؟ تم میں سے ہر ایک امام بن بیٹھا ہے، اپنی طرف لوگوں کو بُلا رہا ہے اور اپنے آپ کو ہادی و مہدی سمجھتا ہے حالانکہ وہ ضال و مضل ہے۔ ہم ہرگز ان لوگوں سے راضی نہیں جو دُنیا کے فوائد کی خاطر لوگوں سے بیعت لیتے ہیں یا اس لئے علم حاصل کرتے ہیں کہ اغراض دنیوی حاصل کریں یا ان لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتے ہیں اور اپنی خواہشات نفس کی اطاعت ان سے کراتے ہیں یہ سب رہزن ہیں، دجّال ہیں، کذاب ہیں، خود بھی دھوکے میں ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکے دے رہے ہیں۔
>
> میں ان طالبان علم سے کہتا ہوں جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں کہ بے وقوفو! تم

---

[1] تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ، ص ۲۵۱، علامہ مناظر احسن گیلانی،

یونانیوں کے علوم اور صرف و نحو و معانی میں پھنس گئے اور سمجھے کہ علم اس کا نام ہے حالانکہ علم تو کتاب اللہ کی آیت محکمہ ہے یا پھر وہ سُنّت ہے جو رسول سے ثابت ہو ...... تم پچھلے فقہاء کے استحسانات اور تفریعات میں ڈوب گئے۔ کیا تمہیں خبر نہیں کہ حکم صرف وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے فرمایا ہو؟ تم میں سے اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کسی کو نبی کی کوئی حدیث پہنچتی ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میرا عمل تو فلاں کے مذہب پر ہے نہ کہ حدیث پر۔ پھر وہ حیلہ یہ پیش کرتا ہے کہ " صاحب، حدیث کا فہم اور اس کے مطابق فیصلہ تو کاملین و ماہرین کا کام ہے اور یہ حدیث ائمہ سلف سے چھپی تو نہ رہی ہوگی پھر کوئی وجہ تو ہوگی کہ انہوں نے اسے ترک کردیا" جان رکھو یہ ہرگز دین کا طریق نہیں ہے اگر تم اپنے نبی پر ایمان لائے ہو تو اس کی اتباع کرو خواہ کسی مذہب کے موافق ہو یا مخالف۔

میں ان متقشف واعظوں، عابدوں اور خانقاہ نشینوں سے کہتا ہوں کہ اے زہد کے مدعیو! تم ہر وادی میں بھٹک نکلے اور ہر رطب و یابس کو لے بیٹھے۔ تم نے لوگوں کو موضوعات اور اباطیل کی طرف بلایا۔ تم نے خلق خدا پر زندگی کا دائرہ تنگ کردیا حالانکہ تم فراخی کے لئے مامور تھے نہ کہ تنگی کے لئے۔ تم نے مغلوب الحال عشاق کی باتوں کو اپنا مدار الیہ بنالیا ہے حالانکہ یہ چیزیں پھیلانے کی نہیں لپیٹ کر رکھ دینے کی ہیں۔

میں امراء سے کہتا ہوں کہ تمہیں خدا کا خوف نہیں آتا؟ تم فانی لذتوں کی طلب میں مستغرق ہو گئے اور رعیت کو چھوڑ دیا کہ ایک دوسرے کو کھا جاتے۔ علانیہ شرابیں پی جارہی ہیں اور تم نہیں روکتے، زناکاری، شراب خوری اور قمار بازی کے اڈے بر سرعام بن گئے ہیں اور تم ان کا انسداد نہیں کرتے۔ اس عظیم الشان ملک میں تمہارے درانے سے کوئی حد شرعی نہیں لگائی گئی، جس کو تم ضعیف پاتے ہو اسے کھا جاتے ہو اور جسے قوی پاتے ہو اسے چھوڑ دیتے ہو، کھانوں کی لذت، عورتوں کے ناز و انداز، کپڑوں اور مکانوں کی لطافت، بس یہ چیزیں ہیں جن میں تم ڈوب گئے ہو۔ کبھی خدا کا خیال تمہیں نہیں آتا۔

میں ان فوجی آدمیوں سے کہتا ہوں کہ تم کو اللہ نے جہاد کے لئے، اعلائے حق کے لئے، شرک و اہل شرک کا زور توڑنے کے لئے فوجی بنایا تھا اس کو چھوڑ کر تم نے گھوڑسواری

اور ہتھیار بندی کو پیشہ بنالیا۔ اب جہاد کی نیت اور قصد سے تمہارے دل خالی ہیں، پیسہ کمانے کے لئے سپاہی گری کا پیشہ کرتے ہو، بھنگ اور شراب پیتے ہو، داڑھیاں منڈاتے ہو اور مونچھیں بڑھاتے ہو، بندگان خدا پر ظلم ڈھاتے ہو اور تمہیں کبھی اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ حرام کی روٹی کمارہے ہو یا حلال کی، خدا کی قسم تمہیں ایک روز دُنیا سے جانا ہے پھر اللہ تمہیں بتائے گا کہ کیا کرکے آئے ہو؟

میں ان اہل حرفہ اور عوام سے کہتا ہوں کہ تم میں سے امانت و دیانت رُخصت ہوگئی ہے۔ اپنے رب کی عبادت سے تم غافل ہوگئے ہو اور اللہ کے ساتھ تم شرک کرنے لگے ہو، تم غیر اللہ کے لئے قربانیاں کرتے ہو اور مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو یہ تمہارے بدترین افعال ہیں۔ تم میں سے جو کوئی شخص خوش حال ہوجاتا ہے وہ اپنے لباس اور کھانے پر اتنا خرچ کرتا ہے کہ اس کی آمدنی اس کے لئے کافی نہیں اور اہل وعیال کی حق تلفی کرنی پڑتی ہے یا پھر وہ شراب نوشی اور کرایہ کی عورتوں میں اپنی معاش اور معاد دونوں کو ضائع کرتا ہے۔

پھر میں مسلمانوں کی تمام جماعتوں کو عام خطاب کرکے کہتا ہوں کہ اے بنی آدم! تم نے اپنے اخلاق کھو دیئے تم پر تنگ دلی چھاگئی اور شیطان تمہارا محافظ بن گیا۔ عورتیں مردوں پر حاوی ہوگئی ہیں اور مردوں نے عورتوں کو ذلیل بنارکھا ہے۔ حرام میں تمہیں مزہ آتا ہے اور حلال تمہارے لئے بدمزہ بن گیا ہے۔

اے بنی آدم! تم نے ایسی فاسد رسمیں اختیار کرلی ہیں جن سے دین متغیر ہوگیا ہے۔ مثلاً روز عاشوراء کو تم جمع ہوکر باطل حرکات کرتے ہو۔ ایک جماعت نے اس دن کو ماتم کا دن بنارکھا ہے، کیا تم نہیں جانتے کہ سب دن اللہ کے ہیں اور سارے حوادث اللہ کی مشیئت سے ہوتے ہیں؟ اگر حسینؓ اس دن شہید کئے گئے تو اور کون سا دن ہے جس میں کسی محبوب خدا کی موت واقع نہ ہوئی ہو؟ کچھ لوگوں نے اس دن کو کھیل تماشے کا دن بنارکھا ہے پھر تم شب برأت میں جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو اور تم میں ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اس روز مُردوں کو کثرت سے کھانا بھیجنا چاہئے اگر تم سچے ہو تو اپنے اس خیال اور حرکات کے لئے کوئی دلیل لاؤ، پھر تم نے ایسی رسمیں بنارکھی ہیں جن سے تمہاری زندگی تنگ ہورہی ہے مثلاً شادیوں میں فضول خرچی، طلاق کو ممنوع بنالینا،

بیوہ عورت کو بٹھائے رکھنا، اس قسم کی رسموں میں تم اپنے مال اور اپنی زندگیوں کو خراب کر رہے ہو اور ہدایات صالحہ کو تم نے چھوڑ دیا ہے حالانکہ بہتر یہ تھا کہ تم ان رسموں کو چھوڑ کر اس طریق پر چلتے جس میں سہولت تھی نہ کہ تنگی، پھر تم نے موت اور غمی کو عید بنا رکھا ہے گویا تم پر کسی نے فرض کر دیا ہے کہ جب کوئی مرے تو اس کے اقربا خوب کھانے کھلائیں۔ تم نمازوں سے غافل ہو۔ کوئی اپنے کاروبار میں اتنا مشغول ہوتا ہے کہ نماز کے لئے وقت نہیں پاتا اور کوئی اپنی تفریحوں اور خوش گپیوں میں اتنا منہمک ہوتا ہے کہ نماز فراموش ہو جاتی ہے۔ تم زکوٰۃ سے غافل ہو، تم میں کوئی مالدار ایسا نہیں جس کے ساتھ بہت سے کھانے والے نہ لگے ہوئے ہوں وہ ان کو کھلاتا اور پہناتا ہے مگر زکوٰۃ اور عبادت کی نیت نہیں کرتا۔ تم رمضان کے روزے بھی ضائع کرتے ہو اور اس کے لئے طرح طرح کے بہانے بناتے ہو۔ تم لوگ سخت بے تدبیر ہو گئے ہو، تم نے اپنی بسر اوقات کا انحصار سلاطین کے وظائف و مناصب پر کر رکھا ہے اور جب تمہارا بار سنبھالنے کے لئے سلاطین کے خزانے کافی نہیں ہوتے تو وہ رعیت کو تنگ کرنے لگتے ہیں[1]"

غرضیکہ شاہ صاحب نے مسلم معاشرے کے تمام طبقوں پر تنقید کی، ان کے ماضی، حال اور مستقبل کا تفصیلی جائزہ لیا، جامعیت کے ساتھ ان کی حالت زار کا مطالعہ کیا اور جو برائیاں ان میں پرورش پا رہی تھیں ان کے خلاف عوامی تحریک چلائی اور ان کے انسداد کے لئے دوڑ دھوپ کی۔

سیاسی اصلاح کی کوشش

شاہ صاحب نے سیاسی انقلاب کے لئے جو طریقہ کار اختیار کیا اسے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس دور کے سیاسی حالات بھی سامنے ہوں اس لئے اجمالی طور پر اس دور کی سیاست پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر کا دور حکومت مسلمانوں میں ملی اور قومی احساس کو بیدار کرنے میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس دور میں اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی شعائر کو فروغ پانے کا کافی موقعہ ملا۔ جو معاشرہ اس وقت پروان چڑھا اس کے عناصر ترکیبی میں بہترین اسلامی روایات شامل تھیں لیکن جوں ہی اورنگ زیب کی وفات ہوئی سلطنت مغلیہ کا شیرازہ

---

[1] التفہیمات الالہیہ جلد دوم ص ۱۳۴، ۱۳۵۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔

بکھر گیا اور ملتِ اسلامیہ سیاسی و مذہبی اور معاشی و ذہنی پستی میں مبتلا ہوگئی۔

اکثر مغل شہزادے دن رات زنانہ خلوت میں نظر بند رہتے اور طوائفوں اور ذلیل مصاحبوں کے ساتھ دادِ عیش دیتے رہتے تھے۔ محمد شاہ جس کو ایک طویل زمانہ تک حکومت کرنے کا موقعہ ملا اس نے حکومت و سیاست کے معاملات سلجھانے کے بجائے آرٹ اور کلچر کے فروغ پر اپنی ساری توانائیاں صرف کیں۔ حکومت کا نظام درہم برہم تھا۔ امن و امان پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ دور دراز کے صوبوں کے والی باغیانہ حرکت کے مرتکب ہو رہے تھے۔ بنگال اودھ اور دکن کے گورنر مرکزی حکومت کو خاطر میں نہ لاتے تھے مرہٹہ راجپوت اور سکھ ہر جگہ سر اٹھا رہے تھے لیکن ادھر بادشاہ سلامت عیش و عشرت میں بدمست تین تین سو کسبیاں ننگی نچوا رہے ہیں تاکہ کلچر کو فروغ حاصل ہو۔ فضول خرچی کا یہ عالم کہ شاہی باورچی خانے کا خرچ تین کروڑ روپے سے کم نہ تھا۔[1]

ان بداعمالیوں عیاشیوں اور نااہلیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کا وقار ختم ہوگیا۔ ملک کی مالی و فوجی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ اور پھر ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے لوٹ مار نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ مرہٹوں کا اقتدار بڑھا مہار اول کر اور رگھوناتھ راؤ نے مل کر دہلی پر حملہ کر دیا اور ۱۷۵۸ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا اور ہندوستان پر ہندو تہذیب و تمدن کو مسلط کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔

ان حالات میں شاہ صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی ہی اس ملک کی قسمت کو بچا سکتے ہیں چنانچہ آپ نے ان دونوں کو ایک جگہ جمع کر کے مفسدوں کے خلاف انہیں صف آرا کیا۔ نجیب الدولہ کو تیار کیا کہ ہمت و جرأت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرے۔ ایک خط میں اسے لکھا کہ:

"خدائے عزوجل امیر المجاہدین کو نصرتِ ظاہر اور تائیدِ واضح کے ساتھ مشرف کرے اور اس عمل کو قبولیت کے درجے میں پہنچا کر بڑی بڑی برکتیں اور رحمتیں اس پر مرتب کرے۔ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت مشام کے واضح ہو کہ نصرتِ مسلمین کے لئے یہاں دعا کی جا رہی ہے اور سروش غیبی سے آثار قبول محسوس ہوتے ہیں اُمید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ پر طریقہ "جدّوجہد" کو زندہ کر کے اس کے برکات اس

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، خورشید مصطفیٰ رضوی۔

دنیا میں اور آخرت میں عطا فرمائے گا اِنَّہٗ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ۔[۱]

ایک دوسرے خط میں لکھا:

"خدائے عزوجل آں امیر الغزاۃ، رئیس المجاہدین کو محفوظ اور بنظر عنایت ملحوظ رکھے۔ بعد سلام کے واضح ہو کہ خط مبارک پہنچا۔ ذات گرامی کی صحت و سلامتی معلوم کر کے شکر الٰہی بجالایا گیا۔ پردہ غیب میں مرہٹہ اور جٹ کا استیصال مقرر ہو گیا ہے، بس وقت پر موقوف ہے جونہی کہ اللہ کے بندے کمر ہمت باندھیں گے، طلسم باطل ٹوٹ جائے گا۔

ایک بات اور کہنی ہے وہ یہ کہ جب افواج شاہیہ کا گزر دہلی میں واقع ہو تو اس وقت اہتمام کلی کرنا چاہیئے کہ دہلی سابق کی طرح ظلم سے پامال نہ ہو جائے۔ دہلی والے کئی مرتبہ اپنے مالوں کی لوٹ اور اپنی عزت کی توہین اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں اس وجہ سے کارہائے مطلوبہ کے حصول میں تاخیر ہو رہی ہے۔ آخر مظلوموں کی آہ بھی تو اثر رکھتی ہے اگر اس بار آپ چاہتے ہیں کہ کار بستہ جاری ہو جائے تو پوری پوری تاکید کرنی چاہیئے کہ کوئی فوجی دہلی کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے جو ذمی کی حیثیت رکھتے ہیں ہرگز تعارض نہ کرے۔"[۲]

دوسری طرف شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ ہندوستان آکر مرہٹوں کے تسلط سے خلاصی دلائے۔ چنانچہ اسے ایک طویل خط لکھا جس میں ہندوستان کے حالات، مسلمانوں کی زبوں حالی، شعائر اسلام کی بے حرمتی، مرہٹوں اور جاٹوں کا اقتدار اور ان کے مظالم کا تفصیل سے نقشہ کھینچا اور بادشاہ کی جناب میں درخواست کی کہ:

...... حاصل کلام یہ ہے کہ ملک ہندوستان میں غیر مسلموں کے غلبہ کی نوعیت یہ ہے جو معرض بیان میں آئی اور مسلمانوں کا ضعف اس حد تک پہنچ گیا ہے جو لکھا گیا۔ اس زمانے میں ایسا بادشاہ جو صاحب اقتدار و شوکت ہو اور لشکر مخالفین کو شکست دے سکتا ہو، دور اندیش اور جنگ آزما ہو، سوائے آنجناب کے اور کوئی موجود نہیں ہے یقینی طور پر جناب عالی پر فرض عین ہے ہندوستان کا قصد کرنا اور

۱۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات، مکتوب نمبر سوئم ص ۱۱۵، خلیق احمد نظامی

۲۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات، مکتوب پنجم ص ۱۱۷،

مرہٹوں کا تسلط توڑنا اور ضعفائے مسلمین کو غیر مسلموں کے پنجے سے آزاد کرانا، اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کردیں گے اور تھوڑا زمانہ نہ گزرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ ہوسکے گی یہ بھی ایک بلائے عظیم ہے اس بلائے عظیم کے دفع کرنے کی قدرت بہ فضل خداوندی جناب کے علاوہ کسی کو میسر نہیں ہے[1]"

چنانچہ احمد شاہ ابدالی یکم نومبر ۱۷۶۰ء کو پانی پت کے میدان میں پہنچا اور یہاں ڈھائی مہینے تک افغانوں اور مرہٹوں کی مسلسل جنگ جاری رہی بالآخر ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی" اور بقول ایک مؤرخ کے " مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی" سر جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ مہاراشٹر میں کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا جس میں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ لیڈروں کی ایک پوری نسل ایک ہی معرکہ میں غائب ہوگئی۔

اگر سلطنت مغلیہ میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی اور کسی مسلم حکمراں میں سیاسی بصیرت اور ملک و قوم اور اسلامی تہذیب و تمدن کے تحفظ کا احساس ہوتا تو حالات کو سدھارنے کا نہایت نادر موقعہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنگ پانی پت کا اصل فائدہ انگریزوں نے اٹھایا جو تجارت کی غرض سے یہاں آتے تھے اور مغل حکمرانوں کی اجازت سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تجارتی کمپنیاں قائم کررہے تھے۔

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات، مکتوب دوئم ص ۱۰۵

پانچواں باب

تحریکاتِ اسلامی

① تحریک مہدویت

② فرائضی تحریک

③ تحریک مجاہدین

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر نکلے اُدھر ڈوبے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

(اقبالؒ)

تحریک مہدویت

اس تحریک کے بانی سید محمد جونپوری ۸۴۷ھ مطابق ۱۴۴۳ء میں جونپور میں پیدا ہوئے وہ دل و دماغ کی بڑی خوبیوں کے مالک تھے اسی لئے معاصرین نے ان کو اسد العلماء کا خطاب دیا ہے۔ درس و تدریس میں خاص مہارت تھی ان کے حلقۂ درس میں شاہ و گدا سب ہی شریک ہوتے تھے۔ فقط عالم دین ہی نہ تھے، پہلو میں ایک حساس دل اور منہ میں پُرتاثیر زبان رکھتے تھے۔ داناپور کا حاکم سلطان حسین ان کا مرید تھا لیکن وہ ایک ہندو راجہ دلیپ رائے کو خراج بھی دیتا تھا۔ شیخ کو یہ سخت ناگوار تھا۔ انہوں نے ایک مجلس میں سلطان حسین کے اس فعل پر بڑی طرح لعن طعن کیا اور سلطان کو مخاطب کر کے کہا:

"بدبخت آج پردۂ دنیا پر تجھ سے زیادہ بدبخت شخص نہیں ہوگا۔ نہیں، نہیں، مجھے ڈر ہے کہ روز قیامت تیرا حشر ان لوگوں میں ہوگا جن کا ٹھکانا دوزخ ہے تیری ذات سے اسلام ذلیل ہو رہا ہے اور تو بت پرستی کی اشاعت کا باعث ہے تیری وجہ سے باطل حق پر غالب آ رہا ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے گفتگو کا رخ جہاد کی طرف پھیرا اور بڑے پرتاثیر طریقے سے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا:

"اے عیش پرست کاہلو! اے مست نفس مسلمانو! اُٹھو اور کمر ہمت باندھو۔ آؤ ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کریں اور ملکِ خدا کو کفر و شرک کی ظلمت سے پاک کر دیں۔ نور توحید کو پھیلائیں.... اے موحدین اور اے مجاہدین! آؤ اور میرے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاؤ میں آج کافر دلیپ رائے کے خلاف اعلان جہاد کرتا ہوں!"

سید کی تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا، سلطان حسین تیس ہزار کا لشکر لے کر دلیپ رائے کے پایۂ تخت کی طرف بڑھا۔ سید بھی ایک ہزار پانچ سو فقراء کے ساتھ ان کے جھنڈے کے نیچے مرنے مارنے

کو تیار تھے، ان کے ساتھ تھے۔ دلیپ رائے کے پاس کئی گنا فوج تھی چنانچہ سلطان حسین کو شکست ہونے لگی اور اس کے دل پر ہراس غالب آرہا تھا کہ سید اور ان کے ہمراہیوں نے لڑائی کا پانسہ پلٹ دیا۔ سید نے خود آگے بڑھ کر دلیپ رائے کو تہ تیغ کیا اور شکست کو فتح میں بدل دیا[۱]۔

چالیس سال کی عمر میں سنہ ۹۰۱ھ میں سید صاحب معتقدین کی ایک مختصر جماعت لے کر حجاز چلے گئے وہیں انہوں نے ۱۴۹۵ء میں مہدی ہونے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد وہ گجرات کی طرف متوجہ ہوگئے اور احمد آباد میں مہدوی تحریک کا مرکز قائم کیا۔ سنہ ۹۱۱ھ میں آپ کا انتقال ہوا[۲]۔

سلیم شاہ سوری کے عہد میں شیخ علائی، شیخ عبداللہ نیازی وغیرہ نے اس تحریک کی نشر و اشاعت میں بڑا کام کیا۔ شیخ علائی بنگال کے مشہور عالم تھے۔ حج سے واپسی کے بعد بیانہ میں سکونت پذیر ہوتے اور یہیں شیخ عبداللہ نیازی کے زیر اثر مہدوی طریقہ اختیار کیا۔ شیخ علائی کی زبان میں خدا نے بڑی تاثیر دی تھی ان کی وجہ سے ان کے دوست اور مرید مہدویت کی طرف رجوع ہوگئے اور بالآخر ہزاروں لوگوں نے یہ عقائد اختیار کر لئے۔ اکبر کے عہد میں گجرات مہدیوں کا مرکز تھا اور وہاں میاں محمد مصطفیٰ کی مسند ارشاد بچھی ہوتی تھی[۳]۔ اصلاً یہ تحریک احیائے دین ہی کے لئے اٹھی تھی اور احیائے سنت اور اماتت بدعت اس کا مقصود تھا لیکن یہ اپنی اصلیت برقرار نہ رکھ سکی اور مہدویت کا اعلان کر دیا گیا۔ اس تحریک کے سلسلے میں جو تھوڑا بہت مواد ملتا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں غلو اور انتہا پسندی اور تشدد خاصی حد تک موجود تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس تحریک کے متعلق لکھتے ہیں:

> "میرا خیال ہے کہ اس تحریک کی بنیاد صداقت و حق پرستی پر پڑی تھی یعنی دعوت و تبلیغ حق و احیائے شریعت و قیام فرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس کا مقصد اصلی تھا اور خود سید محمد اور ان کے پیروؤں کی پہلی جماعت کے اکثر بزرگ بڑے ہی پاک نفس اور خدا پرست لوگ تھے[۴]۔"

۱۔ ملاحظہ ہو رود کوثر ص ۱۴، ۱۵، شیخ محمد اکرام

۲۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۸ ص ۸۳۸، ۸۳۹ (انگریزی)

۳۔ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۶۹ تا ۲۷۱، خلیق احمد نظامی

۴۔ تذکرہ ص ۴۷ ابوالکلام آزاد، مرتبہ مالک رام،

اس تحریک کے ایک کارکن گلاب بن عبد اللہؒ "تاریخ پالن پور" میں لکھتے ہیں کہ تحریک مہدویت کے اصول ومبادی اہل سنت سے مختلف نہیں ہیں۔ انہوں نے تین اصول گنائے ہیں:

۱۔ حسن نیت کے ساتھ توبہ، ۲۔ اللہ سے قریب کرنے والا عمل صالح، ۳۔ ذکر دائمی

ان کے مطابق جو شخص اس تحریک میں شامل ہونا چاہے اس کے اوپر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں:

(۱) دنیا اور اس کی آلائشوں سے بے تعلق ہو جائے۔

(۲) مخلوق سے گوشہ نشین ہو جائے۔

(۳) وطن سے ہجرت کر جائے۔

(۴) خدا پرست لوگوں کی صحبت اختیار کرے۔

(۵) دائمی ذکر میں مشغول رہے[۱]

پاکستان کے ایک صاحب طرز ادیب اس تحریک کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ملا عبد اللہ سلطانپوری کے زمانۂ اقتدار میں سید محمد جونپوری کا تو انتقال ہو چکا تھا ان کے خلفاء اور مرید ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تھے یہ لوگ کتاب وسنت کے متبع اور خادم اظہار حق میں بے باک، زاہد ومتورع، صبر ورضا کے پیکر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں تیغ برہنہ تھے اور اس باب میں اس ارشاد رسولؐ کے قائل کہ جو کوئی امر منکر کو دیکھے تو اسے چاہیئے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے مٹا دے اور اگر ہاتھ سے مٹانے کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اس کے خلاف جہاد کرے۔ منکر کو محض دل میں برا سمجھنے کو وہ ایمان کی کمزوری سمجھتے تھے۔ شیخ عبد اللہ نیازی اور شیخ علائی اس تحریک کے نمایاں افراد میں سے تھے۔ یہ حضرات جہاں جاتے، دنیا ان کی طرف کھنچی چلی آتی، عوام اور خواص میں سے جس تک ان کی دعوت پہنچتی، متاثر ہو جاتا اور ان کے حلقے میں شامل ہو جاتا۔"[۲]

اصل معاملہ یہ ہے کہ سید محمدؒ نے دیکھا کہ ہر طرف بد امنی اور طوائف الملوکی برپا ہے سادیت اور خدا بیزاری کی وبا ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ علمائے سو نے دین کی بے حرمتی پر کمر باندھ رکھی ہے، صوفیا طریقت وشریعت کی تفریق میں اپنے لئے راہ جواز ڈھونڈھ رہے ہیں۔ بادشاہتیں بنتی اور بگڑتی رہتی

---

[۱] الثقافة الاسلامية في الهند ص ۲۲۳، ۲۲۴، مولانا سید عبد الحی لکھنویؒ

[۲] حضرت مجددؒ کے سیاسی مکتوبات ص ۱۹۰، آباد شاہ پوری

ہیں، امراء و اعیان سلطنت اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہیں اور دُنیا طلبی اور جاہ و حرص کی گرم بازاری ہے۔ یہ حال دیکھ کر سید موصوف نے

"احیائے شریعت اور قیام امر بالمعروف کا غلغلہ بند کیا اور لوگوں سے کہا کہ اب نہ کسی مجاہدے کی ضرورت ہے اور نہ ذکر و شغل کی۔ سب سے بڑا مجاہدہ یہی ہے کہ خلق اللہ کو سیدھی راہ پر لگاؤ اور احکام شرعیہ کے قیام کی راہ میں اپنی جانیں تک لڑا دو۔ عشق کی صداقت اور قلب کی پاکی نے ان کی دعوت و تذکیر میں ایسی تاثیر بخش دی تھی کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہزاروں آدمی حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے اور متعدد سلاطین وقت نے ان سے بیعت کی۔ ان لوگوں کے طور طریق کچھ عجیب عاشقانہ و والہانہ تھے اور ایسے تھے کہ صحابۂ کرام کے خصائص ایمانی کی یاد تازہ کرتے تھے۔ عشقِ الہٰی کی ایک جاں سپار جماعت تھی جس نے اپنے خون کے رشتوں اور وطن و زمین کی فانی الفتوں کو ایمان و محبت کے رشتہ پر قربان کر دیا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہ حق میں ایک دوسرے کے رفیق و غمگسار بن گئے تھے"[1]

یہی وجہ ہے کہ اکثر اہل اللہ اور علمائے حق اس تحریک کی بابت حسن ظن رکھتے تھے۔ چنانچہ شیخ وجیہ الدین گجراتی" جو اس وقت کے بہت بڑے عالم تھے اور جن کی سوانح حیات اخبار الاخیار اور مآثر الکرام وغیرہ میں موجود ہے، ان کے سامنے جب سید موصوف اور اُن کے بعض اتباع کی تکفیر کا فتویٰ پیش کیا گیا تو دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ جو جماعت دُنیا کو چھوڑ کر وقفِ حق پرستی ہے میرا قلم اس کی مخالفت میں نہیں اُٹھ سکتا۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا قول شاہ عبدالعزیز نے ایک مکتوب میں نقل کیا ہے کہ سید محمد عالم حق اور واصل باللہ تھے۔ بعض خواطر و واردات ان پر ایسے گزرے کہ ان کے درک و فہم میں عاجز رہ گئے اور خود اپنے مقام کی نسبت دھوکے میں پڑ گئے۔

اس تحریک کے مایۂ ناز کارکن شیخ عبداللہ نیازی (جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) کے بارے میں آتا ہے کہ جب نماز کا وقت ہوتا تو لکڑہاروں اور سقوں کو جمع کرتے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے۔ کسی پیشہ ور کو دیکھتے کہ عذرِ معاش سے نماز میں شریک نہیں ہوتا تو

---

[1] تذکرہ ابوالکلام آزاد، مرتب مالک رام ص ۴۸

اپنی کمائی اس کو دے دیتے اور منت وزاری سے کہتے کہ بھائی جماعت میں شریک ہو کر نماز پڑھ لو۔

اس تحریک کی انتہا پسندی اور تشدد آمیزی کے باوجود انہی صفات حسنہ کی بنا پر مولانا ابوالکلام آزاد کو یہ کہنا پڑا کہ:

"جو حالات ناظر فدا اور معتمد مؤرخوں نے لکھے ہیں، اگر وہ سچ ہیں، تو یہ لوگ انسان نہیں تھے، ملأ اعلیٰ کے مقدس فرشتے تھے، جن کو خدا نے اپنی زمین کی طہارت کے لئے آدمیوں کے ہیکل میں بھیج دیا تھا۔"[1]

---

[1] تذکرہ ابوالکلام آزاد، مرتب مالک رام، ص ۶۲ - نیز دیکھئے مسلم ثقافت ہندوستان میں، عبدالمجید سالک، ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان ص ۲۵۷،

فرائضی تحریک

انگریزوں کے خلاف جدّوجہد میں حیدر علی اور سلطان ٹیپو شہید ہو گئے اور انگریزوں نے اپنے ایک بیدار مغز، حوصلہ مند اور نڈر دشمن سے نجات حاصل کر لی اور سلطان ٹیپو کی فوجیں کوئی مقصد اور نصب العین نہ رکھنے کی وجہ سے تتر بتر ہو گئیں تو مسلم مفکرین اور مصلحین نے عوامی تحریک چلانے کی کوشش کی تاکہ مسلم تہذیب و تمدّن کا احیاء ہو سکے، عقائد میں اصلاح ہو سکے اور انگریزوں سے آزادی حاصل کی جا سکے۔

اس قسم کی سب سے پہلی تحریک سلطان ٹیپو کی شہادت کے ٹھیک تین سال بعد بنگال کی سرزمین پر مولانا شریعت اللہ بنگالی (۱۷۸۱ء — ۱۸۴۰ء) نے شروع کی۔ ان کی تحریک فرائضی تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ اس تحریک نے ایک طرف عقائد میں اصلاح کی کوشش کی، پیر و مرشد کی قدیم اصطلاح ترک کر کے شاگرد اور استاذ کا لفظ استعمال کیا[۱] سنّت کے اتباع و احیاء، اور معتقدین میں پاکی و طہارت اور دینداری پیدا کرنے پر زور دیا۔ گناہوں اور معاصی سے اجتناب کرنے اور ان سے توبہ کرنے کی تلقین کی۔ توحید کو اختیار کرنے پر اپنی تمام طاقت صرف کر دی، شرک و کفر کی نجاستوں سے عوام کو الگ کیا۔ بدعات و خرافات، فاتحہ خوانی، پیری مریدی وغیرہ تمام غیر اسلامی رسوم اور طریقوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ فرائض پر سختی سے عمل کرنے اور انہیں اپنی عملی زندگی میں برتنے کی جدّوجہد کی گئی[۲] فقیروں اور سادھو سنتوں کی پرستش، عُرس کا انعقاد، محرّم کے تہوار میں شمولیت کو غیر اسلامی قرار دیا گیا، چھٹی، چلّہ اور بچوں کی پیدائش پر رائج دوسرے تمام رواجوں کو ختم کر کے عقیقہ کو اہمیت دی گئی۔ حاجی شریعت اللہ نے کھل کر کہا کہ ہمارے رسوم و رواج اور مذہبی تقریبات کو اسلام سے ہم آہنگ

۱؎ نزہتہ الخواطر جلد ۷ ص ۲۰۹، مولانا عبدالحیؒ لکھنوی،

۲؎ اسلام ان بنگال (انگریزی) ص ۵۳، جگدیش نرائن سرکار،

ہونا چاہیئے۔ یہ لوگ خدا کے احکام کی تعمیل اور اخلاقیات میں عام مسلمانوں سے حد درجہ ممتاز اور منفرد تھے [1]

فرائضی تحریک نے ذات پات، چھوت چھات اور طبقاتی امتیازات کے خلاف اعلان جہاد کیا اور اسے رُوح قرآن کے منافی قرار دیا۔ چنانچہ اس تحریک کے تمام ممبران کے درمیان مکمل مساوات اور اخوت تھی یہی وجہ ہے کہ کسانوں، انصاریوں، تیلیوں اور دوسرے پچھڑے ہوئے طبقات میں یہ تحریک تیزی سے پھیلی۔

دوسری طرف آپ نے بنگال میں انگریزوں کی حکومت کے خلاف جذبہ جہاد پیدا کیا۔ انگریزوں کی عملداری کی وجہ سے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا اور حکم دیا کہ اس سرزمین پر مسلمانوں پر نماز عیدین اور جمعہ اس وقت تک درست نہیں ہوگی جب تک وہ اس کو دارالاسلام میں عملاً تبدیل نہ کرلیں۔ یہ تحریک کسانوں اور مزدوروں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور عوام قائد تحریک کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے [2] لیکن انہوں نے عملاً جہاد نہ کیا البتہ ان کے بیٹے حافظ محمد محسن (۱۸۶۲ء — ۱۸۱۹ء) جو عام طور سے دُودُو میاں کے نام سے مشہور ہیں، نے اس کسر کو بھی پورا کردیا اور منظم طور سے اس تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

دُودُو میاں نے "الارض للہ" کا نعرہ لگایا اور اعلان کردیا کہ زمین خدا کی ملکیت ہے اور کسی کو حق نہیں کہ بطور وراثت اس پر قابض ہو۔ جو لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں وہی اس کے مالک ہیں۔ حکومت اپنے واجبات ان سے لے سکتی ہے۔ نام نہاد مالکانِ اراضی ان سے کوئی لگان وصول کرنے کے حقدار نہیں۔ اس اعلان پر بڑے بڑے زمیندار دُودُو میاں کے جانی دُشمن ہوگئے [3]

یہ تحریک عوام میں اس قدر مقبول ہوئی کہ جب اس نے انگریزی عدالتوں کے بائیکاٹ کی تحریک چلائی تو ایک وقت ایسا بھی آیا جب ان عدالتوں میں بہت کم مقدمات آتے تھے اور اس کے برخلاف متوازی عدالتیں بھی قائم کی گئیں لیکن یہ تحریک ہندو اور انگریز دو عظیم طاقتوں اور زمینداروں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے چند سالوں ہی میں ختم ہوگئی۔ دُودُو میاں

---

[1] Islam in Bengal by J. N. Sarkar, P.54 [2] DO. P. 52

[3] سرگزشت مجاہدین ص ۲۱۵، غلام رسول مہر،

۱۸۶۲ء میں انتقال کر گئے اور اس تحریک کی وہ تاثیر اور مذہبی و سماجی مقبولیت رفتہ رفتہ ماند پڑ گئی۔[1]

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام نے فرائضی تحریک کے اثرات کا جائزہ اس طرح لیا ہے:

"وہ (حاجی شریعت اللہ) مشرقی بنگال کے تاریک ترین حالات میں اُبھرے اور ان تمام توہمات اور بدعقیدگیوں کے خلاف آواز اُٹھائی جو عرصہ دراز سے ہندوؤں کے میل جول سے ان کے مشرکانہ رسوم سے متاثر ہو کر پیدا ہو گئی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ بنگال کے سرد مہر اور غافل مسلمان اس تحریک کی بدولت ایک بار پھر عزم و جوش کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان اثرات کا محرک وہی شخص ہو سکتا تھا جو مخلص اور ہمدرد خلائق ہوتا اور یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ حاجی شریعت اللہ سے زیادہ بنگال میں عوام سے ہمدردی اور محبت کا داعی اور کوئی پیدا نہیں ہوا، جن کی بے داغ اور مثالی زندگی کی ان کے ہمعصر دیہاتی مسلمان تعریف کرتے ہیں۔ انہوں نے آفتوں اور مصیبتوں کے وقت حاجی صاحب کو باپ کے درجہ پر رکھا اور حاجی صاحب نے انہیں ہر مصیبت کے وقت دلاسا دیا۔"[2]

۱۸۷۱ء میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی شائع ہونے والی کتاب THE INDIAN MUSSALMANS کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں کی طرف سے بے اطمینانی اور بغاوت کے اندیشے انگریز افسران کے دلوں میں موجود تھے اور مسلمان انگریزوں سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے نہ کسی حکومتی پروگرام یا مشغلے میں دلچسپی لیتے تھے۔[3]

اس تحریک نے اپنے مقصد کے لئے بے شمار قربانیاں دیں۔ مختلف مقامات پر ہزاروں آدمیوں کو قید کیا گیا۔ حکومت نے جھوٹے مقدمے بنا بنا کر مختلف طریقوں سے ان کو پریشان کیا اور بالآخر اسے دبا کر ہی چھوڑا۔

---

[1] تفصیل کے لئے کرامت علی جونپوری کی کتاب نسیم الحرمین دیکھئے۔

[2] THE Encyclopedia of Islam New Edition Vol. II, Page. 783,784 by Lewis, C. H. Pettal and J. Schacht.

[3] The Political Thought of Sir Sayyed Ahmad Khan By H. K. Sherwani, Islamic culture July 1944. P. 237

۱۸۳۱ء میں اس تحریک کے دو لیڈروں کو قید با مشقت کی سزا دی گئی اور ہر ایک پر دو سو روپئے کا جرمانہ عائد کیا گیا۔ کچھ دوسرے کارکنوں کو ستر، ستر روپے کے جرمانے میں پھانسا گیا۔ خود حاجی شریعت اللہ جلال پور مجسٹریٹ کے حکم پر گرفتار کئے گئے لیکن جب کوئی جرم ثابت نہ ہو سکا تو ۲۰۰/= کی ضمانت پر چھوڑ دیئے گئے[۱]

ہندو زمینداروں نے اس تحریک سے متاثر ہونے والوں کو عجیب عجیب سزائیں دیں انہیں ہر ممکن طریقے سے اس تنظیم میں شامل ہونے سے روکتے۔ ان کی داڑھیاں ایک ساتھ باندھ دی جاتیں اور، انہیں سرخ مرچ پسی ہوئی تمباکو کے طور پر استعمال کرنے پر مجبور کیا جاتا[۲]

دودو میاں پر ۱۸۳۸ء میں کئی گھروں کو لوٹنے کا الزام لگایا گیا۔ ۱۸۴۱ء میں ایک قتل کے کیس میں انہیں عدالت میں حاضری دینی پڑی۔ ۱۸۴۴ء میں غیر قانونی اجتماع کے جرم میں مقدمہ میں پھانسے گئے۔ پھر ۱۸۴۶ء میں اغوا، اور قتل کے مقدمہ میں دوبارہ دھر لئے گئے۔ اس طرح انہیں بارہا پریشان کیا گیا۔ اسی سال ۵ ردسمبر کو ایک بار پھر دودو میاں اور ان کے باسٹھ ساتھیوں پر مقدمہ چلایا گیا لیکن صدر عدالت کی اپیل پر باعزت رہا کئے گئے[۳]

ان سازشوں اور گرفتاریوں کے باوجود مقبولیت بڑھتی ہی گئی[۴] یہاں تک کہ ڈامپیر (DAMPIER) نے ان کے متبعین کی تعداد اسّی ہزار بتائی ہے۔ لیکن ہندو زمینداروں اور انگریزی حکومت کی ملی جُلی سازش بالآخر اس تحریک کو دبا دیتی ہے اور دودو میاں کے بعد یہ تحریک بظاہر ناکام ہو جاتی ہے۔

جن دنوں مشرقی بنگال میں حاجی شریعت اللہ یہ اصلاحی وجہادی تحریک چلاتے ہیں، تقریباً انہی دنوں مغربی بنگال میں بھی ایک تحریک اسی نہج پر اُٹھتی ہے اور نثار علی معروف بہ ٹیٹو میر اس کی قیادت کرتے نظر آتے ہیں۔

---

۱ ، ۲ ، ۳

British Policy and Muslims in Bengal 1757 - 1856
By Azizur Rahman Mallick, Bangla Academy , , Dacca . P.P. 91-96

۴

Muslim Community in Bengal 1884-1912, Sufia Ahmad, Oxford University Press Bangladesh 1974. P. 165

ٹیٹو میر ۱۸۲۷ء میں جب حج کر کے لوٹتے ہیں تو مغربی بنگال میں اصلاح و جہاد کا بیڑہ اٹھاتے ہیں اور سید احمد شہید کے طرز پر ہندوؤں اور انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں ۔۔۔،

بنگال ہی وہ سرزمین تھی جہاں انگریزوں نے مسلم امراء کی سازش سے اپنے قدم جمائے تھے اور رفتہ رفتہ اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لئے انگریز مختلف انتظامی تدابیر سے مسلمانوں کی پوزیشن کو کمزور کرتے چلے گئے اور مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کر کے ان کو سیاسی اور معاشی حیثیت سے مضبوط اور طاقتور کر دیا۔

انگریزوں کی پشت پناہی کی وجہ سے ہندو زمین داروں کے مظالم مسلمان کاشتکاروں پر بے انتہا بڑھ گئے۔ ان کی زندگی دوبھر ہو گئی اور انہیں تنگ آمد بجنگ آمد کا مصداق بنا دیا گیا۔ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کی گئی۔ تاراگونیا کا رام نرائن، ناگر پور کا گور پرساد چودھری اور پوروا کا کشن دیپ رائے اور دوسرے ہندو زمین دار مسلمان کاشتکاروں کو مختلف طریقوں سے تنگ کرنے لگے۔ ۷ راگست ۱۸۳۰ء کو برست کے معاون مجسٹریٹ کے پاس مقدمہ آیا جس میں شکایت کی گئی تھی کہ ہندو زمین داروں نے ۲۵ روپے کا فائن لگایا ہے اور اس کی داڑھی کاٹنے کا حکم دیا ہے[۱]

کشن رائے پوروا ہر مسلمان کاشت کار سے داڑھی ٹیکس ڈھائی روپیہ وصول کرتا تھا اور ان کو مشتعل کرنے کے لئے اسے داڑھی ٹیکس کہہ کر وصول کرتا تھا۔ گاؤں سرفراز پور کے مسلمانوں نے جب مزاحمت کی اور ٹیکس دینے سے انکار کیا تو یہ زمیندار مسلح آدمیوں کے ساتھ گاؤں میں داخل ہوا اور گاؤں کی مسجد نذر آتش کر دی گئی[۲] اس صورت حال میں عام مسلمانوں نے اپنے مذہبی حقوق اور زندگی کے تحفظ کے لئے ہندو اور انگریز دونوں کے خلاف صف آرائی کی چنانچہ اس مرد جانباز ٹیٹو میر نے ان کاشتکاروں کی قیادت کی اور انگریزوں کے کیمپ پر حملے شروع کئے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے بھی اس واقعہ کا تذکرہ اپنی کتاب THE INDIAN MUSSALMANS میں کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق "ٹیٹو میاں نے انگریزی حکومت کا خاتمہ اور مسلمانوں کی

---

[۱] British Policy and Muslims in Bengal 1757 - 1856, P. 90

[۲] ایضاً ص ۹۱ نیز ہمارے ہندوستانی مسلمان ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ص ۶۸ کا حاشیہ نمبر ۱

حکومت کے قائم ہونے کا اعلان کر دیا۔[1] لیکن تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ یہ تحریک بھی انگریزوں کی مسلح و منظم فوج کے سامنے دم توڑ گئی۔

چنانچہ ان مجاہدین کی بغاوت فرو کرنے کے لئے کلکتہ سے ایک بڑی انگریزی فوج بھیجی گئی جس میں سوار بھی تھے اور پیادے بھی۔ اس کے ساتھ دو توپیں تھیں۔ ٹیٹو میاں نے چھ سو آدمی ہمراہ لے کر سخت مقابلہ کیا۔ ان کے بہت سے ساتھی شہید ہوئے خود ٹیٹو میاں نے شہادت پائی۔ غلام معصوم (قائد جمعیت کے قریبی ساتھی) اور ساڑھے تین سو کے قریب مجاہدین زندہ گرفتار کر لئے گئے۔ بعد میں ان پر مقدمہ چلا۔ علی پور جیل کے مجسٹریٹ نے غلام معصوم کو موت کی سزا سنائی اور باقی اسیروں میں ایک سو چالیس کو مختلف المیعاد قید کا حکم سنایا۔

یہ دونوں تحریکیں کسی قدر اختلاف باہم کے باوجود فرائضی تحریک کے نام سے جانی جاتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ بنگال میں ان تحریکوں نے اسلام کو مستحکم کرنے کا کام خاصا انجام دیا۔ مولانا غلام رسول مہر نے آخر الذکر تحریک کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> "اس پورے معاملے کے متعلق کسی کی رائے خواہ کچھ ہو، لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ حق رسی کے تمام جائز وسائل سے مایوس ہو جانے کے بعد غیرت و حمیت کا تقاضا اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ جانی قربانی پیش کی جائے۔ ٹیٹو میاں کے دل میں یہ جذبہ سید صاحب کی تربیت سے پیدا ہوا تھا یہ قومی زندگی کا روشن نشان تھا۔ جن گروہوں کو عزت کی زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آئے وہ اگر عزت سے جانیں دینے کے لئے تیار نہ ہوں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ زندہ رہنے کا استحقاق کھو چکے ہیں۔"[2]

---

[1] اردو ترجمہ "ہمارے ہندوستانی مسلمان" ص ۶۹، ڈاکٹر صادق حسین ایم بی بی ایس۔

[2] سرگزشت مجاہدین، ص ۲۲۱، مولانا غلام رسول مہر

تحریک مجاہدین

شاہ ولی اللہؒ نے اسلام کے اجتماعی نظام کا جو خاکہ پیش کیا تھا اس میں سید احمد شہید (۲۹/۱۱/۱۷۸۶ء — ۶/۵/۱۸۳۱ء) اور شاہ اسماعیل شہید (۲۶/۴/۱۷۷۹ء — ۶/۵/۱۸۳۱ء) کی تحریک مجاہدین نے رنگ بھرنے کی کوشش کی اور اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلی بار احیائے دین اور اقامت حکومت الٰہیہ کے لئے منظم اور مرتب جدّوجہد کی گئی۔

دعوت اصلاح رسوم

جس معاشرے میں یہ تحریک برپا کی گئی تھی، اسے جاہلانہ رسوم ورواج نے پوری طرح گھیر لیا تھا۔ بدعات کا زور تھا۔ قبر پرستی، پیری مریدی، تعویذ گنڈے، شرک کی جلی اور خفی صورتیں، غیر اللہ سے توکل اور امیدیں، غیر اللہ کو نفع ونقصان کا مختار سمجھنا، شفاعت کا غلط تصور، تعظیم و آداب کے جاہلی رسوم، نسل پرستی، کھیتی باڑی اور کاروبار میں جاہلانہ رسوم، نجومیوں اور ساحروں کا زور، شگون اور فال غرض بیسیوں بیماریاں تھیں جن میں ملت کا عضو عضو گرفتار تھا۔ ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ (LOTHROP STODDARD) مشہور امریکی مصنف نے اپنی کتاب جدید دُنیائے اسلام (NEW WORLD OF ISLAM) میں اس دور کی جو سیاسی و مذہبی اور اخلاقی تصویر کھینچی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ ڈاکٹر لکھتا ہے:

"اٹھارویں صدی تک اسلامی دنیا اپنے ضعف کی انتہا کو پہنچ چکی تھی، صحیح قوت کے آثار کسی جگہ نہیں پائے جاتے تھے۔ ہر جگہ جمود و تنزل نمایاں تھا۔ آداب و اخلاق قابل نفرت تھے، عربی تہذیب کے آخری آثار مفقود ہو کر ایک قلیل تعداد وحشیانہ عشرت میں اور عوام وحشیانہ مذلت میں زندگی بسر کرتے تھے، تعلیم مُردہ ہو گئی تھی اور چند درسگاہیں، جو ہولناک زوال میں باقی تھیں، وہ افلاس اور غربت کی وجہ سے دم توڑ

رہی تھیں، سلطنتیں مطلق العنان تھیں اور ان میں بدنظمی اور خوں ریزی کا دور دورہ تھا۔ جگہ جگہ کوئی بڑا خود مختار جیسے سلطان ٹرکی یا ہند کے شاہانِ مغلیہ کچھ شاہی شان قائم کئے ہوئے تھے اگرچہ صوبہ جات کے امراء اپنے آقاؤں کی طرح آزاد سلطنتیں جو ظلم و استحصال بالجبر پر مبنی تھیں، قائم کرنے کے بہت کوشاں تھے، اسی طرح امراء متواتر سرکش، مقامی رئیسوں اور قطاع الطریق کی جماعتوں کے خلاف جو ملک کو آزار پہنچاتے تھے، برسرِ پیکار رہتے، اس منحوس طرزِ حکومت میں رعایا لوٹ مار اور ظلم و پامالی سے نالاں تھی، دیہاتیوں اور شہریوں میں محنت کے محرکات مفقود ہو گئے تھے۔ لہٰذا تجارت اور زراعت دونوں اس قدر کم ہو گئی تھیں کہ محض سدِ رمق کے لئے کی جاتی تھیں۔

مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا، تصوف کے طفلانہ توہمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا۔ مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں، عوام جہاں ان سے بھاگتے تھے اور تعویذ گنڈے اور مالا میں پھنس کر گندے فقراء اور دیوانے درویشوں سے اعتقاد رکھتے تھے اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے تھے اور ان کی پرستش بارگاہ ایزدی کے شفیع و ولی کے طور پر کی جاتی تھی کیونکہ ان جہال کا خیال تھا کہ خدا ایسا برتر ہے کہ وہ اس کی طاعات بلا واسطہ نہیں ادا کر سکتے۔ قرآن مجید کی اخلاقی تعلیم کو نہ صرف پس پشت ڈال رکھا تھا بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی، افیون شراب خوری عام ہو رہی تھی، زناکاری کا زور تھا اور ذلیل ترین اعمالِ قبیحہ کھلم کھلا بے حیائی کے ساتھ کئے جاتے تھے، یہاں تک کہ مقامات مقدسہ یعنی مکہ اور مدینہ افعال قبیحہ کے قعرِ مذلت بن گئے تھے اور حج، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض میں تعلیم کیا تھا، بدعات کی وجہ سے حقیر بن گیا تھا، فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی اور محض بے روح رسمیات اور مبتذل توہمات کے سوا کچھ نہ رہا تھا، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پھر دنیا میں آتے تو وہ اپنے پیرؤوں کے ارتداد اور بت پرستی پر بے زاری کا اظہار فرماتے[1]

اس وقت اہلِ علم و فضل کی کمی نہ تھی، علمی و روحانی ہستیاں ایک سے بڑھ کر ایک موجود تھیں

---

[1] اردو ترجمہ "جدید دنیائے اسلام" جمیل الدین صاحب بدایونی علیگ۔

دینی و مذہبی کمالات کی حامل شخصیتیں عنقا نہ تھیں، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، شعروادب کے حلقے معمور اور آباد تھے، تصوف و طریقت میں اکابر و شیوخ کی گنتی نہ تھی، لیکن یہ ساری صلاحیتیں غلط رخ پر استعمال ہو رہی تھیں ؎ اس وقت ایک ایسے شخص اور جماعت کی ضرورت تھی جو دین و علم اور صلاحیتوں کے اس بچے کھچے سرمائے سے وقت پر کام لے لے اور اس کو ٹھکانے لگائے۔ جو خانقاہوں کا حال اور درس گاہوں کا قال، وہاں کی حرارت اور یہاں کی روشنی سارے ملک میں عام کر دے، جس کے جلو میں چلتی پھرتی خانقاہیں ہوں اور دوڑتے بھاگتے مدرسے گھوڑوں کی پیٹھ پر عالم ہوں اور محرابوں میں مجاہد[1] اس تحریک نے یہی کام انجام دیا۔ یہ دراصل وقت کی سب سے بڑی ضرورت اور اہم ترین تقاضا تھا جسے تحریک مجاہدین نے پورا کیا۔ چنانچہ اس تحریک نے ان تمام خرابیوں کا بیڑہ اٹھایا اور ایک منصوبہ کے تحت یہ کام تکمیل کو پہنچا۔ مختلف مقامات کے مسلسل دورے کیے گئے۔ لوگوں کو گناہوں سے توبہ کرایا گیا اور انہیں خالص اسلام کی دعوت دی گئی[2] غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی موثر تعلیمات پیش کی گئیں اور ایک روایت کے مطابق اس تحریک کے ذریعہ چالیس ہزار غیر مسلم ایمان کے دائرے میں آئے[3]

علمائے ہند کے ایک گروہ نے بحری سفر کے خطرات کی وجہ سے حج کی فرضیت کے خلاف فتویٰ دے دیا تھا اور لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس وقت مسلمانوں پر حج فرض نہیں ہے لیکن شاہ صاحب اور ان کی تحریک نے اس کی زبردست مخالفت کی انہوں نے اس فتوے کو بے بنیاد قرار دیا اور خود حج کرنے اور اس کی خواہش رکھنے والوں کو حج کرانے کا اعلان کر دیا اور اپنے تمام ارادت مندوں کو لکھ بھیجا کہ:

> "ہم واسطے ادائے حج کے بیت اللہ جاتے ہیں، جن جن صاحبوں کو حج کرنا منظور ہو، انہیں اپنے ہمراہ لائیں، مگر یہ حقیقت ہر ایک پر واضح کر دیں کہ ہمارے پاس نہ کچھ مال ہے نہ خزانہ، محض اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے جاتے ہیں۔ اس کی ذات پاک

---

[1] سیرت سید احمد شہید حصہ اول ص ۷۷، سید ابوالحسن علی ندوی

[2] تحریک مجاہدین کا انقلابی پہلو ص ۳۸، سید اسعد گیلانی۔

[3] سیرت سید احمد شہید بار دوم ص ۲۳۶، سید ابوالحسن علی ندوی

سے قوی اُمید ہے کہ وہ اپنے فضل سے ہماری مُراد پوری کرے گا۔ اور جہاں کہیں راستے میں واسطے حاجتِ ضروری کے خرچ نہ ہو گا وہاں ٹھہر کر محنت مزدوری کریں گے۔ جب بخوبی خرچ جمع ہو جائے گا تب وہاں سے آگے کو روانہ ہوں گے۔ عورتیں اور ضعیف مرد جو مزدوری کے قابل نہ ہوں گے، ڈیروں کی نگرانی پر رہیں گے اور اس خرچ میں کمانے والے اور ڈیروں پر رہنے والے سب برابر کے شریک ہوں گے[1]۔

اس طرح کم وبیش چار سو افراد کے اس قافلے نے حج کے فریضے کا شرف حاصل کیا۔ اور اس طرح مسلمانوں کے اندر خطرات مول لے کر کام کرنے کا داعیہ اُبھرا۔

تیسری طرف قائد تحریک سید احمد شہید نے طریقت اور شریعت کے درمیان تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ آپ کی کتاب صراطِ مستقیم جسے شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحیّ نے مُرتب کیا ہے اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔

دعوتِ جہاد

تحریک مجاہدین کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسلام کا ایک عظیم ادارہ جہاد سمٹا سُکڑا سِسک رہا تھا، سید صاحب اور ان کے رفقاء نے اس میں ایک نئی رُوح پھونک دی اور مسلمانوں کو پھر ایک بار ظالموں اور جباروں کی قبائیں نوچنے کے لئے اٹھا کھڑا کیا۔ اس کے لئے ایک مستقل اور منظم جماعت برپا کی، دین کے انقلابی تصور کو واضح کیا اور اسلام کے مکمل نظامِ حیات کے تصور کو روبہ کار لانے کے لئے اُمت کے تنِ مُردہ میں جان ڈال دی۔ شاہ بخارا کو جو خط سید صاحب نے لکھا، اس میں جہاد کی فرضیت پر ابھارتے ہوئے فرمایا:

"جب اسلامی بلاد پر غیر مسلط ہو جائیں تو عام مسلمانوں پر عموماً اور بڑے بڑے حکمرانوں پر خصوصاً واجب ہو جاتا ہے کہ وہ ان غیر مسلموں کے خلاف مقابلہ ومقاتلہ کی کوششیں اس وقت تک جاری رکھیں جب تک اسلامی بلاد ان کے قبضے سے واپس نہ لے لئے جائیں ورنہ مسلمان گنہگار ہوں گے ان کے اعمال بارگاہ تعالیٰ میں مقبول نہ ہوں گے

---

[1] سید احمد شہید ص ۱۸۳ حصہ اوّل، مولانا غلام رسول مہر۔

اور وہ خود حق کی برکتوں سے محروم رہیں گے[۱]

ایک بار کسی صاحب نے کہا کہ یہ سپر، تلوار اور بندوق وغیرہ کا باندھنا اسباب جہالت میں، آپ ان سے باز آجائیں کہ یہ آپ کے لئے زیبا نہیں تو سید صاحب کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا اور فرمایا:

"خاں صاحب! اس بات کا آپ کو کیا جواب دوں؟ اگر آپ سمجھتے تو یہی کافی ہے کہ وہ اسباب خیر و برکت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو عنایت فرمائے تھے تاکہ کفار و مشرکین سے جہاد کریں اور خصوصاً ہمارے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اسی سامان سے تمام کفار و اشرار کو زیر کر کے جہاں میں دین حق کی روشنی بخشی، اگر یہ سامان نہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے اور اگر ہوتے تو خدا جانے کس دین و ملت میں ہوتے۔"

فنونِ حرب سے دلچسپی اور انہماک بڑھا تو بعض رفقاء کو تردد ہوا کہ اب سلوک و طریقت کی طرف توجہ کم ہونے لگی ہے انہوں نے سید صاحب سے درخواست کی کہ اس درجہ انہماک درست نہیں ہے تو سید صاحب نے انہیں جواب دیا کہ:

"ان دنوں اس سے افضل کام ہم کو درپیش ہے۔ اسی میں ہمارا دل مشغول ہے، وہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیاری ہے، اس کے سامنے اس حال کی کچھ حقیقت نہیں، وہ کام یعنی تحصیلِ علم سلوک اس کام کے تابع ہے، اگر کوئی تمام دن روزہ رکھے، تمام رات عبادت و ریاضت میں گزارے اور نوافل پڑھتے پڑھتے پیر دن میں ورم آجائے اور دوسرا شخص جہاد کی نیت سے ایک گھڑی بھی بارود اڑائے تاکہ کفار کے مقابلے میں بندوق لگاتے آنکھ نہ جھپکے تو وہ عابد اس مجاہد کے رُتبے کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔"[۲]

اس سلسلے میں سر سید احمد مرحوم کا شاہ اسماعیل شہید کے بارے میں بڑا دلچسپ بیان ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"بموجب ارشاد سید پیر طریق ہدا (سید صاحب) کے اس طرح سے تقریر و وعظ کی

---

[۱] سید احمد شہید ج اول ص ۲۵۰، مکتوب بنام شاہ محمد[؟] ا، غلام رسول مہر

[۲] سیرت سید احمد شہید ص ۲۲۷، ۲۲۸، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بحوالہ وقائع احمدی ص ۴۴۸-۴۵۴

بنا ڈالی کہ مسائل جہاد فی سبیل اللہ بیشتر بیان ہوتے اور یہاں تک کہ آپ کے صیقلِ تقریر سے مسلمانوں کا آئینۂ باطن مصفّٰی اور مجلّٰی ہو گیا اور اس طرح سے راہِ حق میں سرگرم ہو گئے کہ بے اختیار دل ان کا چاہنے لگا کہ سر اُن کا راہِ خدا میں فدا ہو اور جان اُن کی اعلائے نوائے محمدی میں صرف ہو۔[1]

اس طرح اس تحریک نے قوم کے اندر جہاد کی وہ رُوح پھونکی کہ لاکھوں مسلمانوں نے کفار سے جہاد کرتے ہوئے خدا کی راہ میں اپنی گردنیں کٹوا دیں۔ ایک خط میں تحریک کا مقصد ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں :

"وہ غیر جن کا وطن بہت دُور ہے، بادشاہ بن گئے ہیں، جو تاجر سامان بیچ رہے تھے انہوں نے سلطنت قائم کر لی۔ بڑے بڑے امیروں کی امارتیں، رئیسوں کی ریاستیں خاک میں مل گئیں، ان کی عزت اور ان کا وقار چھن گیا۔ جو لوگ سیاست و ریاست کے مالک تھے، وہ گمنامی کے گوشے میں بیٹھ گئے آخر فقیروں اور مسکینوں میں سے تھوڑے آدمیوں نے کمر ہمت باندھی، ضعیفوں کا یہ گروہ محض خدا کے دین کی خدمت کے لئے اٹھا ہے۔

وہ لوگ نہ دُنیا دار ہیں نہ جاہ طلب ہیں۔ جب ہندوستان کا میدان غیروں اور دُشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ضعیفوں کی کوششوں کا تیر مُراد کے نشانہ پر جا بیٹھے گا تو آئندہ کے لئے ریاست و سیاست کے عہدے طالبوں ہی کو مبارک رہیں گے۔"[2]

آپ نے مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی، انہیں اقامت دین کے لئے مجتمع کیا، غلبۂ اسلام کے لئے ان کی کوششوں کا استعمال کیا۔ آپ کا مقصد محض انگریزوں سے ملک کو پاک کرنا نہ تھا بلکہ اسلام کے فریضے کی تکمیل اور خدا کے دین کی حکومت قائم کرنا تھا۔ چنانچہ ایک خط میں اپنی تحریک کا مقصد صاف لفظوں میں بیان کیا :

"جہاد قائم کرنا اور بغاوت و فساد کو مٹانا ہر زمانے اور ہر مقام میں خدا کا نہایت اہم حکم

---

[1] آثار الصنادید طبع اوّل بحوالہ سہ ماہی رسالہ "تاریخ و سیاست" بابت ماہ نومبر ۵۲ء ص ۸

[2] خط بنام ہندو راؤ، مکاتیب شاہ اسماعیل شہید ص ۱۷۰،

رہا ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں جب کافروں اور مشرکوں کی شورش ایسی صورت اختیار کر چکی ہے کہ سرکشوں اور باغیوں کے ہاتھوں دینی شعائر بگاڑے جا رہے ہیں اور شاہانِ اسلام کی حکومتوں میں ابتری پیدا کی جا رہی ہے اور یہ زبردست فتنہ ہند و سندھ اور خراسان کے خطوں پر چھا گیا ہے اس صورت میں سرکش کافروں کی بیخ کنی سے غفلت اور مفسد باغیوں کی گوشمالی سے سہل انگاری بڑا اور قبیح گناہ ہے اس بنا پر خدا کی درگاہ کے اس بندے نے اپنے وطن سے نکل کر ہند و سندھ اور خراسان کا دورہ کیا اور وہاں کے مومنوں اور مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی[1]۔

سید صاحب اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اسلام چند عقائد اور عبادات و رسوم کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ زندگی کا نظام اور ایک مکمل ضابطہ ہے جو عقائد کے ساتھ اخلاق و معاشرت زندگی کے مقصد و معیار، زاویۂ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے مادی و سیاسی اقتدار حاصل ہو، صرف خدا کی حکومت چلے اسی کو قانون سازی اور تنفیذ کا حق ہو اور اسی کی زندگی کے ہر معاملے میں اطاعت کی جائے اور یہ کہ شرعی اور اسلامی حکومت کے بغیر مکمل اسلام پر عمل کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اُس تحریک کا بنیادی مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامتِ حکومت الٰہیہ تھا۔ یہ محض احیائے دین کے لئے برپا کی گئی تھی[2]۔ چنانچہ قائد تحریک خود اپنے لفظوں میں بیان فرماتے ہیں کہ:

"میری اس کے سوا کوئی دوسری نفسانی غرض نہیں کہ جہاد کو شرعی طریقے پر قائم کیا جائے اور مسلمانوں کی فوجوں میں نظم قائم ہو، ہاں اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افرادِ انسانی بلکہ تمام ممالک میں ربّ العالمین کے احکام جن کا نام شرعِ متین ہے، بلا کسی مخالفت کے جاری ہو جائیں[3]۔"

اپنے ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] خط بنام شاہ محمود درانی سلطان ہرات، جماعت مجاہدین ص ۱۲، ۱۳، غلام رسول مہر۔

[2] Saiyed Ahmad Shahid by Mohiuddin Ahmad, P. 207-218

[3] مکاتیب شاہ اسماعیل شہید ص ۵۹۔

"میں ہفت اقلیم کی سلطانی کو پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا، جب نصرتِ دین کا دور دورہ شروع ہو جائے گا اور سرکشوں کے اقتدار کی جڑ کٹ جائے گی تو میری سعی کا تیر خود بخود نشانہ مراد پر جا بیٹھے گا۔"[1]

وقت کے سلاطین کو جو خطوط آپ نے لکھے ان میں اس بات کی کھل کر وضاحت کر دی کہ میرا مقصد حکومت و ریاست نہیں بلکہ محض اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے یہ تحریک چل رہی ہے:

"صد جان سے خدا تعالیٰ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ مالک حقیقی کی اطاعت میں مشغول ہوں اور صرف اسی کی رضا مطلوب ہے، خدا کے سوا ہر چیز سے آنکھیں اور کان بند کر لئے ہیں دنیا و مافیہا سے ہاتھ اٹھا لیا ہے اور محض لوجہ اللہ عَلَمِ جہاد بلند کیا ہے۔ مال و منال، جاہ و جلال، امارت و ریاست اور حکومت و سلطنت کی طلب سے کاملاً الگ ہو چکا ہوں خدا کے سوا کسی کی جستجو نہیں رہی۔"[2]

غرض اس تحریک کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ رسول پاکؐ کی سُنّت زندہ ہو اور اسلامی حکومت قائم ہو چاہے ہاتھ وہی رہیں یا بدل جائیں:

"تاج فریدون اور تخت سکندر میری نظروں میں جَو کے برابر بھی نہیں رہے، قیصر و کسریٰ کی مملکت کا خیال تک دل میں نہیں لاتا۔ صرف یہ آرزو ہے کہ اکثر افرادِ بنی آدم بلکہ دُنیا کے تمام خطوں میں ربُّ العالمین کے احکام جاری ہو جائیں جنہیں ہم شریعت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور اس بارے میں کسی کی طرف سے کشمکش کا امکان باقی نہ رہے۔ صرف اس کام کی تکمیل مقصود ہے خواہ یہ میرے ہاتھ سے پورا ہو یا کسی دوسرے کے ہاتھ سے۔ جو حیلہ اس مدعا کے حصول کا باعث بن سکتا ہے اسے بروئے کار لاتا ہوں اور جو تدبیر اس مقدمے کے لئے مفید نظر آتی ہے اس سے کام لیتا ہوں۔"[3]

۱۔ سیرت سید احمد شہید ص ۱۱۰، ۱۱۱، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۲۔ سید احمد شہید ص ۲۶۴، ۲۶۵، غلام رسول مہر،

۳۔ " ص ۲۶۶، "

برصغیر کی پہلی اسلامی ریاست

تحریک مجاہدین نے سکھوں کے خلاف عملی جہاد کیا اور جان و مال کی بے شمار قربانیوں اور جہد و عزیمت کی طویل ترین مسافتوں کو طے کرنے کے بعد باقاعدہ پشاور پر قبضہ کرلیا اور اس آزاد علاقے میں پہلی اسلامی حکومت قائم کی۔ شہر میں داخل ہوتے ہی امن کی منادی کرادی اور ممانعت کردی کہ مجاہدین میں سے کوئی شخص کوئی چیز بلا قیمت نہ لے یا کسی قسم کا ظلم اور استحصال نہ کرے۔ شہر کی دکانیں کھل گئیں، کسبیاں اور فاحشہ عورتیں روپوش ہوگئیں، شراب کی بھٹیاں اور مسکرات کی دوکانیں بند ہوگئیں، شریعت کے احکام جاری ہوتے، عشر و زکوٰۃ کا نظام قائم ہوا، تارکینِ صلوٰۃ پر تعزیر مقرر ہوئی اور سید صاحب کے نام سکہ بھی جاری ہوگیا۔ لیکن اپنوں کی غداری اور دشمنوں کی سازشوں کی وجہ سے یہ حکومت تھوڑے ہی دنوں تک قائم رہی اور ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں قائد تحریک کی شہادت کے بعد ختم ہوگئی، لیکن یہ جدوجہد مسلمانوں کے اندر ایک نئی رُوح اور ایک نیا عزم بیدار کرگئی اور بعد میں کافی دنوں تک مسلمان اسلامی تہذیب و تمدن کے احیاء کے لئے انگریزوں اور کافروں سے برسرپیکار رہے۔

اس تحریک نے محض اسلامی نظام کے احیاء کے لئے وہ زبردست قربانیاں دیں جن سے دورِ اوّل کی یاد تازہ ہوگئی۔ اور ایک زبردست مفکر کے بقول "اس دور میں صحابہؓ سے قرب کی کوئی مثال ہمیں ملتی ہے تو اس تحریک میں ملتی ہے، وہی جذبہ ہے، وہی کیفیت ہے، وہی قربانیاں ہیں، وہی اخلاص ہے، اسی قسم کی للّٰہیت ہے، ہر شخص اپنے امیر کے اوپر پروانہ وار فدا ہو رہا ہے اور اس کے حکم کے آگے سر جھکائے دے رہا ہے۔"

چنانچہ ایک جنگ میں افغان سردار کی غداری کی وجہ سے جب مجاہدین کی ہزیمت ہوئی اور سید صاحب کا ہاتھی مخالفین میں نشانِ امارت کی حیثیت سے معروف ہوگیا تو تحریک کے ایک کارکن نے سید صاحب کے بے ہوش جسم کو ہاتھی سے اُتار کر گھوڑے پر سوار کرادیا اور خود ہاتھی پر سوار رہا۔ مقصود یہ تھا کہ تعاقب کرنے والے سکھ اس خیال سے ہاتھی کے پیچھے لگے رہیں کہ سید صاحب اس میں سوار ہیں اس اثناء میں سید صاحب کو خطرے کے مقام سے دور نکل جانے کا موقعہ مل جائے گا۔

جہاد کے لئے فہرستیں پیش ہوئیں تو جہان آباد کے عبدالمجید خاں آفریدی کا نام

قلم زد ہو گیا کیونکہ وہ بخار میں مبتلا تھا اور خاصا کمزور ہو گیا تھا۔ جب اس مجاہد کو خبر ملی تو بے تابانہ سید صاحب کے پاس آیا اور عرض کیا: حضرت میں کچھ ایسا تو بیمار نہیں ہوں کہ چلنے کی طاقت نہ ہو اور یہ پہلا معرکہ ہے جس میں جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد رکھی جائے گی میرا نام ضرور شامل فرما دیجئے تاکہ سبقت کی فضیلت سے محروم نہ رہ جاؤں۔ سید صاحب نے جہاد کا یہ جذبہ دیکھا تو اسے بھی میدان میں اترنے کی اجازت دے دی اور اس کے لئے دُعا کی۔ خان موصوف نے بیماری کے باوجود چودہ دشمنوں کو اپنے ہاتھ سے تہِ تیغ کیا پھر تلوار ٹوٹ گئی تو ایک دوسرے مجاہد نے انہیں اپنی تلوار دے دی اس سے بھی کئی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ آخر خود بھی خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔

ایک بار مجاہدین قلعہ میں محصور ہو گئے اور رسد و کمک کے سارے راستے مسدود ہو گئے۔ سید صاحب کا کوئی حکم بھی نہ پہنچ سکا کہ وہاں سے منتقل ہو جائیں اس حالت میں مجاہدین موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ سکھوں کے سرداروں نے عہدوں اور مناصب کی پیشکش کی اور ساتھ مل جانے پر تیار کرنا چاہا تو سالار مجاہد بن شیخ بلند بخت نے فرمایا:

"اپنے سردار سے کہو، ہم امیر المومنین کے تابع فرمان ہیں۔ حضرت کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے اپنے وطنوں سے اس لئے آئے ہیں کہ کافروں سے جنگ کریں نہ ملک چاہتے ہیں نہ مال۔ ہمیں نوکری سے کیا غرض؟ ہماری موت اور زندگی امیر المومنین کے ساتھ ہے تا در ذوالجلال کے سوا ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔ اگر رنجیت سنگھ بھی اپنا لشکر لے کر آئے تو نہ ڈریں گے۔ ڈر خوفِ مرگ سے پیدا ہوتا ہے ہم اپنی جانیں خدا کے راستے میں قربان کر چکے ہیں پس ہمیں کیا ڈر ہے؟ ہماری طرف سے کہہ دینا کہ پھر ہمیں ایسا پیام نہ بھیجا جائے۔"

اس تحریک کے علمبرداروں نے ایثار و قربانی کے ایسے شاندار نمونے پیش کئے جن کی مثال ملنی مشکل ہے۔ صرف صادق پور پٹنہ کے ایک خاندان کا یہ عالم تھا کہ:

"مولانا عنایت علی کے چچازاد بھائی مولوی باقر علی جماعت کے پہلے شہید تھے وہ اکوڑہ میں دفن ہوئے۔ ایک حقیقی بھائی مولوی طالب علی کو چنگلئی کی زمین پسند آئی۔ دوسرے حقیقی بھائی مولانا عنایت علی تاریخی اور سنگل تھانے میں لڑتے ہوئے استھانے سے اوپر

چنبئی کے پہاڑوں میں جا سوئے۔ خود مولانا ولایت علی ستھانے کی مجاہد خیز خاک میں آسودۂ خواب ہیں۔ ان کے فرزندوں میں سے مولانا عبد اللہ نگری میں مدفون ہیں اور مولانا عبد الکریم اسمت میں اور اخلاف واقربا خدا جانے کہاں کہاں بکھرے پڑے ہیں پھر ان مردان حق نے علاقہ سرحد پر قناعت نہ کی بلکہ خلیج بنگال کے ان ٹاپوؤں میں بھی شہادت کے جھنڈے جا گاڑے جنہیں عام طور پر "کالے پانی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مولانا احمد علی اور مولانا یحییٰ علی انڈمان کے دو مختلف جزیروں میں سوئے پڑے ہیں[1]

اس تحریک کے اخلاص وللّٰہیت کا حال یہ تھا کہ جب فتح پشاور کے بعد سردارن پشاور نے اطاعت و اعانت جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ سید صاحب کی خدمت میں ایک بڑی رقم پیش کرنے کی تجویز ظاہر کی تو سید صاحب نے فرمایا:

"ہماری نیت تو محض یہ ہے کہ مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ پر متفق کریں، کفر مغلوب ہو جائے مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو، دین اسلام ترقی کرے، نہ ہمیں پشاور سے غرض ہے نہ کابل سے[2]

یہی وہ بے غرضی اور پاکیزگی ہے جس کی گواہی اس تحریک کا بدترین دشمن ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر بھی دیتا ہوا نظر آتا ہے:

"یہ ایک تحقیق شدہ بات ہے جہاں تک میرے تجربے اور مشاہدے کا تعلق ہے کہ وہابی مبلغ نہایت بے غرض اور پاکیزہ نفس انسان ہوتا ہے۔"

یہی انگریز ان مجاہدین کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

"۱۸۲۱ء میں امام صاحب نے اپنے خلفاء کو منتخب کرتے وقت ایسے آدمیوں کا انتخاب کیا جو بے پناہ جوش و خروش کے مالک اور بہت ہی مستقل مزاج تھے ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح متعدد بار جب یہ تحریک تباہ ہونے کے قریب تھی، انہوں نے بار بار جہاد کے جھنڈے کو تباہی سے بچا کر از سر نو بلند کر دیا۔ پٹنہ کے خلفاء ان تھک واعظ

---

[1] سید احمد شہید جلد اول ص ۱۱۴، غلام رسول مہر

[2] سید احمد شہید جلد دوم ص ۲۷۱، غلام رسول مہر

[3] اردو ترجمہ "ہمارے ہندوستانی مسلمان" صادق حسین ص ۱۰۶

خود اپنے آپ سے بیزار، بے داغ زندگی بسر کرنے والے۔ انگریز کافروں کی حکومت کو تباہ کرنے میں ہمہ تن مصروف، روپیہ اور رنگروٹ جمع کرنے کے لئے ایک مستقل نظام قائم کرنے میں نہایت چالاک تھے۔ وہ اپنی جماعت کے اراکین کا نمونہ اور ان کے لئے ایک مثال تھے۔ ان کی بہت سی تعلیم بے عیب تھی اور یہ انہیں کا کام تھا کہ انہوں نے اپنے ہزاروں ہم وطنوں کو بہترین زندگی بسر کرنے اور اللہ تعالیٰ کے متعلق بہترین تصور پیدا کرنے کی ترغیب دی۔[1]

مولانا یحییٰ علی صاحب کو جب پھانسی کے بجائے عمر قید کی سزا ہوگئی اور ان کا سر اور داڑھی کے بال تراش دیئے گئے تو بال اٹھا کر کہتے جاتے تھے کہ:

"افسوس نہ کر، تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کی خاطر کاٹی گئی۔"

اس تحریک میں جاں سپاری اور قربانی کا کس قدر جذبہ تھا، اس کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے لگائیے:

مولوی محمد جعفر تھانیسری کو جس دن پھانسی کی سزا سنائی جانے والی تھی، ہربرٹ ایڈورڈز نے انہیں مخاطب کرکے کہا:

"تم بہت عقل مند اور ذی علم اور قانون داں ہو، اپنے شہر کے نمبردار اور رئیس ہو لیکن تم نے اپنی ساری عقل سرکار کی مخالفت میں خرچ کی، اب تمہیں پھانسی دی جائے گی جائداد ضبط ہوگی، تمہاری لاش بھی تمہارے وارثوں کو نہ ملے گی اور تمہیں پھانسی پر لٹکا ہوا دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

مولوی صاحب نے جواب دیا کہ:

"جان لینا اور دینا خدا کا کام، آپ کے اختیار میں نہیں، وہ رب العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے آپ کو ہلاک کر دے۔" اس جواب باصواب پر وہ بہت خفا ہوا مگر پھانسی کا حکم دینے سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔[2]

شکیبساری کی جنگ میں مولانا اسماعیل شہید کا یہ حال تھا کہ:

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۰۱، ۱۰۲، اردو ترجمہ صادق حسین،

[2] کالا پانی ص ۲۳، ۲۴، مولوی محمد جعفر تھانیسری

"سکھوں کی گولیاں مینہ کی طرح برستی رہیں۔ مولانا کی قبا چھلنی ہوگئی، لیکن نہ آپ میدان سے ہٹے نہ مورچے کی پناہ لی اور نہ جنگ روکی۔ مولانا نے خود ایک رفیق کو بتایا کہ ایک سکھ تلوار لے کر میری طرف بڑھا، میں نے گولی سے اسے ٹھنڈا کر دیا اور پھر بندوق بھرنے لگا۔ اس اثنا میں دوسرا سکھ آگیا، اسے بھی مار دیا۔ تیسری مرتبہ بندوق بھر رہا تھا تو میری انگلی پر گولی لگی اور ہاتھ بندوق کے پیالے سے ہٹ گیا میں نے اس حالت میں بھی بندوق چلادی ایک اور سکھ مارا گیا۔ چوتھی مرتبہ بندوق بھرنے لگا تو بارود لہو سے تر ہوگیا۔ چوتھا سکھ حملے کی غرض سے میری طرف بڑھا مجھے یقین ہوگیا کہ اب زندہ بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے میں نے خالی بندوق کا رُخ اس کی طرف پھیر دیا وہ گھبرا کر بھاگ نکلا[۱]"

پھر یہ تحریک بالاکوٹ کی شہادت گاہ میں دفن نہیں ہوگئی بلکہ چراغ سے چراغ جلے۔ ملک کے طول و عرض میں آزادی کی لہر اٹھی۔ مورخین کی اطلاعات کے مطابق ایک ہی وقت میں ۶۶ خلفاء نے آپ کے مشن کو زندہ رکھا اور اپنے اپنے مراکز سے مشعل ایمان و آزادی جلاتے رہے اور انگریزوں کا ناطقہ بند کرتے رہے۔ سب سے اہم مرکز قبائلی علاقہ میں استھانہ قرار پایا۔ یہ تحریک کا سرخیل اور مستقل جہاد میں مصروف تھا۔ پٹنہ کا علاقہ مشرقی علاقہ میں دعوت و اتحاد کا مرکز قرار پایا، یہاں سے پیغام و دعوت بہار و بنگال کو پہنچتی رہی اور سرحد کی جنگوں میں جوق در جوق یہاں سے افراد ملتے رہے۔ تیسرا علاقہ دکن منتخب کیا گیا جہاں ایک مسلم حکومت بھی موجود تھی تاکہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا جذبہ پیدا کرے۔ چوتھا ٹونک کا علاقہ مرکز قرار پایا۔ یہاں سے راجپوتانہ اور وسط ہند کے لئے تبلیغ و ہدایت کا پیغام دیا جاتا اور پانچواں یوپی میں دیوبند تحریک کا مرکز قرار پایا۔ یہاں مجاہدوں کی ٹریننگ اور تربیت کی جاتی تھی۔ یہاں ایک اسلامی مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی جہاں سے مجاہدین کی صف پیدا ہوئی اور اپنی سرفروشی سے انگریزوں کی ناک میں دم کئے رکھا۔

---

[۱] سید احمد شہید جلد دوم ص ۱۹، غلام رسول مہر

چھٹا باب

تحریکاتِ آزادی

① تحریک آزادی سن ستّاون

② تحریک ریشمی رومال

③ تحریکِ خلافت

④ تحریک خاکسار

⑤ تحریک اہلِ حدیث

تحریک آزادی سن ستاون

یہ تحریک مسلمانوں نے اس لئے چلائی تھی تاکہ غیر ملکی اقتدار سے نجات پاکر اسلامی تہذیب و تمدن کا احیا کیا جا سکے۔ جس زمانے میں کانگریس اور قومی تحریکات کا وجود نہ تھا، ہندو اور دوسری قومیں انگریزوں کی گود میں سو رہی تھیں یا ان کی سرپرستی میں معاشی و سماجی تحفظات حاصل کر رہی تھیں، مسلمان مجاہدین نے سر دھڑ کی بازی لگا کر انگریزی اقتدار کو چیلنج کیا اور سن ستاون کا ہنگامہ ظہور پذیر ہوا جو اپنے نتائج و اثرات کے لحاظ سے بڑا دور رس ثابت ہوا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اس جنگ میں گو مسلمانوں کی تعداد نسبتاً کم تھی لیکن جان و مال کی قربانیوں سے وہ تاریخ آزادی پر اپنے نقوش ثبت کر گئے۔ یہ کوئی عارضی اور وقتی ہنگامہ نہ تھا بلکہ اس کی تہ میں مسلمانوں کے دیرینہ عزائم کام کر رہے تھے۔ بہت سے قائدین عوام کے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کی ذاتی زندگی میں اسلام رچا بسا تھا اور جو انگریزی عملداری ختم کر کے مسلمانوں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو سہارا دینا چاہتے تھے۔

ان میں مولوی احمد شاہ مدراسی، مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا رحمت اللہ اور دوسرے بزرگان دیوبند خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولوی احمد شاہ مدراسی ایک زبردست مقرر تھے۔ چنانچہ عوام میں وعظ و نصیحت کے لئے پر جوش تقریریں کیا کرتے تھے اور ان کی تقریروں میں ہزاروں آدمی ہندو اور مسلمان جمع ہوتے تھے۔ چنانچہ آگرہ کی تقریروں میں دس دس ہزار کا مجمع ہوتا تھا[1]۔ ان کی ہر دل عزیزی کا یہ عالم تھا کہ ایک موقعہ پر مجسٹریٹ کے حکم سے پولیس تک

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۲۳، مفتی انتظام اللہ شہابی۔

نے انہیں گرفتار کرنے سے انکار کر دیا۔[1]

آپ سن ستاون کے ان ممتاز مجاہدین میں سے ہیں جن سے سخت دشمنی کے باوجود انگریزوں نے ان کی بے حد تعریف کی۔ میلی سن لکھتا ہے:

"اگر محبِ وطن اسے کہتے ہیں جو اپنے وطن کی برباد شدہ آزادی کے حصول کے لئے سازشیں کرے اور لڑے تو یقیناً مولوی ایک سچا محبِ وطن تھا۔ اس نے اپنی تلوار کو (میدانِ جنگ سے باہر) قتل کے داغ سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ اس نے قتل کے کسی بھی واقعہ سے چشم پوشی گوارا نہ کی وہ اُن اجنبیوں کے خلاف بلند ہمتی اور استقامت سے میدانِ جنگ میں لڑتا رہا جو اس کے وطن پر مسلط ہو گئے تھے اور اس کی یاد تمام قوموں کے مخلصوں اور بہادروں کی جانب سے عزت و احترام کی مستحق ہے۔"[2]

مولانا فضل حق خیر آبادی مولوی احمد اللہ کا ذکر اپنی کتاب میں اس طرح کرتے ہیں:

"اس موقعہ پر تسلط نصاریٰ کے خلاف لڑنے کے لئے ایک اور ہمت کا عامل اُٹھ کھڑا ہوا اس نے خیرات و مبرات اور سعادات و حسنات کا خاصا ذخیرہ فراہم کر لیا تھا وہ بڑا ہی پاک طینت، صاف باطن، متقی و پرہیز گار، بہادر رسول ملاحم اور نبی مراحم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم نام تھا اس نے نصاریٰ کے لشکر پر حملہ کر کے پہلے ہی ہلے میں شکست دے دی۔"[3]

مولانا فضل حق خیر آبادی نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ مرتب کرایا جس پر علمائے دہلی سے دستخط لئے گئے اور یہی فتویٰ مولانا کی گرفتاری کا سبب بنا اور آپ کے لئے حبسِ دوام کا حکم صادر ہوا اور ان کی کتابیں، جائداد، مال و متاع، اہل و عیال کے رہنے کا مکان غرض ہر شئی ضبطی میں آگئی اور بقول خود

"انہیں قید میں ہر ممکن اذیت پہنچائی گئی اور قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایمان و اسلام پر مضبوطی سے قائم رہے تھے اور ان کا شمار علمائے اعلام میں ہوتا تھا اور اس سے ان کا

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۸۰ مولوی سید طفیل احمد منگلوری

[2] ۱۸۵۷ء کے مجاہدین ص ۴۴، مولانا غلام رسول مہر

[3] باغی ہندوستان یا الثورۃ الہندیہ ص ۳۰۸، مولانا فضل حق خیر آبادی

مقصد نشانِ درس و تدریس کو مٹانا اور علم دین کے جھنڈے کو نیچے گرانا تھا۔[1]

انگریزوں کے ان مظالم اور استحصال کا مقصد عوام کے دلوں سے مذہب اسلام سے محبت و یکانگت کو ختم کرنا تھا۔ چنانچہ مولانا موصوف خود لکھتے ہیں کہ:

"یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ سب لوگ انہی کی طرح ملحد و بے دین ہو کر ایک ہی ملت پر جمع ہو جائیں اور کوئی بھی ایک دوسرے سے ممتاز فرقہ نہ رہ سکے۔ انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے باشندوں کا اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا۔"[2]

منشی جیون لال نے جو روزنامچہ ترتیب دیا ہے اس سے بھی علامہ خیر آبادی کی انقلابی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ منشی جی لکھتے ہیں:

"۱۶ راگست ۱۸۵۷ء مولوی فضل حق شریک دربار ہوتے انہوں نے اشرفی نذر میں پیش کی اور صورت حال کے متعلق بادشاہ سے گفت گو کی۔

۲ ر ستمبر ۱۸۵۷ء بادشاہ دربار عام میں تشریف فرما ہوتے، مرزا الٰہی بخش، مولوی فضل حق، میر سعید علی خاں اور حکیم عبد الحق آداب بجالائے۔

۶ ر ستمبر ۱۸۵۷ء، مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے۔

۷ ر ستمبر ۱۸۵۷ء، بادشاہ دربار خاص میں رہے، حکیم عبد الحق، میر سعید علی خاں مولوی فضل حق، بدر الدین خاں اور دیگر تمام امراء و رؤسا شریک دربار رہے۔"[3]

جب علامہ پر مقدمہ چلا اور جہاد کے فتویٰ کی عدالت میں تصدیق و توثیق چاہی گئی تو مولانا نے کھل کر کہا کہ ہاں فتویٰ میرا ہی مرتب کیا ہوا ہے اور آج بھی میری رائے وہی ہے۔[4]

مولوی رحمت اللہ کیرانوی عیسائیت کے خلاف شمشیر براں اور ایک زبردست

---

[1] باغی ہندوستان ص ۳۵۴، علامہ فضل حق خیر آبادی،

[2] 〃 〃 ص ۳۵۶، ۳۵۷،

[3] غدر کی صبح و شام، روزنامچہ منشی جیون لال ص ۲۱۷، ۲۴۰، ۲۴۶، ۲۴۷،

[4] غدر کے چند علماء، ص ۳۴، مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی

مناظرہ باز تھے۔ ایک مناظرہ میں عیسائی پادری کو رسوا کن شکست دے چکے تھے چنانچہ انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان ہوا تو کیرانہ میں مجاہدین کی فوج کے سالار یہی تھے۔ مولانا غلام رسول مہر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :

"مجاہدین کیرانہ میں مسلمان گوجروں کی اکثریت تھی اور ان کی قیادت چودھری عظیم الدین کر رہے تھے لیکن تمام احکام مولوی رحمت اللہ ہی سے حاصل کئے جاتے تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ بجایا جاتا جس کی آواز سن کر لوگ جمع ہو جاتے پھر اعلان ہوتا "ملک خدا کا حکم مولوی رحمت اللہ کا" اس کے بعد جو کچھ بتانا ہوتا بتا دیا جاتا۔"[۱]

مولوی ذکاء اللہ دہلی کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ باہر سے جو پلٹنیں ہتھیاروں کے بغیر آتی تھیں انہیں دہلی کے میگزین سے ہتھیار مل جاتے تھے :

"مولوی رحمت اللہ اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے وہ بڑے عالم و فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے رد میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعہ کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے۔ اس دانش مند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ ایک ہنگامۂ فساد برپا تھا وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن چلا گیا"[۲]

مولانا کی گرفتاری کا اعلان ہوا تو چپکے سے مکہ ہجرت کر گئے لیکن ادھر ان کی جائداد جو لاکھوں روپیہ کی تھی ڈیڑھ ہزار روپیوں میں نیلام کر دی گئی اور زرعی زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا۔[۳]

ان کے علاوہ عظیم اللہ خاں، جنرل بخت خاں، شہزادہ فیروز، مولانا لیاقت علی الہ آبادی ڈاکٹر وزیر خاں، نواب علی بہادر اور نواب تفضل حسین وغیرہ مجاہدین کا نام آتا ہے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی اس جنگ میں بھرپور حصہ لیا اور جان و مال کی قربانیاں دیں تاکہ ملک آزاد ہو اور اسلامی تہذیب و تمدن کا احیاء ہو سکے۔

جنگ آزادی کی یہ کوشش ناکام ہو گئی تو انگریزوں کے قہر و غضب کا نشانہ

---

[۱] ۱۸۵۷ء کے مجاہد ص ۱۵۸، ۱۵۹، مولانا غلام رسول مہر

[۲] تاریخ ہندوستان، مولوی ذکاء اللہ دہلوی ص ۶۷۵

[۳] روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۵۹ء

ں طور پر مسلمان بنے۔ جس ہلاکت خیزی اور سفاکی کا مظاہرہ کیا گیا اور لاکھوں مرد و عورت ، ۃ اور بوڑھے گولیوں کا نشانہ بنے ، ہزاروں افراد کو پھانسی دی گئی یہاں تک کہ لارڈ رابرٹ ،بقول دہلی شہر کا منظر اس درجہ ہیبتناک اور لرزہ خیز تھا کہ گھوڑے بھی بدک رہے تھے تھنے پھلا رہے تھے کیونکہ پوری فضا بیماری اور بدبو سے لبریز تھی ، اس میں مسلمانوں پر مظالم ناسب کہیں زیادہ تھا اس لئے کہ انگریز اس بغاوت کو اسلامی جہاد تصور کرتے تھے اور بس یقین تھا کہ اس جنگ کے بانی اور رہنما مسلمان ہی ہیں۔ ایک انگریز مصنف کہتا ہے :

"اس سرکشی کو موجودہ مرحلہ میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام نہیں دیا جا سکتا یقیناً اس کا آغاز سپاہیوں سے ہوا لیکن بہت جلد اس کی حقیقت آشکار ہو گئی کہ یہ اسلامی بغاوت تھی۔"[۵]

ایک معاصر مورخ لکھتا ہے :

"ایک انگریز کا شیوہ ہو گیا تھا کہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا۔ ہر ایک سے پوچھتا ہندو ہے یا مسلمان ، جواب میں مسلمان سنتے ہی گولی مار دیتا۔"[۶]

ہنری ہملٹن اپنی کتاب LATE REBELLIONS IN INDIA AND OUR FUTURE POLICY ں جو جنگ آزادی کے صرف ایک سال بعد یعنی ۱۸۵۸ء میں لکھی گئی ہے ، کہتا ہے :

"میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بانی اور اصل محرک ہندو نہ تھے اور اب میں یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ یہ غدر مسلمانوں کی سازش کا نتیجہ تھا ہندو اگر وہ اپنی مرضی اور ذرائع تک محدود ہوں تو وہ کسی ایسی سازش میں شرکت نہ کر سکتے تھے نہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ (مسلمان) خلیفہ اول کے وقت سے لے کر موجودہ زمانہ تک یکسانیت کے ساتھ مغرور ، غیر روادار اور ظالم رہے ہیں ، ہمیشہ ان کا مقصد یہ رہا ہے کہ جس ذریعہ سے بھی ہو اسلامی حکومت قائم ہو اور عیسائیوں کے ساتھ نفرت کے خیالات کی نشوونما ہو ، مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہو سکتے اس لئے نہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ

---

۵ ماخوذ از ۱۸۵۷ء ، غلام رسول مہر بحوالہ ہندوستانی مسلمان ص ۱۴۵ ، ابوالحسن علی ندوی

۶ عروج سلطنت انگلشیہ ص۱۱۲ منشی ذکاء اللہ۔

ممکن نہیں[1]"

چنانچہ مسلمانوں پر انگریزوں کا نزلہ سب سے زیادہ گرا اور وہی ان مظالم کا سب سے زیادہ نشانہ بنے۔ ایک معاصر مؤرخ لکھتا ہے:

"ستائیس ہزار اہلِ اسلام نے پھانسی پائی۔ سات دن برابر قتل عام رہا اس کا حساب نہیں، اپنے نزدیک گویا نسل تیموریہ کو نہ رکھا، مٹا دیا، بچوں تک کو مار ڈالا عورتوں سے جو سلوک کیا بیان سے باہر ہے، جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے[2]"

جو لوگ زندہ بچ رہے ان پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے لئے مقدماتِ سازش قائم کئے گئے۔ ان میں مجاہدین آزادی کو طرح طرح کی جسمانی و رُوحانی اذیتیں دی گئیں۔ مسلمانوں کو کے کلیدی اور اہم مناصب سے ہٹا دیا گیا، ان پر معاش کے دروازے بند کئے گئے، ان اوقاف اور جائیدادوں کو ضبط کیا گیا اور انہیں معاشی و سیاسی حیثیت سے ذلیل و خوار بنانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ ساری کوششیں ناکام رہیں اور مسلمان اپنی تہذیب و تمدن مذہب و ایمان سے علیحدہ ہونے کے لئے تیار نہ ہوتے۔

---

[1] ماخوذ ہندوستانی مسلمان ص ۱۶۴، ۱۶۵، ابوالحسن علی ندوی

[2] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۴۵۴، سید کمال الدین حیدر

تحریک ریشمی رومال

اور

شیخ الہندؒ

یہ تحریک انگریزوں کے خلاف علمی جہاد کرنے اور ہندوستان سے انہیں نکال باہر کرنے کے لئے قائم ہوئی تھی اس تحریک کے سرخیل متعدد علماء اور دانشور تھے لیکن شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی شخصیت ان سب پر حاوی تھی

آپ ۱۸۵۱ء میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام ذوالفقار علی تھا جو انسپکٹر آف مدارس تھے۔ مختلف علماء سے درس لیا اور دینی علوم میں مہارت پیدا کی۔ آپ کا کارنامہ علمی دنیا میں کافی وزن رکھتا ہے۔ آپ نے، گیارہ کتابیں تصنیف فرمائیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ ادلہ کاملہ ۲۔ ایضاح الادلہ ۳۔ احسن القریٰ ۴۔ الجہد المقل ، ۵۔ افادات محمودیہ ۶۔ الابواب والتراجم ۷۔ کلیات شیخ الہند ۸۔ حاشیہ مختصر المعانی ۹۔ تصحیح ابوداؤد ۱۰۔ فتاویٰ ۱۱۔ ترجمہ قرآن پاک[1]

انگریزوں سے نفرت آپ کے دل و دماغ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ چنانچہ جب آپ کے سامنے ترک موالات کا استفتاء پیش کیا گیا تو آپ نے اپنے تین شاگردوں مفتی محمد کفایت اللہ مولانا سید حسین احمد مدنی، اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو جمع کر کے فرمایا کہ یہ فتویٰ آپ لوگ لکھیں ان حضرات کو تعجب ہوا کہ آپ کی موجودگی میں ہم کیا لکھیں تو فرمایا کہ:

"مجھ میں انگریزوں سے نفرت کا جذبہ اتنی شدت لئے ہوئے ہے کہ مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے کہ حدود کی رعایت ہو سکے گی اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا (اور

---

[1] تذکرہ شیخ الہند ص ۲۷-۱۸، از مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف کا دامن چھوڑ بیٹھو) اس لئے آپ ہی لوگ لکھیں[1]"

اس فتویٰ میں آپ نے مسلمانانِ عالم کی مظلومیت اور بے بسی اور انگریزوں کی چیرہ دستی کا حال لکھنے کے بعد فرمایا کہ جن لوگوں نے قرآن و سُنّت کا دامن تھام کر آزادی کے حصول کی جدّوجہد شروع کی ہے اور اعدائے اسلام کے ساتھ تعاون و موالات کو اعتقاداً و عملاً ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے وہ قابل مُبارکباد ہیں اور اس تحریک کی شرعی حیثیت قابلِ انکار نہیں ہے اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہی تقاضا ہوتا ہے کہ:

(۱) سرکاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کردے۔

(۲) ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کردے۔

(۳) صرف اپنی ملکی اشیاء اور مصنوعات کا استعمال کرے۔

(۴) سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے[2]

انگریزوں سے آپ کی اس سخت دشمنی کا اندازہ خود انگریزوں کو بھی تھا۔ چنانچہ سر جیمز گورنر یوپی نے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ:

"اگر اس شخص کو جلا کر راکھ کر دیا جائے تو وہ بھی اُس کوچہ سے نہیں اُڑے گی جس میں کوئی انگریز ہوگا۔"

اس نے ایک اور موقعہ پر کہا تھا کہ:

"اس شخص کی بوٹی بوٹی کر دی جائے گی تو ہر بوٹی سے انگریزوں کی عداوت ٹپکے گی[3]"

پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی کا یہ ریمارک بالکل درست ہے کہ:

"جس وقت انڈین نیشنل کانگریس حقوق طلبی کی جنگ لڑ رہی تھی، حضرت شیخ الہند اس حکومت کا تختہ ہی اُلٹ دینے کا نقشہ تیار کر رہے تھے[4]"

۱؎ سوانح قاسمی ص ۴۸، مولانا مناظر احسن گیلانی

۲؎ شیخ الہند مولانا محمود الحسن — حیات اور علمی کارنامے ص ۲۶۹، اقبال حسن خاں

۳؎ سوانح قاسمی جلد دوم ص ۴۸، مولانا مناظر احسن گیلانی۔ ۴؎ رسالہ برہان دہلی ستمبر ۱۹۴۸ء جلد ۲۱ شمارہ ۳

شیخ الہند نے ایک طرف مسلم نوجوانوں کو اسلام کے عقائد و افکار سے روشناس کرانے کے لئے اور الحاد و اباحیت کے حملوں سے انہیں محفوظ رکھنے کے لئے اسلامی و دینی مدارس کے قیام پر زور دیا اور سرحد میں اس طرح کی درس گاہیں قائم کیں تاکہ دینی علوم کی اشاعت ہو اور حکومت برطانیہ کے خلاف یہ ادارے پردہ اور کمین گاہ کا کام دیں[1] تو دوسری طرف آپ نے اندرونِ ہند اور بیرونی ممالک میں جگہ جگہ عسکری مراکز قائم کئے۔ دہلی کے علاوہ راندیر، پانی پت، لاہور، دین پور، امروٹ، کراچی، اتمان زئی، ترنگ زئی وغیرہ علاقوں میں رضا کاروں کی جماعتیں بنائیں۔ ان کے امیر مقرر کئے اور وقت مقررہ پر بغاوت کا منصوبہ بنایا[2] جب آپ کے خلاف ہندوستان میں کافی جاسوسی ہونے لگی اور یہاں رہ کر کام کرنا مشکل ہوگیا تو حجاز چلے گئے وہاں گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کی اور آزادی کی اس مہم میں امداد کی درخواست کی جسے اس نے قبول کرلیا۔ دوسری طرف مولانا عبید اللہ سندھی کابل میں یہی فریضہ سنبھالے ہوئے تھے انہوں نے امیر افغانستان سے ملاقات کی تو امیر حبیب اللہ خاں نے محدود و متعین راستوں سے مقررہ تاریخ پر ترکی کو حملہ کرنے کی اجازت دے دی۔ مولانا سندھی نے شیخ الہند کو اطلاع دینے کے لئے ایک ریشمی رومال پر خط لکھا جو انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا اور اس کی مناسبت سے پوری تحریک کا نام ریشمی رومال تحریک پڑ گیا۔

اس کے بعد سارا منصوبہ دھرا رہ گیا۔ جگہ جگہ بڑے پیمانہ پر گرفتاریاں ہوئیں اور ۱۹ رفروری ۱۹۱۷ء کی تاریخ، جو بغاوت اور انقلاب کی تاریخ مقرر کی گئی تھی، سے پہلے ہندوستان کے تمام انقلابی لیڈروں کو گرفتار کیا گیا اور ہر جگہ زبردست انتظام کیا گیا کہ کوئی ہنگامہ نہ ہونے پائے[3] چنانچہ مولانا حسین احمد مدنی، شیخ الہند، مولوی عزیز گل اور حکیم نصرت حسین وغیرہ کو مدتوں مالٹا کے قید خانے میں سختیاں برداشت کرنی پڑیں[4]

۳۰ رنومبر ۱۹۲۰ء کو آپ کی وفات ہوئی تو غسل دینے کے لئے جب تختہ پر لٹایا گیا تو

---

۱ تحریک ریشمی رومال ص ۱۶۱ — ۱۶۰ مولانا عبد الرحمٰن صاحب

۲ سرگزشت مجاہدین ص ۵۴ — ۵۵۳ ، غلام رسول مہر

۳ کابل میں سات سال ص ۷۸ مولانا عبید اللہ سندھی

۴ تفصیل کے لئے دیکھئے نقش حیات اور اسیر مالٹا از مولانا حسین احمد مدنی

پیٹھ بالکل سیاہ تھی اور اس پر ضرب کے نشانات تھے۔ رفقائے مالٹا نے اس وقت انکشاف کیا کہ یہ نشانات ان دنوں کے ہیں جب آپ مالٹا میں اسیر تھے۔ آپ پر دُرّے برسائے جاتے تھے لیکن حضرت نے انہیں وصیت کردی تھی کہ ان مصائب کا کہیں ذکر نہ ہو۔[۱]

اس تحریک کے بانی تو مولانا محمود الحسن ہی تھے لیکن آپ کے رکن رکین مولانا عبیداللہ سندھی تھے ان کے علاوہ دوسرے شاگردوں اور نیازمندوں کی ایک بڑی تعداد شریک عمل تھی۔ حاجی صاحب ترنگ زئی، مُلّا صاحب سنڈا کے وابستگان تحریک میں تھے۔ مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری، مولانا فضل ربی، مولانا فضل محمود، مولانا محمد اکبر کا شمار اہم ارکان میں تھا۔ مولانا عبدالرحیم رائے پوری، مولانا خلیل احمد صاحب، مولانا محمد احمد چکوالی، مولانا محمد صادق، شیخ عبدالرحیم سندھی، مولانا محمد ابراہیم راندیری، مولانا غلام محمد دین پوری مولانا تاج محمود، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم عبدالرزاق انصاری وغیرہ سب مخلصین بھی وابستگی اور مخلصانہ تعلق رکھتے تھے ان کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، نواب وقار الملک وغیرہ بھی آپ کے مشیر و معاون تھے۔[۲]

اس تحریک کی ناکامی سے قطع نظر اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ آزادی کی لہر تیز ہو گئی اور علماء و طالبانِ علم کی حمایت کھل کر اسے حاصل ہو گئی جو تحریک خلافت کی شکل میں صورت پذیر ہوئی۔

مسلمان اور غلامی۔ ان دونوں چیزوں کا یکجا ہونا محال ہے۔ مسلمان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ غلامی کے ماحول میں دین کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اسلام پر عمل اُسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان ساری بندشوں کو توڑ کر صرف خدا کا فرماں بردار بندہ بن جائے۔ اسلام غلبہ اور حکمرانی کے لئے آیا ہے دوسروں کی چاکری اور باطل نظاموں کے تحت جزوی اصلاحات کے لئے نہیں آیا، اسلام نے مسلمانوں کا مزاج یہ بنایا ہے کہ طاغوت کی حکومت کا انکار کیا جائے اور اسے کبھی برداشت نہ کیا جائے اور خدا کی حاکمیت کو سیاسی حیثیت سے عملاً قائم کرنے اور اس کے قانون کو زندگی کے ہر شعبہ میں جاری و ساری کرنے کی کوشش کی جائے

---

[۱] جلائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں ص ۶۳، مفتی انتظام اللہ شہابی

[۲] سرگزشت مجاہدین ص ۵۶ — ۵۵۵، غلام رسول مہر

مسلمانوں کی پوری تاریخ اسی کشمکش اور جد و جہد سے عبارت ہے۔ اس تحریک نے آزادی اور مذہب کے اس فلسفہ کو زیادہ نمایاں شکل میں عوام کے سامنے پیش کیا اور قید و بند کی صعوبتوں نے اس خاکے میں مزید رنگ بھر دیا۔

اس تحریک کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کا بانی و رہبر وقت کا شیخ طریقت اور عالمِ ربّانی ہے جس کے منہ میں ابوالکلام کی زبان ہے نہ ہاتھ میں شبلی کا قلم، اس نے انقلاب فرانس کی تاریخ پڑھی ہے نہ روسو اور مانٹسکو کے انقلاب انگیز لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کا شیرازہ حیات قالَ اللہُ و قالَ الرسول اور اس کی زندگی کا خمیر اتباعِ سُنّت نبوی ہے، وہ دیوبند کے ایک حجرے میں بیٹھ کر وقت کے عظیم ترین استعمار سے ٹکر لینے کا منصوبہ بناتا ہے اور باقاعدہ اس کے لئے تحریک قائم کرتا ہے اور اس راہ کی ساری آزمائشوں کا مقابلہ کرتا ہے۔

لیکن یہ سوال ایک مؤرخ کے سامنے بہرحال آتا ہے کہ اس تحریک کی ناکامی کے اسباب کیا تھے؟ اور کیا انقلاب کا یہ طریقہ کار رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے انقلابی طریقہ کار سے بالکلیہ مماثلت رکھتا ہے؟

تحریکِ خلافت

اور

مولانا جوہرؒ

اس تحریک کے رُوحِ رواں مولانا محمد علی جوہر تھے آپ انیسویں صدی کے آخر میں ایک زبردست مسلم لیڈر، اہلِ قلم اور پرُجوش خطیب، دردمند مسلمان اور سچے عاشقِ رسول اور اسلام کے دیوانے کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور مسلمانوں کی زندگی میں ہلچل پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے اندر مرنے مارنے کا جذبہ اور اپنی تہذیب وانفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد کرنے کا داعیہ اُبھار دیتے ہیں اور اپنی پوری زندگی اس راہ میں جھونک دیتے ہیں۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے آپ کی وفات پر یوں خراجِ عقیدت پیش کیا:

"ہاں کبھی وہ مسٹر محمد علی (آکسن) تھا، لیکن کیا اب وہ علوی شجاعت کے اندر غرق ہو کر صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں فانی ہونے والا انسان نہ تھا؟ یقیناً اس نے کبھی شیکسپئر اور ملٹن کے اشعار یاد کئے تھے، لیکن اب اس کی زبان پر قرآن مجید کی ربانی آیتوں کے سوا اور بھی کچھ تھا، کیا عجیب انجام ہوا اس شخص کا جو شیطانی راہوں پر سلوک کرنے کے لئے نیت کی نہیں بلکہ تجویز کی غلطی سے پڑ گیا، لیکن جذب کی قوت نے راہِ کفر کے اس سالک کو اسلام کے میدان کا مجذوب بنا دیا۔ وہ آکسن اور مسٹر بن کر جوان ہوا تھا، لیکن حاجی، حافظ، مولانا بن کر شہید ہو گیا۔"[۱]

عشقِ رسول اور تبلیغِ اسلام

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق کا یہ حال ہے اور خدا کی ذات پر کامل توکل اور اعتماد کا یہ عالم ہے کہ جیل میں سختیاں جھیل رہے ہیں اور سب سے بڑی لڑکی موت وحیات کی کشمکش میں

---

[۱] محمد علی — ذاتی ڈائری کے چند ورق ص ۲۰۱

مبتلا ہے لیکن ایسے موقعہ پر جو غزل کہتے ہیں اس میں باپ کی زبان سے یہ شعر بھی نکلتا ہے ؎

صحت تری ہمیں منظور ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل توجہ وہ واقعہ ہے جو مفتی فلسطین امین الحسینی صاحب نے ظاہر فرمایا ہے۔ کہ محمد علی شرکت موتمر کے لئے جب حجاز تشریف لے گئے تو ایک روز رات کو بہت دیر کے بعد امین الحسینی صاحب کا مسجد حرام کے اندر خانہ کعبہ کے پاس سے گزر ہوا تو دیکھتے کیا ہیں کہ اس تاریک رات میں غلاف کعبہ پکڑے ہوئے ایک شخص خانہ کعبہ میں صاحب خانہ سے مصروف راز و نیاز ہے۔ اس کی آواز بیٹھی ہوئی ہے، گریہ گلو گیر ہے، گردن سجدہ میں جھکی ہوئی ہے اور وہ گڑگڑا کر رو رو کر عرض کر رہا ہے کہ اے کارسازِ عالم مجھے تو جہنم میں جھونک دے، میری کسی آرزو کو پورا نہ کر لیکن ایک بار ان آنکھوں کے سامنے احیائے خلافتِ راشدہ کر کے وہ مبارک و مسعود زمانہ پھر واپس لادے جس کو کانوں نے سُنا ہے مگر آنکھیں جس کی دید سے اب تک محروم ہیں، ہندوستان کو آزادی عطا فرما تاکہ پنجۂ اغیار سے آزاد ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔

مفتی صاحب کا بیان ہے کہ میں حیرت سے یہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہا تھا، جب اس شخص نے اپنی پیشانی سجدے سے اُٹھائی تو دیکھتا کیا ہوں وہ تو زعیم مشرق محمد علی ہے جس کا نورانی چہرہ آنسوؤں سے تر ہے۔

جب خواجہ حسن نظامی نے انسداد آتش بازی کا پروپیگنڈہ اور تحریک شروع کی تو جوہر صاحب نے تن من دھن سے اس اصلاحی تحریک کا ساتھ دیا اور ہمدرد کے سب ایڈیٹر کو حکم دیا کہ خواجہ صاحب کے اس قسم کے تمام اشتہارات بلا معاوضہ شائع ہوں نیز دہلی خلافت کمیٹی کو خواجہ صاحب کے اس اصلاحی اقدام کی حمایت کے لئے وقف کر دیا، حتیٰ کہ خواجہ صاحب کی جدت آفریں طبیعت نے آتش بازی کے جنازے کی تجویز پیش کی تو اس کی بھی حمایت کی اور اس جلسے جلوس میں شریک ہوئے جو اس جنازے کو جمنا کے کنارے دفن کرنے گیا تھا۔[1]

مئی ۱۹۲۳ء میں جب بیجاپور جیل میں تھے تو انگریزی زبان میں اسلام کے موضوع پر

---

[1] سیرت محمد علی حصہ اول و دوم ص ۱۰۵ — ۱۰۲، رئیس احمد جعفری

کتاب لکھی – ISLAM THE KINGDOM OF GOD کے نام سے اور اس میں جذبہ تبلیغ کا اظہار اس طرح کیا:

"انگریزی ترجمۃ القرآن کے نسخوں کا پہنچنا میرے حق میں سرود بہ مستاں یاد دہانیدن کا مضمون ہوگیا۔ جن کرم فرمانے یہ تحفہ عنایت کیا تھا، انہیں میں نے خط میں لکھا کہ "سب سے بڑھ کر مسرت کا دن اور کون سا میرے لئے ہوگا کہ اس قید و بند سے رہائی پاتے ہی یوروپ پہنچ جاؤں اور وہاں کے ہر شراب خانے سے نہ سہی تو کم از کم ہر ہر پارک اور ہر ہر چوراہہ سے ان جنگ کے دیوانوں کو اس دین کی تبلیغ کروں جو اسلام کی آشتی اور امن کے اندر قومی جنگ وجدل کے نعروں کو یکسر فراموش کر دیتا ہے۔ اسلام کی حکومت اس عصبیت و تنگ نظری کی دشمن ہے جو قوم کو خلق کرتی رہتی ہے اور انسان کا کام تمام کرتی رہتی ہے۔ ہمارا اللہ ربّ العالمین ہے اس کے یہاں تفریق نہ عرب و عجم کی ہے نہ آریائی اور سیما طبقی نسلوں کی اور نہ اینگلو سیکسن اور ٹیوٹن قوموں کی۔"[1]

مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ جب ملحدانہ افکار و خیالات کے جنگل سے نکلے لیکن جوہر مرحوم کو اس کی خبر نہ ہو سکی اور انہیں حسب سابق دہریہ سمجھتے رہے تو جامعہ ملیہ کی پروفیسری کے لئے انہیں جو خط لکھا وہ قابل غور ہے:

"۱۴ر جنوری ۱۹۲۱ء

برادرم! السلام علیکم۔ اپنی عدیم الفرصتی کا اب کیا دکھڑا روؤں۔ آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں۔ اسی باعث مفصل خط لکھنے سے معذور رہوں اور مجملاً لکھنے کا غالباً یہ نتیجہ ہوگا کہ آپ میرے مفہوم کو نہ سمجھ سکیں گے بہرحال باقسمت یا نصیب کہ لکھتا ہوں۔

جی چاہتا تھا کہ آپ کو یہاں دیکھوں مگر علم سے زیادہ مذہب عزیز ہے اور ایک مسلمان کے مذہب کے متعلق اگر قومی مسلم یونیورسٹی میں شک و شبہ بھی کیا جائے گا تو ہم یہ کہہ کر پیچھا نہیں چھڑا سکتے کہ ہر شخص کا مذہب اس کا ذاتی معاملہ ہے جس سے اس دار العلوم کو کوئی تعلق نہیں اب تک عمداً میں نے فلسفہ کے سینیئر پروفیسر کی جگہ کے

---

[1] صدق جلد اول ع۳ یکم جون ۱۹۳۵ء

متعلق کوئی سفارش نہیں کی ہے چونکہ اُردو میں تعلیم دلانا منظور ہے اس لئے اور بھی آپ کی ضرورت ہے اگر تکلیف نہ ہو تو ایک دو دن کے لئے میرے مہمان بن کر یہاں کی دال روٹی کھائیے اور تمام معاملات کا تصفیہ کیجئے۔ اگر ہم دونوں ایک ہی بات پر راضی ہو گئے تو یقین ہے کہ دار العلوم کو آپ سے بیش قیمت مدد مل سکے گی ممکن ہے کہ آپ شروع ہی سے یہاں آنے سے انکار کرتے ہوں اور مذہب سے متعلق میرے اس قدر لکھنے کو بھی خواہ مخواہ کا دخل در معقولات تصور کریں لیکن مجھے تو پروپیگنڈہ کرنا ہے اس لئے تبلیغ ہی کا موقعہ دیجئے اور آجائیے بہرحال آپ سے نصاب و نظامِ تعلیمات کے متعلق مشورہ کرنا ہے اسی کے لئے آجائیے اب رخصت ہوتا ہوں والسلام

آپ کا قدیم نیاز مند محمد علی[1]

جواہرلال نہرو اپنی خود نوشت سوانح حیات میں ۱۹۲۳ء کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"اُن کی مذہبیت بے پناہ تھی اور میرے خیال میں حدود علم و عقل سے متجاوز اور میں مذہب سے کورا۔ لیکن میری کشش کی چیز تھی ان کی اخلاص مندی، ان کی زبردست قوت عمل اور ان کی طباعی و ذہانت۔ وہ بڑے ظریف تھے لیکن ان کے چبھتے ہوئے جملے دل آزاری کی حد تک پہنچ جاتے تھے۔ اور کتنے ہی دوست ان سے اسی وجہ سے روٹھ روٹھ گئے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی فقرہ انہیں سوجھ جائے اور زبان تک نہ آئے، دل ہی دل میں رہ جاتے پھر نتیجے جو کچھ بھی ہوں ہوا کریں۔ محمد علی کو عجیب و غریب ملکہ تھا کہ خدا کا ذکر وہ کانگریس کی قرار دادوں تک میں لے آتے تھے ...... میں ہمیشہ مخالفت کرتا اور اس وقت محمد علی میرے الحاد پر برس پڑتے تھے۔"[2]

---

[1] خطوط مشاہیر ص ۲۲۴، عبد الماجد دریابادیؒ

[2] مولانا محمد علی — شخصیت اور خدمات ص ۱۰۸ نظر برنی

تحریک خلافت کے اثرات

مولانا محمد علی جوہر نے تحریک خلافت چلائی تو ملک کا کونہ کونہ "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کے نعرے سے گونج اٹھا اور تمام مسلمانوں کے اندر ایک نئی بیداری اور تازگی عود کر آئی۔ دوسرے بھائی شوکت علی راجکوٹ کی جیل میں قید کئے گئے اور خود محمد علی بیجاپور دکن کی جیل میں۔ بیجاپور کے قیدی کی مقبولیت و مرجعیت کا یہ عالم تھا کہ اگر بے وقت اسے چھینک آجاتی تو اس کی بھی تار برقیاں دوڑنے لگتیں اور دم کے دم میں یہ خبر بھی ملک کی فضا میں گونج جاتی۔[1]

اس تحریک نے مسلمانوں کے اندر خود اعتمادی اور بیداری پیدا کر دی۔ وہ قید فرنگ سے آزاد ہو کر اپنی دُنیا آپ تعمیر کرنے پر آمادہ ہوئے۔ اس وقت جبکہ ہندوستان کے ہر فرد پر انگریزی تعلیم و تہذیب اور تمدن کا غلبہ ہو چکا تھا اور ہر شخص اس کے دام ہم رنگ زمیں میں گرفتار تھا، اس تحریک نے ان سے آزادی حاصل کرنے اور اپنے زور بازو پر اعتماد پیدا کرنے کا داعیہ اُبھارا۔ سرسید کے افکار و خیالات اور علی گڑھ کی نامعقولیت کو اس نے پارہ پارہ کر دیا اور عوام کے اندر ارفع و اعلیٰ خودداری اور خود اعتمادی کے خیالات پیدا کئے۔

پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست اور دُوَل متحدہ کی اسلام دشمنی سے مسلمانانِ ہند نے محسوس کر لیا کہ ایک ملت کی حیثیت سے ان کا وجود خطرے میں ہے اس لئے تحریک خلافت کے پرچم تلے تمام مسلمانوں نے میدان جہاد میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح اس تحریک میں پوری مسلم قوم کی شرکت ہوئی اور اس کا تعاون حاصل ہوا۔

مولانا محمد علی اور تحریک خلافت کے زیر اثر عالمی اسلامی اتحاد اور مسلمانوں کے اُمتِ واحدہ ہونے کا احساس اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔ مولانا نے ہندوستانی مسلمانوں کو عالم اسلام کے مسائل اور ان کی پریشانیوں کے لئے فکر مند بنا دیا اور خود اس کا سب سے بڑا نمونہ بنے۔ چنانچہ وفد خلافت جب لندن گیا اور حکومت برطانیہ کے سامنے اپنی بات پیش کی اور مسٹر لائڈ جارج نے لیت و لعل سے کام لیا تو برملا فرمایا:

"ہم پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی تھی کہ خلیفہ کی دُنیاوی طاقت برقرار رکھنے، مسلمانوں کے مقاماتِ مقدس پر اس کی نگرانی کو بحال اور ان پر قبضہ تسلیم کرانے کے معاملات

---

[1] محمد علی ــــ ذاتی ڈائری کے چند ورق حصہ اول ص ۱۰۵

کو اچھی طرح پیش کریں ہم نے وائسرائے اور مسٹر فشر کے سامنے یہ مسائل پیش کئے آپ سے یہ بھی کہنا ہے کہ ہم اپنے مذہبی معاملات کو ہر موقعہ پر اولیت دیں گے۔"[1]

اور نومبر ۱۹۱۴ء میں جب یورپ کی جنگ عظیم میں ٹرکی جرمنی کے مخالف کی حیثیت سے برطانیہ کے مقابل آگیا تو مولانا محمد علی نے کامریڈ میں ایک بڑے لمبے چوڑے مقالے میں (THE CHOICE OF TURKS) کے زیر عنوان جو ٹائمس لندن کے مقالہ کے جواب میں تھا، ترکی کی حمایت کی اور نتیجے کے طور پر کامریڈ بند کیا گیا اور خود مولانا نظر بند کر دیئے گئے۔

اس تحریک نے عوام اور مسلم علماء کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیا۔ چنانچہ خلافت اسلامیہ کے احیاء کے لئے ترک موالات کی جو مہم چلی تھی اس میں ہر طبقہ خیال کے علماء کرام ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ چنانچہ دیوبندی فکر کے مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، اہل حدیث طبقہ کے مولانا ثناء اللہ امرت سری، مولانا عبد الحکیم گیاوی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی، بریلوی جماعت کے مولانا سید محمد فاخر، بیخود الہ آبادی، سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل، مولانا عبد الماجد بدایونی معتدل طبقہ کے اور شمالی ہند کے قدیم مرکز اسلام سے تعلق رکھنے والے مولانا عبد الباری فرنگی محلی اور مولانا سلامت اللہ صاحب فرنگی محلی، مولانا آزاد سبحانی ناظم مدرسہ الٰہیات کانپور، علامہ سید سلیمان ندوی ناظم ندوۃ العلماء اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد حیدر بہاری الغرض ہندوستان کے اکابر علماء نے سالہا سال کے اختلافات اور گروہ بندیوں کو نظر انداز کر کے تحریک خلافت میں شانہ بشانہ کام کیا۔[2]

لیکن ۲ر مارچ ۱۹۲۴ء کو ترکی نے منسوخی خلافت کا اعلان کر دیا اور خلافت کمیٹی کی پوری عمارت دھڑام سے نیچے گر گئی۔ چورا چوری کے حادثے کے بعد گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک بند کر دی اور خود خلافت کمیٹی میں کمزوری اور نفاق پڑ گیا اور اس طرح یہ ساری مساعی بے نتیجہ ہو گئیں[3]۔ لیکن اس کے جو مثبت اثرات پوری قوم اور ملت پر مرتب ہوئے ان کا انکار کرنا کسی شخص کے لئے ممکن نہیں ہے۔

---

[1] معارف اعظم گڑھ جنوری ۱۹۵۳ء، محمد علی کی یادیں، سید صباح الدین عبد الرحمٰن

[2] تحریک خلافت، ص ۱۵۹، قاضی عدیل عباسی۔

[3] علی برادران ص ۳۰۰، سید ریاض حسن کا مضمون تحریک خلافت۔

مولانا کی اسلام پسندی اور عقیدہ ایمانی

مولانا محمد علی جوہر کے متعلق دور جدید کی اسلامی تحریک کے بانی نے کتنی زبردست بات کہی تھی۔ انہوں نے آپ کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مجھے آج تک مسلمانوں میں کوئی ایسا لیڈر نظر نہیں آیا جو سیاسی بصیرت کے ساتھ گہرا دینی جذبہ بھی رکھتا ہو اور اپنی دینداری سے اپنی تحریک کے کارکنوں میں بھی دینی روح پھونک سکتا ہو:

"محمد علی کا سا زعیم غلام آباد ہندوستان نے شاید کوئی نہیں پیدا کیا۔ وہ گدائے بے نوا تھا، لیکن آغا خاں اور مہاراجہ محمود آباد اس کے حضور میں جُھک کر آتے تھے۔ وہ اقلیت کا ایک فرد تھا، لیکن اکثریت کا سب سے بڑا لیڈر اُس کی جیب میں تھا اور پٹیل، موتی لال، جواہر لال، راجندر پرشاد وغیرہ تو اس سے دوسرے ہی درجے پر تھے۔ وہ ایک غلام ملک کا باشندہ تھا، لیکن دُنیا کی سب سے بڑی سامراجی حکومت اس سے ڈرتی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے انگریزی دور میں کم از کم وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل کا ممبر تو بن ہی سکتا تھا لیکن ان مناصب عالیہ پر اُس نے کبھی نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا گوارا نہ کیا۔ اس کی زندگی کا مقصد منہاجِ خلافتِ راشدہ پر خلافت کا قیام تھا وہ پابندی سے نماز پڑھتا تھا، پابندی سے روزے رکھتا تھا اور ذاتِ رسالتمآب سے اس کے عشق اور شیفتگی کی یہ کیفیت تھی کہ ـــــ جب نام ترا لیجئے تب اشک بھر آوے، اس کی دوستی بھی اللہ کے لئے تھی، اور دشمنی بھی اللہ کے لئے۔ اسی لئے وہ دوستوں کو دُشمن اور دشمنوں کو دوست بناتا رہتا تھا وہ بغاوت کے جرم میں جیل بھی گیا اور اس جرم میں پھانسی کا مشتاق بھی رہا، خود ہی کہتا ہے ؎

مستحقِ دار کو حکمِ نظر بندی ملا ــــ کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی"[۱]

مولانا محمد علی ایک جگہ لکھتے ہیں:

"کیا مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ بنئے بن جائیں، کیا اقتصادی حالت درست ہونے سے مسلمانوں کی حالت سدھر جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کفر آموز حالت میں مبتلا ہو

۱؎ علی برداران ص ۲۳، مضمون مولانا محمد علی ــ ایک پُرانی داستان از مولانا مودودیؒ

مگر اصل چیز جو توجہ کے قابل ہے وہ روحانی اور دینی تربیت ہے۔ جب اسلام کی تنظیم سیکھ گئے تو بنئے بقال کیا یوروپ اور امریکہ کے تجار بھی تمہاری ٹھوکریں کھائیں گے۔

طریقہ تجارت اسلامی ہونا چاہیئے یعنی سُنّتِ محمدیہ کی متابعت کرنی چاہیئے نہ کہ سُنّتِ مالویہ کی، میں بائیکاٹ کا سخت مخالف ہوں مگر ایک بائیکاٹ کا زبردست حامی ہوں وہ سود کا بائیکاٹ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی مسلمان ایک پیسہ بھی کسی سے سود نہ لے اور اسی طرح ایک کوڑی بھی کسی کو نہ دے[۱]۔"

ایمان کے تقاضوں کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"ایک مسلمان کے ایمان کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ وہ کچھ خاص نظریات اور عقائد میں ایمان رکھے اور ان کے مطابق زندگی گزارے —— بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جبر کو استعمال کئے بغیر ہر ممکنہ قوت اس امر کے لئے استعمال کرے کہ دوسرے لوگ بھی اپنی تصورات کے مطابق زندگی گزاریں۔ قرآن پاک میں اس چیز کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول سے تعبیر کیا گیا ہے اور نبی اکرمؐ کی بہت سی احادیث بھی اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔ ایک مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنے بھائیوں پر ذمّہ دار نہیں ہوں اس لئے کہ خود اس کی اپنی نجات کا انحصار اس امر پر ہے کہ وہ دوسروں کو اتباعِ حق کی ترغیب دے، نیکی کا حکم کرے اور اُن کو بُرائی سے روکنے کی جدّ وجہد کرے[۲]۔"

قرآن کے اصول تبلیغ اور احکام اسلام کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میں کہتا ہوں اور سب لوگ اس کو سمجھ لیں کہ اسلام دین فطرت ہے اور جو اس سے ذرہ برابر بھی ہٹا وہ گمراہ ہوا۔ اس میں کسی کی تخصیص نہیں خواہ مہاتما گاندھی ہوں یا مولانا شوکت علی ہوں، خواہ مصطفیٰ کمال ہوں جو لادینیت اور لاطینیت پھیلا رہے ہیں یا شاہ امان اللہ اور ان کی ملکہ ثریا ہوں جو پردہ کو اُٹھا رہے ہیں اور ہاتھ کھلے

۱؎ کانگریس کی تعمیر میں مسلمانوں کا حصّہ، ہمدرد ۲۵ ستمبر ۱۹۲۶ء

۲؎ مقدمہ کراچی میں بیان، منتخب تقاریر و تحریرات (انگریزی) ص ۲۲۳

رکھنے کا فیشن اختیار کر رہے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ہندوستان اسلام کے جھنڈے کے نیچے آجائے گا اور سب لوگ مسلمان ہوں گے لیکن جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ اس قسم کی تبلیغ سے جیسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرنے کا حکم ہوا تھا وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ اور یہی بہتر ہے۔ آج جو لوگ ہمارے دشمن ہیں، کل وہ دوست ہو سکتے ہیں، قرآن کا ارشاد بھی یہی ہے[1]۔

شاعری کے چند نمونے

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
پیغام ملا تھا جو حسین ابن علیؓ کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے
کیا غم ہے جو ہے ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

—+—

روزِ ازل سے ہے یہی اک مقصدِ حیات
جائے گا سر کے ساتھ ہی سودائے کربلا
مطلب فرات سے ہے نہ آبِ حیات سے
ہوں تشنۂ شہادت و شیدائے کربلا

کانگریس سے علیحدگی

تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور وہ ہی گورنمنٹ کے مظالم اور تشدّد کا زیادہ شکار ہوئے۔ موپلا نے مالابار میں انگریزی حکومت کے خاتمہ کے لئے جرأت مندانہ قدم اُٹھایا اور بُری طرح کچلے گئے۔ جب یہ تحریک شباب پر تھی اور انگریزوں کے قدم ڈگمگا رہے تھے اس موقعہ پر صوبہ متحدہ میں چورا چوری کے مقام پر فساد ہوا اس پر گاندھی جی کی تجویز کے مطابق کانگریس کی مجلس عاملہ نے بردولی میں ایک رزولیوشن پاس کر کے سول نافرمانی کی تحریک کو معطل کر دیا جس سے مسلمانوں کو شدید صدمہ

---

[1] از قولِ حق، مطبوعہ ہمدرد دہلی ۲۶ دسمبر ۱۹۲۸ء۔

ہوا اور کانگریس سے ان کی بے اطمینانی اور بے چینی میں مزید اضافہ ہوگیا۔

تحریک ترک موالات ختم ہوئی تو ہندوؤں کی طرف سے شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں شروع کی گئیں اس طرح ملک میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ انڈیا آفٹر ۱۹۲۶ء کے ہندو مصنفین لکھتے ہیں:

"جب مہاتما گاندھی کے ہاتھوں عدم تعاون کی تحریک ختم ہوئی تو ملک کے مختلف حصوں میں فسادات شروع ہو گئے۔ اس سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے دلوں میں افتراق پیدا ہوا۔ ہندوؤں کے شدھی اور سنگٹھن کے پروگرام نے بھی مسلمانوں کو ہندوؤں کا مخالف بنا دیا۔" (ص ۴۲۸)

ہندوؤں کا مشہور لیڈر بال گنگا دھر تلک نے شیواجی کو اپنا قومی ہیرو قرار دے کر شیواجی ڈے اور شیواجی گنپتی کی تقریبیں منانا شروع کر دیں اور یہاں تک کہنے سے باز نہ آیا کہ:

"شیواجی نے افضل خاں کو دوسروں کی بھلائی کے لئے نہایت اچھے ارادے سے قتل کیا تھا اگر ہمارے گھر میں چور گھس آئیں اور ہماری کلائیوں میں ان کو بھگانے کے لئے کافی طاقت نہ ہو تو ہمیں بلا جھجک انہیں بند کر کے زندہ جلا دینا چاہیئے[۱]۔"

ایک طرف یہ جارحانہ حملے تھے، دوسری طرف مسلمان لیڈروں میں یہ احساس ابھرنے لگا کہ ہندو لیڈر جن کے سربراہ گاندھی جی تھے، فسادات کی روک تھام کے ضروری اقدامات میں قاصر رہے اور انہوں نے اس عزم و حوصلہ اور جدوجہد اور جان و مال کی بازی لگا دینے کا اظہار نہیں کیا جس کی توقع اور ضرورت تھی، اکثریت اور طاقت میں ہونے کی وجہ سے ان کے لئے اس کا امکان تھا کہ وہ مکمل غیر جانب داری اور اپنی شدید بیزاری کا اظہار کر کے اس پھیلی ہوئی آگ کو روک دیتے جو ملک کے امن و اتحاد کی فضا فنا کر رہی ہے[۲]۔ پھر اس کے بعد ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ

۱۔ ماہنامہ فکر و نظر اسلام آباد اگست ۱۹۸۲ء، قیام پاکستان کے محرکات بحوالہ ہسٹری آف انڈیا آفٹر ۱۹۲۶ء از مہاجن و سیٹھی جلد دوم ص ۲۴۶۔

۲۔ ہندوستانی مسلمان ص ۱۷۷، سید ابوالحسن علی ندوی

سامنے آئی تو تمام مسلم لیڈروں کی آنکھ کھل گئی اور انہیں صاف نظر آگیا کہ کانگریس دراصل انگریزوں کے زیر سایہ رہ کر ان کی تہذیب وتمدن کو فنا کرکے ان کی "شدھی" کرنا چاہتی ہے چنانچہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جن کی زندگی آزادی وحریت کے حصول میں اور کانگریس کو ہردلعزیز بنانے میں صرف ہوئی تھی لیکن انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے مفاد سے کبھی آنکھ نہ بند کی تھی، باوجود اپنی بیش بہا قربانیوں اور جان توڑ مساعی کے کانگریس کے رویہ اور عزائم سے مایوس ہوکر اس سے علیحدہ ہوگئے۔

تحریک خاکسار

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان اپنا اقتدار، حکومت اور سطوت وحشمت کھو دینے کے بعد بھیڑوں کا گلہ بن گئے تھے ان کے اندر سے وقار، خود اعتمادی، نظم وضبط، شوکت وسطوت اور دین سے تعلق اور خدا سے محبت کا جنازہ اُٹھ گیا تھا وہ احساس کہتری کا شکار ہو گئے تھے اور ہر فکر اور نظریہ کا لقمہ تر ثابت ہوتے تھے، خاکسار تحریک دراصل اسی سستی و کاہلی، بیزاری و احساس کمتری اور اضمحلال و پژمردگی کو ختم کرنے کے لئے اٹھی تھی۔ وہ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی چاہتی تھی انہیں عزت وحشمت کے اسی بام تک پہنچانا چاہتی ہے جس پر آج سے چودہ سو سال پہلے یہ قوم فائز تھی۔[1]

عنایت اللہ خاں مشرقی اس تحریک کے بانی اور قائد اول تھے۔ ۲۵ راگست ۱۸۸۸ء کو اچھرہ (لاہور) میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی اس کے بعد تقریباً ۵ برس کیمبرج یونیورسٹی انگلستان میں مختلف علوم وفنون میں مہارت پیدا کرتے رہے۔ مشرقی علوم عربی وفارسی کی تعلیم آپ نے وہیں سے حاصل کی۔ اس کے بعد مستشرقین کی عالمی کانگریس کے ممبر بنائے گئے۔ اس طرح آپ نے ہندوستان اور انگلینڈ دونوں جگہوں پر زبردست تعلیمی اور علمی ریکارڈ قائم کئے۔ ہندوستان واپسی کے بعد ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۰ء تک شعبہ تعلیم میں اسسٹنٹ سکریٹری کے سرکاری عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۲۴ء میں مشہور زمانہ کتاب تذکرہ شائع کی جس میں قرآن کی جدید اور سائنسی طرز پر تشریح کی گئی تھی اور اس میں تمام سابقہ تفاسیر سے اختلاف کیا گیا تھا یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی سنی اور شیعہ دونوں مکتب فکر کے علماء نے مل کر مخالفت کی۔ اس کتاب میں غلبہ وحکمرانی کے حصول پر زور

۱۔ Weekly Radiance Vol. III No. 24. 24 Sep. 1943

دیا گیا تھا اور مسلمانوں کو یورپ کی مادی تحریکوں کے انداز میں انقلاب لانے کی تلقین کی گئی تھی یہی وجہ ہے کہ علماء کی مخالفت کے باوجود اس کتاب کو نوجوان نسل نے بہت سراہا۔

۱۹۳۱ء میں علامہ عنایت اللہ مشرقی نے تحریک خاکسار کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لئے جرمنی کی فاشزم کو اپنے سامنے بطور نمونہ رکھا۔ خاکی رنگ کا لباس اور داہنے بازو پر اخوۃ کا بیج اور ہاتھ میں بیلچہ ان کا شعار قرار پایا۔ خاکسار فارسی الفاظ "خاک اور سار" کا مرکب ہے جس کا مطلب ناچیز، ہیچ اور حقیر کے ہیں مطلب اس کا یہ تھا کہ یہ تحریک اور اس کے کارکنان انسانیت کے مخلص اور بے لوث و بے غرض خادم ہیں اور قوت وسطوت کا استعمال انسانوں کی بھلائی کے لئے کیا جائے گا۔[۱] اس تحریک کی تعلیم و تبلیغ کے لئے علامہ مشرقی نے اپنی زندگی وقف کردی۔ اس تحریک کے خاص ہمنوا اور کارکن سر سید رضا علی، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، آغا غضنفر علی شاہ، سر سکندر حیات خاں، مولوی سید مرتضیٰ خاں، خان بہادر شیخ فضل حق پیر چھ اور مولانا ظفر علی خاں تھے۔[۲]

خاکسار تحریک مسلمانوں ہی میں محدود نہ تھی بلکہ اس تحریک کے ممبر یہودی، عیسائی، برہمو سماجی اور وہ تمام لوگ بن سکتے تھے جو خدا اور مذہب پر یقین رکھتے تھے۔ اس تحریک کا خاص نشان نظم وضبط، فوجی تنظیم، اور محنت و مشقت تھا، بلا لحاظ مذہب و ملت تمام فرقوں اور جماعتوں کے یہ خادم تھے۔ یہ اتحاد اور وحدت انسانیت کے داعی تھے۔ عروج کے زمانے میں اس کے کارکنوں کی تعداد تقریباً پندرہ لاکھ تھی لیکن ۱۹۴۷ء میں یہ تعداد گھٹ کر بیس ہزار تک رہ گئی تھی۔[۳] یہ تحریک تشدد اور دہشت گردی پر یقین نہ رکھتی تھی لیکن جب اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق انہیں ہتھیار اٹھانے میں بھی کوئی باک نہ تھا ۲۷ اگست ۱۹۶۳ء کو علامہ مشرقی کا انتقال ہوگیا لیکن آج بھی ہند و پاک کے بعض علاقوں میں اس کے وفادار کارکن نظر آتے ہیں۔

۱۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۴ ص ۹۱۶

۲۔ Studies in Islam Vol. VI No. 1, Jan. 1969. by V.B.Mathur P.28

۳۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۴ ص ۹۱۶

اس تحریک کے بنیادی اصول

(۱) خدائے ذوالجلال پر مکمل ایمان، چاہے وہ یہودیت کے مطابق یہوداہ ہو، پرانوں کے مطابق پرم آتما ہو، عیسائیوں کے مطابق عقیدہ تثلیث ہو، بدھسٹوں کا خدا پھایہ (PHAYA) ہو یا مسلمانوں کا اللہ ہو۔ خدائے مطلق کا یہ تصور ہی اس تحریک کا بنیادی عقیدہ ہے۔ ہر کارکن تحریک یہ سمجھتا ہے کہ خدا کی آنکھیں اس کے تمام اعمال و حرکات کو دیکھ رہی ہیں۔ اسے ایک روز مرنا ہے اور خدا کے حضور پہنچ کر اپنے کئے کا حساب دینا ہے۔ اسی لئے وہ اسی سے محبت کرتا، اسی کی عبادت و پرستش کرنا، اسی سے عقیدت کا اظہار کرتا اور صرف اسی سے خوف کھاتا ہے۔

(۲) اپنے عقیدے کے مطابق رسول کی مکمل اطاعت، چاہے وہ کرشنا ہوں، بدھا ہوں موسیٰؑ ہوں، عیسیٰؑ ہوں یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ صرف زبانی اطاعت ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کی تعلیمات، اعمال اور سارے کام کی اتباع کرنی ہے۔

(۳) تیسرا بنیادی اصول اس تحریک کا یہ ہے کہ تمام کارکنان اپنے سالار کے مضبوط و مستحکم وفادار، غیر مشروط متبع اور کامل پیرو کار رہوں گے اس اتباع و اطاعت میں کوئی شرط ملحوظ نہ ہو گی۔[۱]

فرائض

(۱) ایک خاکسار کو اپنے مذہب کی مخلصانہ پیروی کرنی چاہیئے اور دوسرے مذاہب سے اسے سروکار نہ ہونا چاہیئے۔

(۲) وہ ہمیشہ خاکی وردی پہنے۔ اس سے اُمّت کے اندر وحدت اور بھائی چارگی پیدا ہو گی۔

(۳) اسے ہمیشہ بیلچہ اپنے ساتھ رکھنا چاہیئے اس سے بہتیرے فوائد ہیں۔

(۴) خاکی ڈریس پر دائیں بازو کے اوپر اخوۃ کا بیج ہمیشہ لگاتے۔ اس کا مقصد ہے کہ یہ شخص عالمی اخوت کا پیامبر ہے اور عوام اسے اپنا بھائی تصور کریں۔

---

[۱] The spirit of Khaksar Movement by Agha Saiyed Ghazanfar Ali Shah F. No. 74/4/1940.

(۵) خاکسار اپنے مقامی سالار کے ساتھ روزانہ کم از کم پندرہ منٹ تک پریڈ، مارچ اور ورزش کرے۔ اس سے وہ ہمیشہ چاق و چوبند اور خدمت خلق کے لئے مستعد رہیں گے۔

(۶) اور ہر خاکسار روزانہ اجتماعی بہبود سے متعلق کوئی نہ کوئی خدمت ضرور انجام دے اور اس کی اطلاع اپنے کمانڈر کو ضرور دے۔

قوانین

(۱) ہر خاکسار جتنے دوست بنا سکتا ہو، بنانے کی کوشش کرے۔

(۲) وہ ہمیشہ متواضع اور خاکسار بن کر رہے اور دوستوں کا دل جیتنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

(۳) وہ کسی بھی مذہب یا سیاست کے متعلق بحث و مباحثہ سے پرہیز کرے۔

(۴) وہ جھگڑوں اور تنازعات سے دامن کش رہے۔

(۵) وہ کسی شخص کے خلاف نفرت نہ رکھے اور وحشیانہ سلوک سے پرہیز کرے۔

(۶) وقت اور پیسہ کی بربادی کی کسی خاکسار کو اجازت نہیں دی جا سکتی۔

(۷) وہ اپنی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرے اور اس کی مشق و ممارست کرے۔

(۸) ہر خاکسار کو وفا شعار، وقت کا پابند اور سچا ہونا چاہیئے۔

(۹) خاکساروں کے درمیان سلام کرنے کا انداز فوجی ہوگا۔

(۱۰) ہر خاکسار کو خرید و فروخت کے تعلقات خاکسار ہی سے رکھنا چاہئیں اور کم سے کم منافع لینا چاہیئے

(۱۱) خاکسار کو خاموش طبع، سنجیدہ اور ہوشیار ہونا چاہیئے۔

(۱۲) اسے ہر بس سمع و طاعت کے لئے مستعد رہنا چاہیئے۔

(۱۳) کسی خاکسار کی کمزوری اور اضمحلال پر دوسرے خاکسار کو جز بز نہ ہونا چاہیئے۔

(۱۴) اسے عوام سے یا خدمت خلق سے کوئی امید اور توقع وابستہ نہ کرنی چاہیئے۔

(۱۵) اسے تمام احسانات کے بوجھوں سے سبکدوش ہونا چاہیئے الآیہ کہ وہ اس کا بہت قریبی رشتہ دار ہو، خاکسار ساتھی سپاہی ہو یا تحریک کا بڑا افسر ہو اور کوئی چیز بلا قیمت نہ لینی چاہیئے۔[۱]

اس تحریک نے بلا قید و شرط اطاعت پر زور دیا اور قائد تحریک کی حیثیت رسول

---

[۱] Studies in Islam Vol. VI No. 1, Jan. 1969. P. 30-32

کی قرار دی۔ اس تحریک کے نزدیک قرآن پاک میں رسول کی اطاعت کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے مراد ان کی اطاعت بحیثیت امیر جماعت ہونے کے ہے۔ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی اپنے ایک خطاب میں فرماتے ہیں :

"اطاعت رسول کے معنیٰ رسول کے وقتی، زبانی، ہنگامی، مصلحتی، فوری اور بالمشافہ احکام کی تعمیل بحیثیت اُمت کے زندہ امیر ہونے کے ہے اس کے سوا حتماً اور لازماً اور قاطبتہً کچھ نہیں۔ ہاں لیکن آج رسولوں کا زمانہ مدت ہوئی گزر چکا، نبوت پر مہر لگ چکی۔ قانون خدا مکمل اور مفصل ہو چکا، سب رسول جو کسی زمانہ میں اُمتوں کے زندہ اور ناطق امیر تھے گزر چکے سب مَاتَ اور قُتِلَ کے ماتحت آ چکے۔ اب رسولوں کے بعد انسانی اُمتوں میں جماعت کے قیام کی کوئی صورت ماسوا اس کے نہیں کہ ان کے بعد بھی ایک زندہ امیر ہر وقت موجود ہو جس کے منہ سے نکلے ہوئے حکم اسی شدت سے مانے جائیں[۱]"

پھر اسی خطاب میں آگے چل کر کہتے ہیں :

"الغرض مسلمانوں کا امیر امیر ناطق ہے، اُمت کی ہر گرفت سے آزاد ہے اس کا معاملہ صرف خدا اور رسول سے ہے۔ صرف خدا اور رسول ہی اس سے نبٹ سکتے ہیں اس کو چاہیئے کہ مشورہ کرے، لیکن خود خدا کی مانند لَا یُشْرِكُ فِی حُكْمِهٖ اَحَدًا کا مصداق ہے۔ لاشریک حاکم ہے، صرف اللہ، شریعتِ رسول، سُنت کا پابند ہے اور وہ پابندی بھی اُمت کی رائے سے نہیں خود اس کی اپنی تمیز سے ہے[۲]"

علامہ موصوف نے قوم کے نونہالوں کی تربیت اور اپنے سپاہیوں کی ٹریننگ اس انداز میں کی کہ اسلام بس غالب بن کر رہنے کا نام ہے۔ اسلام و ایمان کی منتہا غلبہ اور حکمرانی ہے اور تمام اصول و احکامِ اسلام کا مقصد و منشا بھی یہی ہے۔ تذکرہ میں لکھتے ہیں :

"جہاں فتح و ظفر کا پرچم لہرا رہا ہے، جہاں ایک قوم کو دوسرے گروہ پر غلبہ حاصل ہو رہا ہے، جہاں ایک طرف عجز و بے بسی اور دوسری طرف قوت و استیلا۔ قائم

---

[۱] مولوی کا غلط مذہب ص ۱۰

[۲] " " ص ۲۰ عنایت اللہ مشرقی

ہے وہیں ایک قوم انبیاء کے خدا کے ہاں سے لائے ہوئے مشترک قانون کی صحیح معنوں میں مومن ہے۔ خدا کے قانون کی پہلی اور آخری دفعہ یہی ہے کہ ایمان بہر نوع فتح و نصرت کے مترادف اور کفر بہر حال شکست اور زوال کے ہم معنیٰ ہے[۱]"

اسی کتاب کے دیباچے میں آگے فرماتے ہیں:

"اسلام کا اس دنیا میں منتہائے وحید الطرز اور غالب بن کر رہنا ہے اور اسی واحد غرض و مطلب کے لئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے تھے۔ قرآن کے طول و عرض میں رسول کے بھیجنے کی اس کے سوا اور کوئی غرض کہیں نہیں بتلائی گئی ہے[۲]"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس غرض بعثت کو تکرار اس طرح بیان کرتے ہیں:

"اسلاف انبیاء سے قطع نظر خود نبی آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واحد مطمح نظر روئے زمین پر غلبہ حاصل کرنا اور امت عرب کو بقا و دوام کے معراج پر پہنچانا تھا یہی ان کے مبعوث ہونے کی واحد اور صحیح غرض تھی (هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ) نہیں بلکہ اسی غالب ہو کر رہنے کے علم کو حاصل کر کے اس پر عامل ہو جانا عین اسلام اور عین دین بلکہ تمام اسلام اور تمام مذہب تھا[۳]"

بہرکیف اس تحریک نے مسلمانوں کے اندر جوش و ایثار، قربانی، فوجی و عسکری تنظیم کی ضرورت اور افادیت کا احساس دلایا۔ نوجوان غلبۂ اسلام کے لئے مرمٹنے کے لئے تیار ہوئے اور اس تحریک سے منسلک ہو کر بے بہا قربانیاں دیں۔ اس تحریک نے غیر معمولی شہرت اور ترقی حاصل کی یہاں تک کہ ایک دور میں مسلمانوں کے اندر اس کا ڈنکا بجتا تھا۔ ہر جگہ خاکی وردی، بیلچہ اور اخوت کا نیج نظر آتا تھا۔ قوم کے اندر عصبیت اور حمیت جاگی اور اقتدار سے ٹکر لینے کی جرأت اور ہمت پیدا ہوئی لیکن ان سب کے باوجود یہ تحریک اپنی موت آپ مرگئی۔ آزادی کے بعد علامہ مشرقی نے اس تحریک کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور پاکستان میں ۱۹۴۸ء میں اسلام لیگ کی بنیاد ڈالی تاکہ سیاسی اغراض و مقاصد

۱۔ دیباچہ تذکرہ اردو ص ۱۷

۲۔ تذکرہ ص ۱۸۲ ۳۔ تذکرہ ص ۷۰

روئے کار لائے جا سکیں اور اسی تحریک کے فروغ و استحکام میں اپنی زندگی گزار دی۔

اس تحریک کی ناکامی کی ایک بنیادی وجہ علامہ مشرقی کے وہ مادیت زدہ خیالات تھے[1] جنہیں انہوں نے اپنی کتاب تذکرہ اور خطبوں اور ترجمانوں میں بیان کئے اور جن کی بنا پر علمائے اسلام نے متفقہ طور پر اس تحریک اور اس کے گمراہ کن قائد کے خلاف فتویٰ دے دیا اور ان کے خیالات کا خلافِ اسلام ہونا ثابت کیا، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس تحریک نے مسلمان نوجوانوں کے اندر اپنی دنیا آپ تعمیر کرنے کا داعیہ اُبھارا۔

---

[1] دیکھئے "خاکسار تحریک — مذہب و سیاست کی روشنی میں" منظور نعمانی

اور

اسلامی سیاست از مولانا مودودیؒ

تحریک اہل حدیث

سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے جہاد و تنظیم اور شہادت و قربانی کی جو لازوال مثال قائم کی تھی وہ ان کے جانشینوں نے پوری آب و تاب کے ساتھ باقی رکھی اور جنگ آزادی ۱۹۴۷ء تک انگریزوں اور سکھوں کے خلاف رزم آرا رہے۔ ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۸ء تک کا دور مولانا نصیر الدین منگلوری اور شیخ محمد پھلتی کا دور ہے اس پورے عرصے میں تقریباً بائیس حملے کیے گئے اور سکھوں کا ناطقہ بند کرنے کی کامیاب کوشش ہوتی رہی۔ دوسری طرف سندھ اور افغانستان کے علاقے میں سید نصیر الدین دہلوی نے ۱۸۳۷ء سے ۱۸۳۹ء تک جہاد کا علم بلند رکھا اور چار بار دشمنوں سے ٹکر ہوئی۔ ۱۸۴۵ء سے ۱۸۹۶ء تک مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی، مولانا عبد اللہ اور مولانا عبد الکریم کا زریں دور ہے، اس عرصے میں دس بار مجاہدین کو شکست ہوئی اور پندرہ بار دشمنوں کو شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔ کسی معرکہ میں مجاہدین کی تعداد صرف ۶۰ تھی اور کسی معرکہ میں ڈیڑھ ہزار سے بھی متجاوز تھے۔ کبھی مولانا عنایت علی نے معرکہ کی قیادت کی کبھی مولوی منصور علی نے، کبھی مولانا عبد اللہ عظیم آبادی نے، اور کبھی مولوی شریعت اللہ نے، اور کبھی مولانا ولایت علی نے کمانڈر کی جگہ سنبھالی۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور صلح و جہاد نشیب و فراز پر مشتمل ہے اس عرصے میں امیر نعمت اللہ، امیر رحمت اللہ، مولانا محمد شبیر اور مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی مختلف معرکوں میں رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی بالاکوٹ میں شہادت کے بعد یہ تحریک جہاد سرد نہیں پڑ گئی۔ اسے ضرب کاری تو ضرور لگی لیکن دشمنان اسلام کے خلاف معرکہ آرائی جاری رہی، اسلامی نظام کے قیام کی جد و جہد مدھم نہ ہوئی بلکہ جنگ آزادی تک مسلسل مختلف رہنما اس کی قیادت کرتے رہے اور خون کے چھینٹوں سے گلشن امت اور دبستانِ اسلام کی آبیاری کرتے رہے۔ انہی مساعی جمیلہ کو دیکھ کر مولانا

سید سُلیمان ندوی نے اپنے مخصوص انداز میں یوں خراج تحسین پیش کیا:

"سید صاحب کے خلفاء ہر صوبہ اور ولایت میں پہنچ چکے تھے اور اپنے اپنے دائرے میں تجدید، اصلاح اور تنظیم کا کام انجام دے رہے تھے، مشرکانہ رسوم مٹائے جا رہے تھے۔ بدعتیں چھوڑی جا رہی تھیں، نام کے مسلمان کام کے مسلمان بن رہے تھے، جو مسلمان نہ تھے وہ بھی اسلام کا کلمہ پڑھ رہے تھے، شراب کی بوتلیں توڑی جا رہی تھیں، تاڑی اور سینڈھی کے خم لنڈھائے جا رہے تھے، بازاری فواحش کے بازار سرد ہو رہے تھے اور حق و صداقت کی بلندی کے لئے علماء حجروں سے اور امراء ایوانوں سے نکل نکل کر میدان میں آ رہے تھے اور ہر قسم کی لاچاری، مفلسی اور غربت کے باوجود ملک میں اس تحریک کے سپاہی پھیلے تھے اور مجاہد تبلیغ اور دعوت میں لگے تھے۔"[1]

سنہ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے نام سے باضابطہ اس کی تشکیل بھی ہو گئی اور اس کے ملک کے مختلف مقامات پر باقاعدہ جلسے بھی ہونے لگے جس میں شرک و بدعت کے خلاف دلائل دیئے جاتے، کفر و الحاد کا زور توڑنے کی کوشش کی جاتی اور اُمت کو کتاب و سُنت کی طرف پلٹنے کی دعوت دی جاتی۔ جنگ آزادی ۱۹۴۷ء تک یہ سلسلہ باقاعدہ چلتا رہا۔ اس دور میں جو کارنامے انجام پائے اور مسلمانوں پر اس کا جو اثر مرتب ہوا اس کی کچھ تفصیل یہاں دی جا رہی ہے۔

تفسیری خدمات

مجلہ الجامعۃ السلفیہ کے موتمر الدعوۃ والتعلیم نمبر نے تقریباً ۶۰ ایسے علمائے حدیث کا نام گنایا ہے جنہوں نے اپنے اپنے دور میں قرآن پاک کی تفسیر لکھی، رسالوں میں تفسیر قرآن سے متعلق مضامین شائع کئے اور اُمت کو قرآن سے براہ راست جوڑنے کی کوشش کی۔ جن میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر نے عربی زبان میں سات جلدوں میں قرآن پاک کی تفسیر لکھی جو تفسیر مظہری کے نام سے جانی جاتی ہے۔ ۱۲۲۵ھ میں آپ

---

[1] مقدمہ سیرت احمد شہید ص ۳۵، سید سُلیمان ندوی

کی وفات ہوئی ہے۔ ثانی الذکر نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں فتح البیان فی مقاصد القرآن سات جلدوں میں اور ترجمان القرآن بلطائف البیان پندرہ جلدوں میں ہے۔ اس کے علاوہ تذکیر الکل بتفسیر الفاتحہ وا ربع قل، نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام، افادۃ الشیوخ بمقدار الناسخ والمنسوخ، اکسیر فی اصول التفسیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ثالث الذکر مولانا ثناء اللہ امرت سریؒ کی تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن عربی زبان میں اور تفسیر ثنائی اردو میں آٹھ جلدوں میں ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی کتابیں بیان الفرقان علی علم البیان، تفسیر بالرائے، تقابل ثلاثہ، برہان التفاسیر بجواب سلطان التفاسیر، الآیات المتشابہات قرآن کے بہت سے مسائل اور گتھیوں کو سلجھاتی ہیں۔ آپ کی وفات ۱۳۶۷ھ میں ہوئی۔

آخر الذکر نے باقاعدہ کوئی تفسیر تو نہیں لکھی لیکن مختلف موضوعات پر رسالے لکھے۔ واضح البیان، تبصیر الرحمٰن، تفسیر سورۃ کہف، نجم الہدیٰ، عرائس البیان فی تفسیر سورۃ الرحمٰن، الانوار الساطعہ فی تفسیر سورۃ الواقعہ، آداب تلاوت القرآن، اعجاز القرآن، حلاوۃ الایمان بتلاوۃ القرآن آپ کی قابل قدر قرآنی تصنیفات ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علمائے تفسیر کے نام آتے ہیں جن کا ذکر طول کلامی کا موجب ہوگا۔

خدمات حدیث

اس مکتبۂ فکر نے حدیث کی سب سے زیادہ خدمات انجام دی ہیں، بڑے بڑے نادرۂ روزگار محدثین پیدا ہوئے جنہوں نے تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف کے ذریعہ حدیث کی نشر و اشاعت کی، یہاں چند محدثین کے علمی کارناموں پر ایک سرسری نظر ڈالی جا رہی ہے۔

سید محمد مرتضیٰ بلگرامی نے نظم اللآلی المتناثرہ فی الاحادیث المتواترہ، رسالۃ الضرع فی حدیث ام زرع، جزء فی طرق حدیث نعم الأدام الخل، عقد الجمان فی بیان شعب الایمان، لغۃ الغریب فی مطلح آثار الحبیب نامی رسالے لکھے۔ ۱۲۰۵ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے عون الباری لحل ادلۃ البخاری، السراج الوہاج شرح مختصر الصحیح لمسلم بن الحجاج، الرحمۃ المہداۃ الی من یرید زیادۃ العلم علی احادیث المشکوٰۃ، الادراک

لتخریج احادیث الاشراف، مسک الختام شرح بلوغ المرام، غنیۃ القاری فی ترجمۃ ثلاثیات البخاری، توفیق الباری، ترجمۃ الادب المفرد للبخاری، فتح المغیث فی فقہ الحدیث، منہج الوصول الیٰ احادیث الرسول وغیرہ کتابیں اور رسالے تحریر کئے۔ وفات ۱۳۲۰ھ میں ہوئی۔

سید نذیر حسین محدث دہلویؒ فن حدیث کے ماہر اور نامور استاذ الاساتذہ تھے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے جنہوں نے آپ سے استفادہ کیا اور دوسروں کو رشد و ہدایت سے ہمکنار کیا۔

مولانا شمس الحق عظیم (متوفی ۱۳۲۹ھ) کی تصنیفات حدیث کثیر ہیں ان میں غایۃ المقصود فی حل سنن ابی داؤد، عون المعبود حاشیہ سنن ابی داؤد فضل الباری شرح ثلاثیات بخاری، التعلیق المغنی علیٰ سنن الدار قطنی، تعلیقات علیٰ سنن النسائی، ھدیۃ اللوذعی بنکات الترمذی، تعلیقات علیٰ اسعاف المبطا برجال المؤطا للسیوطی خاص طور پر مشہور ہیں۔ نواب وحید الزماں حیدر آبادی کی تصنیفات بھی بے شمار ہیں۔ مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری (متوفی ۱۳۵۳ھ) کی تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی، شفاء الغلل شرح کتاب العلل للترمذی، ابکار المنن فی نقد آثار السنن، اعلام اھل الزمن من تبصرۃ آثار السنن میدان حدیث میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ مولانا عبد السلام بستوی کا نام بھی قابل ذکر ہے جنہوں نے رفع الحاجۃ فی شرح سنن ابن ماجہ، انوار المصابیح ترجمہ وشرح مشکوٰۃ المصابیح کتابیں لکھیں۔ اس طرح کتاب وسنت کی زبردست خدمات ان علمائے حدیث نے انجام دیں۔

اس کا اعتراف دیوبندی عالم مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بجائے خود یہ تحریک کچھ بھی ہو لیکن اس کو تسلیم کرنا چاہیئے کہ اپنے دین کے اساسی سرچشموں (قرآن وسنت) کی طرف توجہ ہندوستان کے حنفی مسلمانوں کی جو پلٹی اس میں اہل حدیث اور غیر مقلدیت کی اس تحریک کو بھی دخل ہے، عمومیت غیر مقلد تو نہیں ہوئی لیکن تقلید جامد اور کورانہ اعتماد کا طلسم ضرور ٹوٹ گیا۔"[1]

---

[1] برہان دہلی اگست ۱۹۵۱ء ص ۱۰

اسلام کا دفاع

اسلام پر ہر چہار طرف سے جو جارحانہ حملے کیئے گئے ان کا بھرپور جواب دینے کی کوشش کی گئی اور عیسائیوں، قادیانیوں اور آریوں کے خلاف مناظرے ہوتے اور ہر میدان میں ان کا بھرپور مقابلہ کیا گیا۔ سید نذیر حسین محدث دہلویؒ (متوفی ۱۳۲۰ھ) نے بھی قادیانیت کے خلاف مُدلل اور طویل فتویٰ لکھا، مولانا ابوسعید بٹالوی نے آریوں اور عیسائیوں سے بھی مناظرے کیئے اور مولانا ثناء اللہ امرت سری نے تو قادیانیت کی تردید میں چالیس کتابیں لکھیں، اور آریوں کے خلاف تقریباً سو رسالے لکھے اور اپنے ہفت روزہ آرگن اہل حدیث کو اہل باطل کی تردید کے لئے وقف رکھا۔ علامہ سلیمان سلمان منصور پوری (متوفی ۱۳۴۹ھ) نے بھی اس میدان میں خاصا کام کیا اور متعدد رسالے لکھے۔ مولانا محمد بشیر سہسوانی، قاضی بشیر الدین قنوجی، مولانا ابو القاسم سیف بنارسی، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ، مولانا محمد اسماعیل علی گڑھی، مولانا عبد اللہ معمار غزنوی، مولانا محمد یوسف شمس فیض آبادی، حافظ ولی اللہ لاہوری اور ڈاکٹر محمد اشرف علی گڑھی وغیرہ علمائے حدیث نے ان تمام فرقوں کے خلاف محاذ قائم کیا اور اسلام کی تمام فتنوں سے حفاظت و مدافعت کی۔

اس طرح اس مکتب فکر اور تحریک کی بدولت کورانہ تقلید اور فقہی جمود کا طلسم ٹوٹا اور قرآن و سنت سے براہ راست استفادہ ممکن ہو سکا۔ قرآن و حدیث کی درس گاہیں وجود میں آئیں جہاں سے یونان کی بے سوز و ساز عقلیت کے بجائے قَالَ اللّٰہُ وَقَالَ الرَّسُوْلُ کے نغمے گونجے۔ اصول دین، تفسیر، شرح احادیث پر بیش بہا کتابیں لکھی گئیں۔ مسلم معاشرے کے بہت سے غیر اسلامی رسوم و روایات اور بدعات و خرافات کا خاتمہ ہوا۔ شدھی تحریک عیسائی مشن اور قادیانی مشن کے حملوں کو ناکام بنایا گیا اور مسلمانوں کے اندر عرصہ تک اس تحریک نے جہاد و شہادت کا شعلہ بھڑکائے رکھا اور غیر اسلامی قوتوں سے ساز باز اور مصالحت نہ کی۔[1]

---

[1] یہ تمام معلومات مجلۃ الجامعۃ السلفیہ کے موتمر الدعوۃ والتعلیم نمبر، تراجم علمائے حدیث اور جامعہ سلفیہ کے ندوۃ الطلبہ کے ترجمان المنار سے حاصل کی گئی ہیں۔

ساتواں باب

تعلیمی تحریکات

مسیحی مشنریوں کے کارنامے

نیا نظامِ تعلیم

علی گڑھ تحریک

تحریکِ دیوبند

تحریکِ ندوۃ العلماء

مسیحی مشنریوں کے کارنامے

جب انگریزوں نے دیکھا کہ یہ قوم توپ و تفنگ سے نہیں دب سکتی تو انہوں نے اپنی پالیسی میں تبدیلی اور حکمت عملی میں ترمیم کی ضرورت محسوس کی اور تحریر و تصنیف، تعلیم و تدریس اور پروپیگنڈہ مشنری کے ذریعہ سرد جنگ کا آغاز کیا جس کا مقصد مسلم نسل کے فکر و عمل سے مذہب اور دین کی وابستگی کو ختم کرنا اور بنیادی عقائد کے سلسلے میں ان کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ عیسائی لٹریچر کا ایک طوفان پورے ملک میں پہنچایا گیا اور عیسائی مشنریوں کی فوج ظفر موج مختلف وسائل اور ہتھکنڈوں کے ذریعہ اس مہم میں لگ گئی۔

اسی زمانے میں گورنر یوپی سر ولیم میور نے THE LIFE OF PROPHET لکھی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شائستہ اور با اخلاق زندگی پر رکیک اعتراضات کئے گئے ازواج مطہرات، مسئلہ جہاد اور تعدد ازدواج جیسے مسائل پر خوب گندگی اچھالی گئی صاف صاف لکھا گیا کہ دنیا کو اس وقت دو خطرے درپیش ہیں (نعوذ باللہ) ایک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلوار سے اور دوسرا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قرآن سے، اور جب تک ہم دونوں کو ختم نہیں کردیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

مسٹر ایم الفنسٹن اور مسٹر ایف وارڈن نے ایک متفقہ یادداشت گورنمنٹ میں پیش کی جس میں کھل کر لکھا کہ:

> "میں علانیہ نہیں تو درپردہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا، اگرچہ مجھے گورنر صاحب سے اس بارے میں اتفاق ہے کہ مذہبی امور میں امداد کرنے سے احتراز کیا جاتے تاہم جب تک ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی شکایت نہ کریں تب تک ان کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا شبہ نہیں۔ اگر تعلیم سے ان کی رایوں میں ایسی تبدیلی پیدا

نہ ہو سکے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں تاہم وہ زیادہ ایماندار اور محنتی رعایا تو ضرور بن جائیں گے[1]۔

چنانچہ اٹھارویں صدی کے آخر میں چارلس گرانٹ نے اپنی کتاب میں صاف صاف تحریر کیا کہ:

"ہندوستانیوں کی اخلاقی حالت حد درجہ خراب ہے اور اس لئے ان کی سوسائٹی نہایت ذلیل ہے۔ ان خرابیوں کی اصلاح قانون کے نفاذ سے ہرگز نہیں ہو سکتی خواہ وہ قوانین کیسے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں۔ دراصل تمام خرابیوں کی جڑ ان کے مذہبی مراسم ہیں جن کی رُوح ان کے قوانین میں موجود ہے اور ان کے جھوٹے ناپاک اور قابلِ مضحکہ مذہبی اصولوں میں مضمر ہے۔

ان تمام برائیوں کا واحد علاج یہ ہے کہ ہمارے علم کی روشنی ان لوگوں میں پہنچائی جائے جو تاریکی میں ہیں بالخصوص ہمارے ربانی مذہب کے خالص اور پاک اصول انہیں بتائے جائیں۔ اس بارے میں ہماری ذمہ داری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ جس سچے مذہب سے ہم مستفید ہوتے ہیں اسے دوسروں تک کیوں نہ پہنچائیں[2]۔"

مندرجہ بالا اصولوں کو پیش نظر رکھ کر حکومت کی طرف سے انگریزی تعلیم کے لئے عیسائی مبلغین کی مالی اور مادی امداد کی گئی۔ صوبہ بنگال میں ۱۸۵۳ء میں دو پادریوں کا انعام اس غرض سے کیا گیا تھا کہ وہ پروٹسٹنٹ مذہب کی تعلیم دیں[3]۔

یہی وہ پالیسی تھی جس کا اظہار مسٹر فیگلسن ممبر پارلیمنٹ کی تقریر سے ہوتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ عیسائی بنانے کی تحریک میں ہندوستان کے ملازم انگریز اور عیسائی مشنریوں سے لے کر ممبر پارلیمنٹ تک ملوث تھے۔ وہ ببانگ دُہل اپنی اور حکومت کی دلی آرزو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:

---

[1] تاریخ التعلیم ص ۴۱ بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۹۵

[2] " ص ۱۳، جسٹس سید محمود

[3] علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول ص ۲۳، سید محمد میاں صاحب۔

"خدائے تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت پر انگلستان کا قبضہ ہو تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے ہر شخص کو اپنی تمام قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیئے۔ اور اس میں کسی قسم کا تساہل نہ کرنا چاہیئے۔"[1]

چنانچہ پوری حکومت عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت اور اس تبلیغی مشن کی امداد و اعانت میں مصروف تھی۔ علامہ امداد صابری نے سولہ ایسے پادریوں کے حالات زندگی تحریر کیے ہیں جنہوں نے ہندوستان میں اسلام کے خلاف یہ زہر افشانی کی اور اپنی پوری زندگی اسی میں کھپا دی۔

نیا نظام تعلیم

دوسری طرف ایک نیا نظام تعلیم نافذ کیا گیا جو علامہ اقبال کے بقول دین و مروت کے خلاف ایک سازش تھی۔ انگریزی تعلیم کے نام پر عیسائیت کی تبلیغ کی جا رہی تھی۔ چنانچہ ڈائرکٹر کمپنی مسٹر چارلس گرانٹ نے اس نظام تعلیم کا بنیادی مقصد ان لفظوں میں بیان کیا تھا:

"یہ بات بالکل انگلستان کے اختیار میں ہے کہ وہ ہندوؤں کو بتدریج ہماری زبان سکھائے اور بعد میں اس کے ذریعہ ہمارے فنون، فلسفہ اور مذہب کی تعلیم دے مگر بلاشبہ سب سے اہم تعلیم جو ہندوؤں کو ہماری زبان کے ذریعہ ملے گی وہ ہمارے مذہب کی معلومات ہوں گی۔ مسلمانوں نے اپنی سلطنت کے زمانے میں ہندوستان کے کیرکٹر میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا اس اندیشے سے کہ تعلیم پھیلنے سے کسی زمانے میں ہماری حکومت متزلزل نہ ہو جائے اور ہمارے فوائد کو نقصان نہ پہنچے۔ ہمیں ہندوستانیوں کو سچے مذہب (مذہب عیسوی) سے اور بہترین اخلاق سے اور علوم و فنون کے اصول سے محروم نہیں کرنا چاہیئے۔"[2]

عیسائیوں کی اس سازش کا اعتراف خود سر سید مرحوم نے کیا ہے۔ اسباب بغاوت ہند

---

[1] فرنگیوں کا جال ص ۶۷، علامہ امداد صابری

[2] فرنگیوں کا جال ص ۷۳ بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل

میں لکھتے ہیں کہ:

"دیہاتی مکتبوں کے مقرر ہونے سے لوگ یقین سمجھتے تھے کہ صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب جاری ہوئے ہیں۔ پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر جو ہر گاؤں اور قصبہ میں لوگوں کو نصیحت کرتے پھرتے تھے کہ لڑکوں کو مکتبوں میں داخل کرو۔ ہر ہر گاؤں میں کالا پادری ان کا نام تھا، جس گاؤں میں پرگنہ وزیٹر یا انسپکٹر پہنچا اور گنواروں نے آپس میں چرچا کیا کہ کالا پادری آیا۔ عوام الناس یوں خیال کرتے تھے کہ یہ عیسائی مکتب ہیں اور کرسٹان بنانے کو بٹھاتے ہیں اور فہمیدہ آدمی اگرچہ یہ نہیں سمجھتے تھے مگر یوں جانتے تھے کہ ان مکاتب میں صرف اردو کی تعلیم ہوتی ہے۔ ہمارے لڑکے اس میں پڑھ کر اپنے مذہب کے احکام اور مسائل اور اعتقادات اور رسمیات سے بالکل ناواقف ہو جائیں گے اور عیسائی بن جائیں گے۔ اور یوں سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کا یہی ارادہ ہے کہ ہندوستان کے مذہبی علوم کو معدوم کر دے تاکہ آئندہ کو عیسائی مذہب پھیل جائے۔ اکثر اضلاع مشرقی ہندوستان میں ان مکتبوں کا جاری ہونا اور لڑکوں کا داخل ہونا صاف تحکماً ہوا اور کہہ دیا کہ گورنمنٹ کا حکم ہے کہ لڑکوں کو داخل کیا جاتے ہے"[1]

۱۸۱۶ء میں انگریزی زبان کے ذریعہ عیسائیت کو فروغ دینے کے لئے پادریوں اور کلکتہ کے ایک گھڑی ساز مسٹر ڈیوڈ ہیئر نے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ہائیڈ ایسٹ کی امداد سے اور کلکتہ کے غیر متعصب رئیس راجہ رام موہن رائے کی سرتوڑ کوششوں سے اینگلو انڈین کالج کلکتہ میں قائم ہوا جس میں انگریزی پڑھانے کی ابتدا کی گئی۔ اس کے بعد آگرہ کالج، سینٹ اسٹیفن کالج کلکتہ، اجمیر کالج، بنارس کالج، بریلی کالج، دہلی کالج، ڈھاکہ کالج، لاہور گورنمنٹ کالج، پٹنہ کالج، مدہام پور کالج، کیننگ کالج لکھنؤ، ہگلی کالج، کرشن نگر کالج وغیرہ بنائے گئے جن کی تعلیم کے نتیجے پبلک کے لئے انتہائی پریشان کن ثابت ہوئے۔ سب سے پہلے خاص لاہور میں ۱۸۶۶ء میں تین لڑکے مسیحی ہوئے، پادری پی۔ سی۔ ایل ان میں سے ایک تھا اس پہ لاہور شہر میں بڑا اغوغا ہوا۔ کالج کے طلبہ نے

---

[1] اسباب بغاوت ہند (انگریزی از جی۔ ایف۔ آئی گراہم) ص ۳۱

پڑھنا چھوڑ دیا اور کالج میں صرف سات طلبہ رہ گئے۔ ہندو مسلمانوں نے ہزاروں کی تعداد میں ہفتوں مظاہرے کئے۔ دہلی میں بھی یہی ہوا مسٹر رامچندر اور چمن لال کے عیسائی ہونے سے شہر میں ہیجان پیدا ہوگیا تھا۔ اس خبر کے شہر میں پھیلنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام لڑکوں نے اسکول سے اپنے نام کٹوا لئے۔ ۱۸۵۳ء کے اندر بہت سے لوگ عیسائی ہوئے تو ہندوؤں نے عیسائیوں کے گھر لوٹے، اس نوعیت کے واقعات ہندوستان کے تمام گوشوں میں ہر دن ہوتے تھے عوام میں آگ لگتی تھی لیکن حکومت کی تعلیمی سب کمیٹی اپنی رپورٹوں میں اپنے مقصد کی تکمیل پر خوشی کا اظہار کرتی تھی[۱]

ایک انگریز کی اپنے بیٹے کو اس تعلیمی پالیسی کی نصیحت علامہ اقبال کی زبان میں سُنئے:

سینے میں رہے راز ملوکانہ تو بہتر — کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب — سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

(کلیاتِ اقبالؒ)

اور اکبر الہ آبادی نے اس نظام تعلیم پر یوں چوٹ کی ہے

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر — گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

—×—

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے — مگر یوں ہی کہ گویا آب زمزم مے میں داخل ہے

اور مندرجہ ذیل شعر میں تو عیسائیوں کی پوری سازش کو بے نقاب کر دیا ہے:

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
جب بسولہ ہٹا تو رندہ ہے

یہ ہے وہ پس منظر جس میں تعلیمی تحریکات اُبھرتی ہیں اور علی گڑھ تحریک، دیوبند تحریک اور ندوۃ العلماء تحریک اپنے اپنے طور پر مسلمانوں کے مفاد کے لئے اور اسلام کی حفاظت وصیانت کے لئے جہد وسعی کرتی نظر آتی ہیں۔

---

[۱] فرنگیوں کا جال ص ۲۰۔

علی گڑھ تحریک

سرسید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۲۲ سال کی عمر میں عدالت صدر امینی دہلی کے سررشتہ بنائے گئے اور ۱۸۷۶ء میں سب جج کے عہدے پر پہنچکر ریٹائر ہوئے۔

بہادر شاہ نے ۱۸۴۲ء میں جوادالدولہ عارف جنگ کا خطاب عطا کیا۔ ۱۸۶۹ء میں لندن گئے اور وہاں برطانوی حکومت کی طرف سے سی ایس آئی کا خطاب اور تمغہ دیا گیا۔ اس سے پہلے لندن کی ایشیاٹک سوسائٹی آثار الصنادید کی تصنیف پر انہیں سوسائٹی کا آنریری فیلو مقرر کر چکی تھی۔ ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۲ء تک سرسید وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے پھر ایجوکیشن کمیشن کے ممبر بنائے گئے اور ۱۸۸۶ء میں سروس کمیشن کے رکن مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۹ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

سرسید کی قومی خدمات میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام (۱۸۷۷ء) سائنٹی فک سوسائٹی کی تنظیم (۱۸۶۳ء) اور رسالہ تہذیب الاخلاق کا اجراء (۱۸۷۰ء) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کی تصنیفات کی تعداد پچاس کے قریب ہیں جن میں آثار الصنادید، رسالہ اسباب بغاوتِ ہند، تاریخ سرکشی ضلع بجنور، سفرنامہ لندن، خطبات احمدیہ، تفسیر القرآن، تبیین الکلام، رسالہ احکام طعام اہل کتاب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

۸۱ سال کی عمر پاکر سرسید نے ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو بمقام علی گڑھ انتقال کیا۔ اور کالج کی مسجد میں دفن ہوئے۔

سرسید نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ مسلمانوں کے سیاسی، معاشی، تعلیمی اور سماجی پسماندگی کا دور تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے مسلمانوں کو مایوس اور شکستہ خاطر کر دیا تھا، قومی اُمنگ، جوش و خروش، بلندی و برتری اور ترقی و کامرانی

تصور کوسوں دور تھا۔ انگریزوں سے نفرت اور انگریزی تعلیم و تہذیب سے دوری کی وجہ سے وہ حکومت کی نوازشات اور کرم فرمائیوں سے محروم تھے۔ اس ماحول میں سرسید نے مسلمانوں کے اندر ہمت پیدا کی۔ ان کو کام کرنے اور آگے بڑھانے پر ابھارا۔ ناامیدی میں امیدوں کا چراغ جلایا۔ انہوں نے بڑے اخلاص اور دردمندی سے سوچا کہ:

(۱) مسلمانوں کے افلاس کو دور کیا جائے۔

(۲) ملک کی آزادی کو جہاں تک ممکن ہو ٹالا جائے اور مسلمانوں کے افلاس کو دور کرنے اور باعزت زندگی حاصل کرنے کے لئے حکومت کی وفاداری کا تمغہ حاصل کیا جائے کیونکہ اگر ملک آزاد ہوا تو ۳/۴ ہندو اور ۱/۴ مسلمان ہوں گے تو پیس دیئے جائیں گے۔

چنانچہ ۱۱، ۱۲ جنوری ۱۸۸۸ء کے پائنیر میں سرسید کی ایک تقریر شائع ہوئی جو انہوں نے ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو ایک مجمع کے سامنے کی تھی جس میں تعلقہ داران اودھ حکومت کے سول اور فوجی افسران، وکلاء، نمائندگان اخبارات، فضلاء اور دانشور، ہر فرقہ و خیال کے ہندو بین سنی و شیعہ علماء ہندوستان اور انگلستان کے نوجوان تعلیم یافتہ موجود تھے۔ تقریر میں انہوں نے زور دیا کہ مسلمانوں کو ہرگز کانگریس میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگر ہندوستان میں نمائندہ حکومت قائم ہوئی تو ان کا مستقبل تاریک ہوگا اور ان کو تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ ملے گا اور اس سے مسلمانوں کو دائمی غلامی کے سوا اور کچھ نہ حاصل ہوگا۔ سرسید نے اس کے تین وجوہ بتلائے تھے:

(۱) ہندو اور مسلمان دو علیحدہ قومیں ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے کہا کہ فرض کیجئے کہ انگریز اپنی فوجیں وغیرہ لے کر چلے جائیں تو کون یہاں حکومت کرے گا۔ ظاہر ہے کہ تختِ حکومت پر ہندو اور مسلمان دونوں نہیں بیٹھ سکتے۔ کوئی ایک دوسرے کو مغلوب کرلے گا۔ یہ امید کرنا کہ دونوں مساوی اختیارات رکھیں گے امر ناممکن اور ناقابل عمل تصور کی تمنا کرنا ہے۔

(۲) انتخابی حکومت ہندوستان کے لئے غیر موزوں ہے اس لئے کہ اگر ووٹ لئے گئے تو مسلمان مسلمانوں کو اور ہندو ہندوؤں کو ووٹ دیں گے۔ ایسی صورت ۳/۴ اور ۱/۴ کی نسبت ہوگی۔

(۳) مسلمانوں کو انگریزی حکومت پر پورا بھروسہ کرنا چاہیے۔ وہ ان کے حقوق کا تحفظ

کرسکتی ہے اور ان کو انتظامیہ میں بااثر نمائندگی عطا کرسکتی ہے۔[1]

نیا علم کلام

سرسید مرحوم نے سوچا کہ انگریزی تہذیب وتعلیم اور سائنس ٹکنالوجی کی ترقیات سے مذہب کو ہم آہنگ نہ کیا گیا تو مذہب کا وجود خطرے میں ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ زمانے کی تبدیلیوں اور انقلابات کا تجزیاتی مطالعہ ہونا چاہیئے۔ یورپ کی ترقیات کا بغور مشاہدہ ہونا چاہیئے اور انہیں مذہب سے مطابق اور ہمساز بنانے کی کوشش ہونی چاہیئے نہ کہ ہم شترمرغ کی طرح آنکھیں موند کر زمانے کے طوفان سے صرف نظر کرلیں۔ انگریزی تعلیم ترویج پائے گی تو مسلمانوں کے مذہب اور عقائد پر زبردست زد پڑے گی، نوجوان انگریزی تعلیم پانے کے بعد مذہبی عقائد کو لغو اور بیکار سمجھنے لگیں گے اس لئے اگر ہمیں مذہب عزیز ہے تو ایک نیا علم کلام تیار کریں اس لئے کہ اس وقت دینیات کی جو کتابیں موجود ہیں وہ مطلوبہ مقصد کے لئے ناکافی ہیں چنانچہ کہتے ہیں:

"اب میں نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ جو کتب مذہبی اب تک ہمارے یہاں موجود ہیں اور پڑھنے پڑھانے میں آتی ہیں ان میں سے کون سی کتاب ہے جس میں فلسفۂ مغربیہ اور علوم جدیدہ کے مسائل کی تردید یا تطبیق مسائل مذہبیہ سے کی گئی ہو۔[2]

محسن الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں

"میں اپنے ضمیر کو مخفی نہیں رکھ سکتا۔ میں صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید کو نہ چھوڑیں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہوجائے گا۔"[3]

چنانچہ آپ نے مذہب کی صداقت ثابت کرنے کے لئے یہ اصول قرار دیئے کہ وہ فطرت انسانی کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس طریقۂ فکر کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"جس طرح قدیم علماء نے ایک نئے ڈھنگ پر علم کلام ایجاد کیا تھا اسی کی نظیر پر میں نے یہ نیا طریقہ صداقت کے ثابت کرنے کا ایجاد کیا ہے۔ ممکن ہے اس میں غلطی ہو مگر آئندہ علماء اس کی صحت کردیں گے اور اسلام کو مدد دیں گے۔"[4]

---

[1] تحریک خلافت ص ۵۷، ۵۸، قاضی عدیل عباسی

[2] تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۱۸۱ [3] لیکچروں کا مجموعہ ص ۲۱۳، [4] لیکچروں کا مجموعہ ص ۲۱۵

اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

" اس زمانہ میں مثل زمانہ گزشتہ کے ایک جدید علم کلام کی حاجت ہے جس سے یا تو ہم علوم جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں یا ان کو مشتبہ کر دیں یا اسلامی مسائل کو ان سے مطابق کر دکھلائیں .... جبکہ میں مسلمانوں میں ان علوم (جدیدہ) کے پھیلانے کا داعی ہوں جن کی نسبت میں نے ابھی بیان کیا کہ وہ موجودہ اسلام کے کس قدر مخالف ہیں تو میرا فرض تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے صحیح یا غلط جو کچھ میرے امکان میں ہو اسی طرح اسلام کی حمایت کروں اور اسلام کے اصل نورانی چہرہ کو لوگوں کو دکھلاؤں[1]"

چنانچہ سر سید کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ مذہب اور سائنس کی معرکہ آرائی کو ختم کرنے کی آپ نے کوشش کی اور مذہب اور مروجہ فکری رجحانات میں تطابق پیدا کرنے پر اپنی صلاحیت لگائی۔ اس کے لئے انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تاکہ مغربی تعلیم اور سائنس سے مغائرت دور ہو۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے پرچے جاری کئے اور ان کے ذریعے سے ان خیالات کو پھیلانے کا کام کیا۔ آپ کے اسی امتیازی کارنامے پر ایک بار مولانا ابوالکلام آزاد نے زور دیتے ہوئے کہا تھا:

" دراصل یہ جنگ فکر انسانی کی تاریخ کا ایک عالمگیر خاصہ تھی۔ یورپ میں یہ کشاکش سترھویں اور اٹھارویں صدی میں ہوئی اور مشرقی ممالک کا اُس سے سامنا انیسویں صدی میں ہوا۔ ہندوؤں میں یہ جنگ جلد شروع ہوئی اور جلد ختم ہو گئی مگر مسلمانوں میں اس نے بہت زیادہ وقت لیا۔ بالآخر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوا ہے، وقت کے تقاضے فتح مند ہوئے اور قدامت پرستی کو اپنی ہار ماننی پڑی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے بلا خوف وخطر کہا جا سکتا ہے کہ اس فیصلہ کن جنگ کا مرد میدان وہی شخص تھا جو اس یونیورسٹی کے ایک گوشہ میں مدفون ہے۔ یہ جنگ اس علی گڑھ میں لڑی گئی اور یہی علی گڑھ اس کی فتح مندی کا یادگاری منارہ ہے[2]"

---

[1] خطوط سر سید ص ۲۴۳

[2] کانووکیشن ایڈریس ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء، ارمغان حجاز ص ۱۶، خلیق احمد نظامی

اسلام کی مدافعت

سرسید کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے ان اعتراضات اور شکوک وشبہات کا جواب دینے کی کوشش کی جو عیسائی مشنریوں نے اسلام کے سلسلے میں پیدا کر دیئے تھے ہندوستان میں اس کے لئے مواد نہیں ملا تو انگلستان جاکر مواد اکٹھا کیا۔ لاطینی انگریزی اور دوسری زبانوں سے ترجمے کروا کے پڑھے۔ برٹش میوزیم، انڈین لائبریری اور ترکی اور مصر کے کتب خانوں سے کتابیں اکٹھا کیں۔ سر ولیم میور کی کتاب LIFE OF PROPHET آئی تو اپنے ایک دوست کے نام خط میں لکھا کہ:

"ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے ولیم میور صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔"

ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مواعظ احمدیہ لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں۔ اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ جانا، آنا، ملنا، جلنا سب بند ہے۔۔۔ کسی مہاجن سے میرے لئے قرضہ لے لیجئے، سود اور روپیہ میں ادا کروں گا۔۔۔۔۔۔ روپیہ بھیجنے کے لئے دلی لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے روپیہ بھیج دیں۔۔۔ کیا کہئے اس کتاب کے پیچھے خواب وخور حرام ہو گیا ہے، خدا رحم کرے۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"میں شب و روز تحریر کتاب میں مصروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے۔۔۔ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے۔ ادھر حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ لکھنا اور چھپوانا شروع کر دیا ہے روپیہ کہاں سے آئے گا۔ مسلمان البتہ آستینیں چڑھا کر اس بات پر تو لڑنے کو تیار ہو جاویں گے کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا کیوں کھایا؟

مگر جب کہو کہ مذہب کی تائید میں کچھ روپیہ خرچ کرو تو جان بچائیں گے۔[1]

چنانچہ بڑی محنت، وارفتگی، عقیدت اور تندہی سے یہ کام مکمل کیا اور عقل و استدلال کی روشنی میں قوانین قدرت اور سائنس کی بنیاد پر تاریخی شواہد کو لے کر ولیم میور کا جواب دیا۔ جس کے نتیجے میں "تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہنوں میں جو مخالفین کے اعتراضوں سے شکوک پیدا ہونے لگے تھے، ان کا سدباب ہوا، اور غیر مسلم قوموں کے اسلام کی طرف سے تعصبات اور غلط فہمیوں کا بڑی حد تک ازالہ ہوا۔"[2]

تعلیمی کارنامے

سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ تعلیم کی ترویج و اشاعت کا ہے۔ ابتداء میں انہوں نے قومی تعلیم اور عمومی تعلیم کا فلسفہ پیش کیا اور تعلیم کے لئے جدوجہد اور دوڑ دھوپ کا مطالبہ کیا۔ اپنے ایک لیکچر میں فرمایا:

"جس وقت اولاد کی تربیت کا ذکر آتا ہے تو رئیسوں اور دولت مندوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنی اولاد کی تعلیم خاص اپنے اہتمام سے اور ہر ایک علم کے عالم نوکر رکھ کر بخوبی کر سکتے ہیں بعضوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کو اپنی ہی اولاد کی تعلیم و تربیت کی فکر کرنی کافی ہے مگر یہ ایک بڑی غلطی ہے اور خود اولاد کے ساتھ دشمنی کرنی ہے جہالت اور لاعلمی وبا کی مانند ہوتی ہے۔ جب تک تمام شہر اس بدہوا سے پاک نہ ہو کوئی ایک گھر اپنے تئیں اس سے بچا نہیں سکتا۔"[3]

سرسید مرحوم یہ سمجھتے تھے کہ تعلیم کے ذریعہ ہی قوم آگے بڑھ سکتی ہے۔ چنانچہ لکھنؤ میں ایک بار تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ مجھ کو اس سے زیادہ خوشی نہیں ہے کہ کسی نے بی اے یا ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی بلکہ میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب قوم علمی خزانوں پر قابض ہو۔ تعلیم کے سیاسی اور معاشی فائدے بھی ان کے پیش نظر تھے۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے:

---

[1] علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز ص ۱۲۴، مرتب نسیم قریشی

[2] علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز ص ۱۲۵، پروفیسر محمد عمر الدین کا مضمون، سرسید کا نیا مذہبی طرز فکر

[3] لیکچروں کا مجموعہ ص ۴۵۔

"وہ ملک دولت مند نہیں ہوتا جس میں دوسرے ملک کی چیزوں کی تجارت ہوتی ہے بلکہ وہ ملک دولت مند ہوتا ہے جس کی چیزوں کی تجارت دوسرے ملکوں میں ہوتی ہے .... ہم کو چاہیئے کہ دوسرے ملکوں میں آڑھت اور کمپنیاں قائم کریں ملک کی پیداوار قدرتی چیزوں سے جو زمین میں گری پڑی ہیں اُن سے فائدہ اٹھاویں[1]"

چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے اسکول کھولے، مدارس قائم کئے تاکہ جدید سائنس اور تعلیم سے استفادہ کیا جائے اور مسلمان سیاسی و معاشی میدان میں دوسری قوموں کا ساتھ دے سکیں، انہیں ملازمتیں حاصل ہوں، دفاتر میں ان کا داخلہ ممکن ہو، حکومت کے دائرے میں انہیں اونچے مقامات مل سکیں۔ آگے چل کر انہی کوششوں سے ایم۔اے۔او کالج وجود میں آیا جو بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی میں تبدیل ہوگیا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں میں نئی تعلیم عام کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بھی قائم کی جس نے یہاں کی سیاسی و تعلیمی زندگی میں بڑی خدمات انجام دیں۔

سرسیّد کی تجدد پسندی

سرسیّد کی ان تمام خوبیوں اور جملہ کارناموں کے باوجود یہ کہنے دیجئے کہ تجدّد کی بنیاد آپ نے ہی رکھی ہے۔ قرآن و حدیث کی معذرت خواہانہ اور مرعوبانہ ذہن کے ساتھ تعبیر و تشریح کا فتنہ آپ ہی کے تفسیری مباحث سے شروع ہوا[2]۔ رسالہ طعام اہل کتاب اٹھا کر دیکھئے۔ اس پورے رسالے میں اہل کتاب کے ذبیحہ کو مسلمانوں کے لئے حلال کرکے انگریزی طرز معاشرت کو اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ یہاں تک لکھا ہے کہ:

"جو احکام حلال و حرام کے ہمارے مذہب میں ہیں، اہل کتاب ان کے مکلف نہیں ہیں بلکہ وہ صرف ایمان لانے کے مکلف ہیں پس جبکہ اہل کتاب کا ذبیحہ خدا تعالیٰ نے ہمکو حلال کردیا ہے تو اس میں یہ شرط کسی طرح نہیں لگ سکتی کہ جس طرح ذبح کا حکم مسلمانوں کے لئے ہے، اُسی طرح وہ بھی ذبح کیا کریں یہاں تک کہ بعض روایتوں

---

[1] لیکچروں کا مجموعہ بحوالہ ارمغان علی گڑھ ص ۲۰

[2] نقش سیرت، مرتبہ نثار احمد ایم، اے ص ۶۶

میں آتا ہے کہ اہل کتاب حضرت مسیح کا نام لے کر ذبح کریں تو بھی اس کا کھانا درست ہے[1]

پھر آگے ابن عربی جیسے شخص کی تفسیر سے حوالہ دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر نصرانی مری ہوئی یا قتل کی ہوئی مرغی بھی پکا لے تو اس کا کھانا جائز ہے۔

سن ستاون کی جنگ آزادی سے پہلے آثار الصنادید لکھتے ہیں تو سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک جہاد کی دل کھول کر تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہ تحریک اس لئے برپا کی گئی تھی کہ دین کا کلمہ بلند ہو اور ترویج اسلام ہو:

"آپ (سید احمد شہید) نے سکھوں کی قوم پر جہاد قائم کیا۔ مردم ہندوستان اس خبر کے سننے سے اطراف وجوانب سے راہی ہوئے اور سوائے قوم افاغنہ کے مردم ہندوستان لاکھ آدمی کے قریب جمع ہوتے اور خطبہ آپ کے نام کا پڑھا گیا، دور دورہ امام ہو گیا۔ چند منزل تک عشر جو طریقہ اسلام میں ایک نوع خراج کی ہے، آپ کے پاس آنے لگا۔ پشاور اور بعض مکان سکھ کی عملداری سے نکل کر غازیان اسلام کے تصرف میں آ گئے۔ سکھوں کے باوجود اس شوکت وشان ظاہری کے آپ کا ایسا رعب دل میں بیٹھ گیا کہ کچھ ملک دینے پر راضی ہوئے۔ سچ ہے ع

ہیبت حق است ایں از خلق نیست

لیکن حضرت کو جو کہ ترویج اسلام منظور تھی، قبول نہ کیا۔"[2]

آگے مولانا اسماعیل شہید کا ذکر خیر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اور بالاتفاق حضرت ممدوح نے جہاد پر کمر باندھی اور کوہستان میں لیجا کر اطراف ہندوستان میں خطوط طلب بھیجے اس نواح سے جوق در جوق روانہ ہوئے اور حضرت کی خدمت میں سوائے مردم کوہستان ہندوستانوں میں سے لاکھ آدمی سے زیادہ مجتمع ہو گئے اور کارہائے نمایاں راہِ خدا میں ظہور میں آئے۔ تائید الٰہی سے ان حضرت کا رعب کفار کے دل میں ایسا متمکن ہوا کہ جس جگہ گروہ قلیل غزاتِ مسلمین نے

---

[1] رسالہ احکام طعام اہل کتاب ص ۱۴

[2] آثار الصنادید چوتھا ایڈیشن ۱۹۶۵ء ص ۵۰ - ۳۴۹

متوجہ ہوتا اور اس کے سرگروہ یہ حضرت ہوتے، لشکر کفار اگرچہ مور و ملخ سے زیادہ ہوتا، بے سرو پا فراری ہوتا۔[1]

لیکن یہی سرسید مرحوم جب انگریزی تہذیب اور انگریزی حکومت سے سمجھوتہ کی پالیسی پر اتر تے ہیں تو اپنی تفسیر اور تہذیب الاخلاق کے مضامین میں یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ اسلام میں اصلاحی اور تبلیغی جہاد ہے ہی نہیں۔ یہاں تو صرف دفاعی جہاد ہے۔ حالانکہ یہ سب جانتے ہیں کہ سید شہید کی تحریک جہاد دفاعی نہیں بلکہ اصلاحی و اقدامی تھی۔ سورۃ بقرہ کی تفسیر کرتے ہوئے آیت ۱۸۶ کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"صرف دو صورتوں میں اس نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ ایک اس حالت میں جبکہ کافر اسلام کی عداوت سے اور اسلام معدوم کرنے کی غرض سے، نہ کسی ملکی اغراض سے، مسلمانوں پر حملہ آور ہوں، کیونکہ ملکی اغراض سے جو لڑائیاں واقع ہوں، خواہ مسلمان مسلمانوں میں خواہ مسلمانوں و کافروں میں، وہ دنیاوی بات ہے مذہب سے کچھ تعلق نہیں ہے، دوسرے جبکہ اس ملک یا قوم میں مسلمانوں کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں، ان کی جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو مگر اُس حالت میں بھی اسلام نے کیا عمدہ طریقہ ایمانداری کا بتایا ہے کہ جو لوگ اُس ملک میں جہاں بطور رعیت کے رہتے ہوں یا امن کا علانیہ یا ضمناً انکار کیا ہو، اور گو صرف بوجہ اسلام اُن پر ظلم ہوتا ہو تو بھی ان کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی یا اُس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں یعنی اُس ملک کو چھوڑ کر چلے جاویں۔[2]"

یَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ کا مفہوم سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اسلام کے سوا دوسرے ادیان کے خلاف جنگ کی جائے بلکہ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس قدر لڑنا چاہیئے کہ اللہ کے دین کے بجالانے میں جو کافر حرج ڈالتے ہیں وہ نہ رہے اور اللہ کے لئے دین ہو جائے۔ حالانکہ قرآن کی آیات خود بتاتی ہیں کہ غیر الٰہی افکار و نظریات اور

---

[1] آثار الصنادید چوتھا ایڈیشن ۱۹۶۵ء ص ۳۷۷

[2] تفسیر القرآن جلد اول ص ۲۵۳، ۲۵۴۔

ادیان باطلہ سب فتنہ وفساد میں داخل ہیں اور ان کے کھنڈر پر ہی اسلام کی بلند و بالا عمارت توحید قائم ہو سکتی ہے۔[1]

سرسید نے اپنی اس تفسیر میں معجزات، ملائکہ، شیطان، جنات، معراج جسمانی سب کا انکار کر دیا ہے۔ فرشتوں اور شیطان کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

"ان باریک باتوں پر غور کرنے سے اور اس بات کے سمجھنے سے کہ خدا تعالیٰ جو اپنے جاہ و جلال اور اپنی قدرت اور اپنے افعال کو فرشتوں سے نسبت کرتا ہے تو جن فرشتوں کا قرآن میں ذکر ہے اُن کا کوئی اصلی وجود نہیں ہو سکتا بلکہ خدا کی بے انتہا قدرتوں کے ظہور کو اور اُن قویٰ کو جو خدا نے اپنی تمام مخلوق میں مختلف قسم کے پیدا کئے ہیں، ملک یا ملائکہ کہا ہے، جن میں سے ایک شیطان یا ابلیس بھی ہے پہاڑوں کی صلابت، پانی کی رقت، درختوں کی قوت نمو، برق کی قوت جذب و دفع، غرضکہ تمام قویٰ جنسی۔ مخلوقات موجود ہوتی ہیں اور جو مخلوقات میں ہیں، وہی ملک و ملائکہ ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ انسان ایک مجموعہ قوائے ملکوتی اور قوائے بہیمی کا ہے، اور ان دونوں قوتوں کی بے انتہا ذرّیات ہیں، جو ہر ایک قسم کی نیکی و بدی میں ظاہر ہوتی ہیں اور وہی انسان کے فرشتے اور ان کی ذرّیات اور وہی انسان کے شیطان اور اُس کی ذرّیات ہیں۔"[2]

اسی طرح مرحوم نے عیسیٰؑ کے بن باپ کے پیدا ہونے، موسیٰؑ کے سمندر پر لاٹھی مارنے اور اس سے خشک راستہ بن جانے اور دوسرے تمام معجزات کا انکار کیا ہے اور ان کی تاویل کرنے کی کوشش کی ہے جو کسی صورت میں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، نواب محسن الملک اور دوسرے آپ کے مداحین اور شریک کار آپ کے تعلیمی کارناموں کو سراہنے کے باوجود اس تفسیر سے اتفاق نہ کر سکے اور اس تفسیر کو "تفسیر بما لا یرضیٰ بہ قائلہ" قرار دیا۔[3]

شیروانی صاحب نے تو یہاں تک لکھا کہ:

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن جلد اوّل، فتنہ کی تشریح، امین احسن اصلاحی

[2] تفسیر قرآن جلد اوّل ص ۵۶ [3] ملاحظہ ہو مقالات شیروانی (مضمون "حیات جاوید" پر تبصرہ ص ۶۴ تا ۶۷)

"ہمارے خیال میں سرسید کی تفسیر نگاری کی مثال بعینہ ایسی ہے کہ ایک طوفان خیز سمندر میں جہاز کو ایسا کپتان لیجاتے جو کسی بحری مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہو نہ کسی ماہر استاذ کی صحبت میں اس نے جہاز رانی سیکھی ہو اور محض ضرورت وقت پر لحاظ اور اپنی عقل پر بھروسہ کر کے جہاز کو لے کر چل کھڑا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے جہاز کا انجام کیا ہوگا؟[1]"

تحریک علی گڑھ کی بنیادی خامی

اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ سرسید مخلص اور محنتی خادم قوم تھے اور مذہب سے عقیدت اور محبت بھی رکھتے تھے، جہاں وہ مغربی علوم کو رواج دینا چاہتے تھے وہیں مشرقی ؑ سے دست کش ہونے کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ انہوں نے سالار جنگ کو اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ:

"آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے نمونہ پر کمیٹی کی خاص طور پر توجہ اور کوشش ہوگی کہ وہ مدرستہ العلوم کے طلبہ میں بھی وہی معیار تعلیم قائم کرے جو ان انگریزی یونیورسٹیوں میں ہے۔ اگر کوئی نمایاں فرق ہو تو صرف اتنا کہ جہاں انگریزی یونیورسٹیوں میں عیسائی عقائد کی تعلیم ہوتی ہے وہاں مدرستہ العلوم میں اسلامی عقائد کی تعلیم دی جائے[2]"

لیکن یہ سوال پھر بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس یونیورسٹی سے بحیثیت مجموعی خادم دین و ملت کیوں نہ پیدا ہوتے اور اس تحریک نے سرکاری ملازمین پیدا کرنے پر ہی اکتفا کیوں کیا، کیوں نہ ایسے طلبہ یہاں سے فارغ ہوئے جو اسلام کا علم لے کر اٹھتے اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا کام انجام دیتے۔

اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہاں تحریک میں بنیادی خرابی موجود تھی جس سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہ ہوسکتے تھے۔ مغربی علوم و فنون کو جوں کا توں بغیر تنقید و تجزیہ قبول کر لیا گیا جس کی وجہ سے طلبہ مغربی افکار پر ایمان لاتے چلے گئے۔ اور علوم اسلامیہ کی آمیزش

---

[1] مقالات شیروانی ص ۵۹

[2] علی گڑھ ڈاکومنٹس ص ۱۷۲، ماخوذ جدید ہندوستان کے معمار۔ سید احمد خاں ص ۸۶ خلیق احمد نظامی ترجمہ اصغر عباس۔

بھی کی گئی تو اس طرح کہ جدید تعلیم اور جدید تربیت کے ساتھ اسے کوئی مناسبت ہی نہ تھی۔ اساتذہ بھی اکثر خدا بیزار اور متفرنج تھے جو اپنے قول و عمل اور رفتار و کردار سے اسلام کی تصویر پیش کرنے کے بجائے غیر اسلام کی نمائندگی کرتے رہے۔ فلسفہ وہ پڑھایا گیا جو کائنات کے مسئلہ کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے، اس سائنس کی تعلیم دی گئی جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے۔ تاریخ، سیاسیات، معاشیات، قانون اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم دی گئی جو اپنے اصول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصول عمران سے یکسر مختلف ہے۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ حالی جو سرسید کے زبردست مداحوں میں سے ہیں، علی گڑھ کی تعلیم سے آخری وقت میں مایوس ہو گئے تھے۔ مولوی عبدالحق ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہے، لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبہ کو دیکھ کر انہیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب ان کے نام حیدرآباد میں ایک روز "اولڈ بوائے" آیا تو اسے پڑھ کر بہت افسوس کرنے لگے کہ اس میں سوائے مسخرہ پن کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ انہیں علی گڑھ کے طلبہ سے اس سے اعلیٰ توقع تھی"[1]

وقار الملک جو سرسید کے رفقائے کار میں سے تھے، سرسید صاحب کی اس تعلیمی پالیسی سے مایوس تھے۔ وہ سرسید کو لکھتے ہیں کہ:

"یہ کعبہ کی راہ نہیں، یہ ترکستان کا راستہ ہے۔ یہ غلطی آپ کے دل کی نہیں آپ کے دماغ کی ہے۔ جو راستہ آپ نے لیا ہے وہ آپ کو منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتا"

خود سرسید مرحوم کو اس نقص اور خرابی کا آخری عمر میں احساس ہو گیا تھا۔ مثلاً اپنے ایک خط میں جو ۱۸۹۰ء میں لکھا ہے، کہتے ہیں کہ:

"تعجب ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں اور جن سے قومی فلاح کی امید تھی وہ خود شیطان اور مرتدین قوم ہوتے جاتے ہیں"

---

[1] چند ہم عصر ص ۱۸۱، ۱۸۲، مولوی عبدالحق۔

اس پوری تعلیمی تحریک پر اکبر الہ آبادی نے جو تبصرہ کیا ہے، وہ حقیقت حال کی مکمل تصویر کشی ہے ؎

ابتدا کی جناب سیدؔ نے، جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پر ہوئی، قوم کا کام اب تمام ہوا

تحریک سرسیدؔ اور علی گڑھ کالج میں فرق

بعض لوگوں نے علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کالج میں فرق کو ملحوظ نہیں رکھا ہے جس کی وجہ سے انہوں نے علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی میں خلط ملط کر دیا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں کہ یہاں سے ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا حسرت موہانی، رفیع احمد قدوائی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، خواجہ عبدالمجید، تصدق احمد خاں شیروانی، ڈاکٹر سید محمود وغیرہ قومی لیڈر نکلے تو دوسری طرف علّامہ فراہی، مولانا شبلی وغیرہ محققین نے اور اسلام پسندوں نے بھی کافی مدت تک اس کالج کی خدمت کی ہے۔

"انگریزوں نے اپنے پروپیگنڈے کی فن کاری کے مظاہرے سے یہاں بھی تساہلی نہیں برتی اور اپنے ریزہ چینوں کی معرفت یہ مشہور کر دیا کہ علماء نے سرسید پر جو کفر کا فتویٰ لگایا تھا وہ اس لئے تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کذب صریح ہے۔ انگریزی زبان، علوم جدیدہ اور سائنس وغیرہ کی تعلیم حاصل کرنے کی کسی عالم نے بھی مخالفت نہیں کی۔ سید جمال الدین افغانی، جس نے سرسید پر برملا کفر کا فتویٰ دیا تھا، خود ان علوم کی تعلیم کا زبردست مبلغ تھا۔[1] حقیقت یہ تھی کہ سرسید جس طرح قرآن پاک کی تفسیر کرتے تھے اور پھر

---

[1] چنانچہ ایک بار سید جمال الدین افغانی نے لکھا کہ:

"جو علماء علوم اور معارف کے حاصل کرنے کے لئے منع کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم حفاظت اسلام کر رہے ہیں حالانکہ فی الحقیقت وہ اسلام کے دشمن ہیں۔ وہ مسلمان اسلام کے محافظ ہو سکتے ہیں جو علوم و معارف مختلف سے آشنا اور واقف ہوں۔"
(آثار جمال الدین ص ۱۳۶، ۱۳۷)

سید جمال الدین افغانی نے اصلاحی تحریک شروع کی۔ اور سیاسی، سماجی، تعلیمی اور فوجی اصلاحات کے لئے اقدامات کئے۔ اور مصر، ایران، اور ترکی میں پہلے سے مغربی علوم کی ترویج و اشاعت کی چنگاری

(باقی اگلے صفحہ پر)

جس طرح مسلمانوں کو انگریزوں کے قدموں میں اس وقت ڈال رہے تھے جب دنیا میں تباہی کا انگریز زبردست جال بچھا رہا تھا۔ ان سے علمائے حق نے بیزاری ظاہر کی تھی، سید جمال الدین نے اپنے مضمون "شرح حال اگھوریان" میں سرسید کو بہت سخت الفاظ سے یاد کیا ہے۔"

(اس میں نوٹ ہے کہ ہندوؤں میں ایک فرقہ اگھورناتھ کی نسبت سے اگھوری کہلاتا ہے اور اپنے عقائد کی وجہ سے بدنام ہے یہاں اگھوریان سے نیچری مراد ہیں[1]) پس سرسید پر کفر کا فتویٰ اس لئے تھا کہ انہیں نیچری قرار دیا گیا تھا،

(بقیہ صد ۲۲۰)

موجود تھی چنانچہ جب سید افغانی نے اصلاحی تحریک شروع کی تو ان تمام عناصر سے ان کو مدد مل گئی۔ انہوں نے دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دے کر شعلوں میں تبدیل کر دیا۔ (علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز ص ۲۴۰، ۲۴۱)

[1] سید جمال الدین افغانی کے عربی مضامین کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں تاکہ بات صاف ہو جائے۔ فرماتے ہیں:

"..... اتفاقاً ہندوستان کا ایک آدمی احمد خاں انگریز سے کچھ فائدہ حاصل کرنے کی خاطر ان کے محلوں کا طواف کرتا تھا۔ اس نے اپنے کو انگریزوں کے سامنے پیش کیا اور اپنے مذہب کو چھوڑنے اور انگریزی مذہب کو اختیار کرنے کے لئے چند قدم آگے بڑھائے۔ اس نے اپنے کام کی ابتداء ایک تصنیف سے کی جس میں یہ ثابت کیا کہ تورات اور انجیل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اس طرح اس نے انگریزوں کی بارگاہ میں قرب حاصل کرنا چاہا۔"

"احمد خاں نے قرآن پاک کی ایک تفسیر بھی لکھی ہے جس میں قرآنی الفاظ کے معانی میں تحریف کرکے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب کو بدلنے کی کوشش کی۔ اس نے تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں صرف وہی مضامین شائع ہوتے جو مسلمانوں کی عقلوں کو گمراہ کرتے اور ان میں تفرقہ اور دشمنی کے بیج بوتے تھے۔"

"چنانچہ وہ نیچریوں اور دہریوں کے روپ میں ظاہر ہو کر یہ ثابت کرنے لگا کہ دنیا میں اندھی فطرت اور نیچر کے علاوہ کسی خدا کا وجود نہیں۔"

(مضامین جمال الدین افغانی ترجمہ عبد القدوس ہاشمی ص ۲۹۸ تا ۳۰۰)

انگریزی تعلیم دلانے کی وجہ سے نہیں[۱]،،

دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بارے میں ان کے صاحبزادے کی شہادت موجود ہے کہ وہ حج سے واپسی کے بعد انگریزی زبان سیکھنے کا ارادہ رکھتے تھے تاکہ غیر قوموں تک اسلام کا پیغام پہنچا سکیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اجل مسمّٰی نے حج سے واپسی کے بعد فرصت نہ دی[۲]۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے خطبۂ صدارت میں صاف صاف فرمایا کہ:

"آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ میرے بزرگوں نے کسی بھی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا[۳]،،

فقہ حنفی کے قدیم تعلیمی مرکز فرنگی محل لکھنؤ کے یگانۂ روزگار عالم مولانا عبدالحئیؒ لکھنوی نے اسی وقت انگریزی تعلیم کے متعلق فتویٰ دیا تھا کہ:

"لغت انگریزی کا پڑھنا یا انگریزی لکھنا سیکھنا اگر بہ لحاظ تشبہ کے ہو تو ممنوع ہے اور اگر اس لئے ہو کہ ہم انگریزی زبان میں لکھے ہوئے خطوط پڑھ سکیں اور ان کی کتابوں کے مضامین سے آگاہ ہو سکیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو یہود کا خط (عبرانی) سیکھنے کے لئے حکم فرمایا تو انہوں نے تھوڑے ہی دنوں میں اسے سیکھ لیا،،

(مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحی باب العلم والعلماء جلد سوم ص ۲۰)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے فتاویٰ میں انگریزی پڑھنے پڑھانے کے استفسا کے جواب میں تحریر ہے کہ:

"انگریزی زبان سیکھنا درست ہے بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ آتے" (فتاویٰ رشیدیہ جلد اول ص ۶۴)

---

۱ تحریک خلافت ص ۶۲، قاضی عدیل عباسی۔

۲ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد دوم ص ۴۰، سید مناظر احسن گیلانی

۳ علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے ص ۲۱۴، سید محمد میاں

اسباب بغاوت ہند میں خود سرسید نے لکھا ہے کہ:

"بڑے بڑے کالج جو شہروں میں مقرر ہوتے تھے، اوّل اوّل گو اُن سے بھی کچھ کچھ وحشت لوگوں کو ہوئی تھی اس زمانہ میں شاہ عبد العزیز جو تمام ہندوستان میں نامی مولوی تھے زندہ تھے۔ مسلمانوں نے ان سے فتویٰ پوچھا۔ انہوں نے صاف جواب دیا کہ کالج انگریزی میں جانا اور پڑھنا اور انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب کے سب درست ہے۔ اس پر سینکڑوں مسلمان کالجوں میں داخل ہوئے۔"[1]

علی گڑھ کے نامور فرزند پروفیسر رشید احمد صدیقی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"بایں ہمہ سرسید کی واقعیت پسندی کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے مدرستہ العلوم کے اعلیٰ مقاصد کو خطرے میں پایا تو اس سلسلے (مذہب کے سلسلے میں دخل اندازی) کو ترک کر دیا یہاں تک کہ اس کمیٹی کے ممبر تک نہ رہے جس کے سپرد شعبۂ دینیات کا انتظام تھا۔"[2]

چنانچہ بدایوں کے حاجی علی بخش خاں شرر (۱۲۳۷ھ ——— ۱۳۰۲ھ) نے جب سرسید پر یہ اعتراض کیا کہ "میرا مدرستہ العلوم میں چندہ نہ دینا اور شریک نہ ہونا کسی نفسانیت ذاتی پر مبنی نہیں ہے بلکہ میں اس کو امر دینی میں مخدوش سمجھتا ہوں اور آپ کے عقائد جو نسبت مذہب اسلام کے مشتہر ہوتے ہیں ان کو بالکل غلط اور مخالف مذہب اسلام کے سمجھتا ہوں بلکہ ان مسائل کو ایک مذہب جدیدہ اور ملت نیچریہ جانتا ہوں جو میرے نزدیک ضلالت ہے۔ مدرستہ العلوم میرے نزدیک اہل اسلام کے واسطے اس وقت مفید ہو گا جب تعلیم مذہبی جو اس میں ہو گی اس تعلیم میں کسی طرح دخل آپ کے عقائد کی مداخلت کا جو خلاف شرع ہیں نہ ہو۔" تو سرسید مرحوم نے انہیں جو خط لکھا اس میں ان کی صاف گوئی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ:

"بہرحال اب آپ کا مدرستہ العلوم میں مددگار ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ میرے

---

[1] رسالہ اسباب بغاوت ہند ص ۱۰۶، ایڈیشن دوم، مقدمہ فوق کریمی

[2] عزیزان ندوہ کے نام ص ۱۲، رشید احمد صدیقی۔

عقائد کی مداخلت کا اندیشہ جس کو خلاف شرع سمجھتے ہیں اور کمیٹی کی دست اندازی کا خوف مسائل مذہبی میں نہ رہے اور اس کے دفع ہونے کے لئے آپ یہ تجویز فرماتے ہیں کہ کمیٹی خزنۃ البضاعۃ تعلیم مذہبی میں کچھ مداخلت نہ کرے اور ایک اور کمیٹی جس پر عام اہل اسلام کو اطمینان ہو، امور متعلقہ تعلیم مذہبی کے لئے مقرر کی جائے ــــ میں نہایت خوش دلی سے جو امر آپ نے پیش فرمایا ہے اس کو بتمامہ منظور کرتا ہوں ؎

(سہ ماہی روشن جلد ۲ شمارہ ا ص ۲۶ تا ۲۸ بحوالہ نور الآفاق ۱۵ اگست ۱۸۷۳ء ص ۱۲۷، ۱۲۸۔)

سر سید کے مذہبی افکار سے قطع نظر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ شخص اسلام پسند تھا اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ چنانچہ اس کے نزدیک قوم اسی وقت قوم ہے جب وہ اسلام پر پختہ اور قائم اور استوار ہو۔ لدھیانہ میں ایک نوجوان کی تقریر کا جواب دیتے ہوئے اس نے جو کچھ کہا اس کا حرف حرف موتی سے ٹانکنے کے قابل ہے:

" تمہارے بیان میں کئی جگہ قوم کا لفظ آیا ہے مگر یاد رکھو، قوم کوئی چیز نہیں جب تک کہ وہ قوم قوم نہ ہو ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتے ہیں۔ جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو اور پابند ہیں۔ تبھی وہ قوم ہیں۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا اور جس پر تم کو مرنا ہے، اسے قائم رکھنے سے ہماری قوم قوم ہے۔ اے عزیز بچے! اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا؟ وہ تو ہماری قوم میں نہ رہا۔ پس اسلام کو قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے۔ یہی قومی ترقی ہوگی جو تم کو بھی فائدہ دے گی، قوم کی بھی عزت ہوگی اور آنے والی نسلیں بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گی[1]"

چراغ سے چراغ جلے۔ علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں جو فائدہ پہنچایا اس کا تجربہ مختلف جگہوں پر کیا گیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد پڑی جس کی قیادت مولانا محمد علی جوہر کے ہاتھ میں تھی جس نے ثقافت و تعلیم اور علم و ادب کے میدان میں

---

[1] حیات جاوید حصہ دوم ص ۵۵۵، الطاف حسین حالیؔ

کافی خدمات انجام دیں یہاں کے اساتذہ روشن خیالی اور وطن پروری میں مشہور ہیں۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی تھی جہاں اُردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا اور جدید علوم کا ایک بڑا ذخیرہ دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل کیا گیا اس طرح اُردو زبان و ادب کی اس ادارہ نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔

ان کے علاوہ مسلمانوں نے جا بجا مسلم کالج قائم کیے اور مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ آگے بڑھی۔ خاص طور سے جنوبی ہند میں اس طرح کی کافی کوششیں ہوئیں۔

تحریک دیوبند

دوسری تحریک وہ تھی جسے اسلامی تعلیمات اور مسلم تہذیب و تمدن کے تحفظ کے لئے علمائے کرام نے چلائی۔ اور دیوبند کے علمائے حق نے اس راہ میں بے بہا قربانیاں دے کر اپنی روایات و ثقافت کی حفاظت کی۔ اسی مقصد کے لئے مولانا قاسم نانوتویؒ نے دیوبند میں ۱۸۶۶ء میں مدرسہ کی بنیاد رکھی گو کہ حکومت کی نظر اس مدرسہ کے سلسلے میں اچھی نہ تھی کیونکہ اس کے ہمدردوں میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے سن ستاون کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا اور اس کے پیش نظر شرع محمدی کی تعلیم و اشاعت اور شریعت انگریزی کا مکمل بائیکاٹ تھا، لیکن علمائے حق کی نیک نیتی اور ان کی قربانی و جاں سپاری نے اس مدرسہ کو وہ مقبولیت عطا کی کہ ہند و پاک ہی نہیں بلکہ عالم اسلام میں اسے علوم اسلامیہ کا مرکز سمجھا جانے لگا۔ بانی مدرسہ کے بقول اس مدرسہ کا مقصد:

"(الف) آزادی ضمیر کے ساتھ ہر موقعہ پر کلمۃ الحق کا اعلاء ہو۔ کوئی سنہری طمع، مربیانہ دباؤ یا سرپرستانہ مراعات اس میں حائل نہ ہو سکے۔

(ب) اس کا تعلق عام مسلمانوں کے ساتھ زائد سے زائد ہو تاکہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کر دے جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل پر قائم رکھنے میں معین ہو اور اس طرح اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب ہمیشہ کے لئے ورنہ کم از کم اس وقت تک کے لئے محفوظ ہو جائے جب تک کہ یہ مرکز اپنے صحیح اصول پر قائم رہے، نیز توکل علی اللہ اور عوام کی طرف احتیاج خود کارکنان مدرسہ کو اسلامی شان پر باقی رکھ سکے اور جابرانہ استبداد یا ریاست کا ٹھاٹھ ان میں قطعاً نہ پیدا ہو بلکہ ایک جمہوری تعلق ہو جو ایک کو دوسرے کا محتاج بنائے رکھے۔ اور اس طرح آپس میں خود ایک دوسرے کی اصلاح ہوتی رہے۔"

مندرجہ بالا الف اور ب مقاصد کے حصول کے لئے اصول وضوابط کی دفعہ ۶، ۷، ۸ ملاحظہ ہو جن کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

"اصل ع۶ اس مدرسہ میں آمدنی کی جب تک کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا۔ اور کوئی آمدنی یقینی ایسی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ۔ تجارت یا کسی امیر محکم العقول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا تو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہوجائے گی۔ کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک قسم کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

اصل ع۷ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔

اصل ع۸ تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے زیادہ امید ناموری نہ ہو بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا موجب معلوم ہوتا ہے[۱]"

اسی آزادیٔ فکر کی خاطر مولانا قاسم صاحب نے طے کیا کہ سرکاری وظائف تو در کنار طلبہ کے لئے ریلوے کنسیشن تک کی سہولت حکومت سے نہیں لی جائے گی۔ عوام سے رابطہ رکھا جائے گا کہ ضرورت پڑے تو انگریزوں سے مقابلہ کیا جاسکے[۲]

مولانا مناظر احسن گیلانی کے استفسار پر شیخ الہند نے فرمایا کہ:

"حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو درس و تدریس، تعلیم و تعلم کے لئے قائم کیا تھا۔ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد ادارہ قائم ہوا کہ کوئی ایسا مرکز ہو جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جاسکے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی ہوسکے[۳]"

۱؎ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۷۶، ۱۷۷۔ سید طفیل احمد منگلوری

۲؎ علی گڑھ تحریک مرتب نسیم قریشی۔ مضمون نگار سعید احمد اکبرآبادی ص ۲۲۱

۳؎ سوانح قاسمی ص ۲۲۶، مولانا مناظر احسن گیلانی

خدمات پر ایک نظر

بانی تحریک کی مندرجہ بالا مفصل تحریر سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تعلیمی تحریک حکومت کی سرپرستی کے بغیر دین کی حفاظت کی تحریک تھی۔ علماء نے محسوس کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مذہبی بنیادیں بھی اسی طوفان بلا خیز کی نذر ہو جائیں، ملک و ملت کے مادی خزانے تو انگریز لوٹ کر لے جا چکے تھے اب اس امر کی ضرورت تھی کہ ملت کا ملی روحانی اور علمی سرمایہ جلد از جلد محفوظ کر لیا جائے۔ انہوں نے سوچا کہ ان نازک حالات میں ہم دین کو غالب نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کا تحفظ تو کر سکتے ہیں۔ اگر دوسروں پر اس کی چھاپ نہیں لگا سکتے تو اپنے ورثہ اور تہذیب کی جان پر کھیل کر حفاظت تو کر سکتے ہیں۔

چنانچہ اس تحریک نے جو اہم اور مفید خدمات انجام دیں ان سے کوئی حق پسند شخص انکار نہیں کر سکتا۔ یہ اس تحریک کا ثمرہ ہے کہ ہم مسلمان اپنے کلمہ پر قائم ہیں۔ قرآن و حدیث سے ہمارا تعلق باقی ہے۔ پورے ملک میں شعائر اسلام کا چرچا ہے اور درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کے ذریعہ اُمت کو دین سے جوڑنے کی کوشش جاری ہے۔

اس وقت پورے ملک میں اسلام پر جس طرح حملے کئے گئے، اس کے سامنے علماء کی یہ مساعی ڈھال بن گئیں اور اپنی روایات، تہذیب اور اپنے علوم کو ہم نے بچا لیا۔

اوپر شیخ الہند کے الفاظ نقل کئے جا چکے ہیں کہ اس کا مقصد ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی تھی چنانچہ اس ادارہ میں بیعت جہاد تک لی گئی[1] مولانا قاسم صاحب کو انگریزوں سے اتنی نفرت تھی کہ دہلی میں جب ملکہ وکٹوریہ کا جشن اقتدار منایا جا رہا تھا تو دیوبند چلے آئے اور فرمایا کہ "مجھ سے انگریزوں کی شوکت دیکھی نہیں جاتی اس لئے دیوبند چلا آیا ہوں کہ نہ دیکھوں گا نہ کوفت ہوگی"[2]

دیوبند کے متعدد علماء نے جنگ آزادی میں بھی حصہ لیا جس کی قیادت شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے کی۔ جمعیۃ الانصار اور ریشمی رومال تحریک، تحریک خلافت وغیرہ میں علمائے دیوبند پیش پیش رہے یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد لندن کے پارلیمنٹ ہاؤس میں

---

[1] انقلابی دور کا تیسرا نمبر ص ۲۰، عبدالصمد رحمانی

[2] سوانح قاسمی ص ۹۰ ، مولانا مناظر احسن گیلانی

دارالعلوم بند کرنے کی تجویز پیش ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ کو دین اسلام کی بقا منظور تھی اس لئے انگریزوں کی خواہش کے باوجود دارالعلوم بند نہ ہو سکا[۱]

ہندو پاک کے مسلمان اپنی دینی زندگی میں دیوبند کے فضلاء کے ممنون احسان ہیں کہ ان کی تبلیغی و اصلاحی کوششوں سے ملک کے گوشے گوشے میں بدعات، غلط رسوم و رواج کا خاتمہ ہوا، عقائد کی درستی، تبلیغ دین اور فرقہ ضالہ سے مناظرہ وغیرہ ان حضرات کے نمایاں کارنامے ہیں[۲]

چند سوالات

لیکن یہاں چند سوالات ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں جنہیں قارئین کے سامنے رکھنا بھی ضروری ہے:

(۱) اس پوری تحریک کا انداز کار دفاعی اور محصورانہ ہے۔ یہاں اقدام عمل اور مغربی تہذیب و تمدن پر آگے بڑھ کر حملہ کرنے کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر اور اقامت دین کا فریضہ اپنی مکمل شکل میں یہاں جلوہ گر نظر نہیں آتا اور شاید حالات اس کی اجازت بھی نہ دیتے لیکن محض دفاع پر قانع ہو جانا کہاں تک درست تھا؟

(۲) متحدہ قومیت کا فتنہ یہیں سے ابھرا۔ "ملت از وطن است،، کی گونج یہیں سے کانوں میں آئی۔ یہ صحیح ہے کہ اس کا توڑ بھی یہیں سے ہوا اور علامہ شبیر احمد عثمانی اور مفتی محمد شفیع صاحبان نے دو قومی نظریے کی حمایت کی، لیکن یہ آواز بہت مدھم تھی اس کے برعکس متحدہ قومیت کی آواز بہت زوردار تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے رسالہ "متحدہ قومیت اور اسلام،، میں نظریہ قومیت کی کھل کر وکالت کی اور لکھا کہ:

> "ہندوستانیوں کا وطنیت کی بنا پر متحدہ قومیت بنا لینا انگلستان کے لئے جس قدر خطرناک ہے وہ ہماری اس شہادت سے ظاہر ہے جو ہم نے پروفیسر سیلے کے

---

[۱] حیات امداد ص ۱۰۸، انوار الحسن شیر کوٹی۔

[۲] ہندوستانی مسلمان ص ۱۱۹، سید ابوالحسن علی ندوی

مقالے سے نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جذبہ ضعیف سے ضعیف بھی اگر ہندوستانیوں میں پیدا ہو جائے تو اگرچہ ان میں انگریزوں کے نکالنے کی طاقت بھی نہ ہو مگر فقط اس وجہ سے کہ ان میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے گا کہ اجنبی قوم کے ساتھ ان کے لئے اشتراک عمل شرمناک امر ہے، انگریزی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔" (ص۳۸)

آگے چل کر ایسی حیرت انگیز رائے کا اظہار فرماتے ہیں جسے پڑھ کر آدمی ششدر رہ جاتا ہے کہ کیا یہ کسی متقی عالم کی تحریر ہو سکتی ہے:

"اگر یہ قومیت ایسی ہی ملعون اور بدترین چیز ہے تو چونکہ یورپ نے اس کو استعمال کر کے اسلامی بادشاہوں اور عثمانی خلافت کی جڑ کھودی ہے، مسلمانوں کو چاہیئے کہ اسی ملعون ہتھیار کو برطانیہ کی جڑ کھودنے کے لئے استعمال کرتے۔" (ص۳۸)

اسی متحدہ قومیت کے جواز میں مولانا کی دوسری دلیل ملاحظہ فرمایئے:

"ہم روزانہ مفادہائے مشترکہ کے لئے ہیئات اجتماعیہ بناتے ہیں اور ان میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ ان کی شرکت اور ممبری کے لئے انتہائی جدوجہد کرتے ہیں۔ ٹاؤن ایریا، نوٹیفائیڈ ایریا میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ، کونسلات، اسمبلیاں، ایجوکیشنل ایسوسی ایشن اور اسی قسم کی سینکڑوں ایسوسی ایشنیں بناتے ہیں جو کہ انہی اصولوں اور قواعد سے عبارت ہیں جو کہ خاص مقصد کے ماتحت ہیئت اجتماعیہ کے لئے بنائے گئے ہیں۔ تعجب ہے کہ ان میں حصہ لینا اور مکمل یا غیر مکمل جدوجہد کرنا ممنوع قرار نہیں دیا جاتا مگر اسی قسم کی کوئی انجمن اگر آزادی ملک اور برطانوی اقتدار کے خلاف قائم ہو تو وہ حرام، خلاف دیانت، خلاف تعلیمات اسلامیہ اور خلاف عقل و دانش وغیرہ ہو جاتی ہے۔" (ص۴۱)

یہ دیکھئے بناء فاسد علی الفاسد کی مثال! ایک گناہ کو جائز فرض کر کے اس کی حجت پر دوسرے گناہوں کو جائز ثابت کرنے کی مکروہ کوشش! اسی لئے ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمۃ نے مولانا حسین احمد مدنی پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا:

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اسی مدرسۂ فکر کے ایک نامور عالم دین مولانا عبید اللہ سندھی ایک طویل مدت کی جلاوطنی کے بعد جب ہندوستان واپس آئے تو نیشنلزم کا نسخۂ کیمیا ساتھ میں لائے اور جمعیت علمائے بنگال کے کلکتہ کے اجلاس میں ارشاد فرمایا:

"اگر میرا وطن اس انقلاب کے نقصان سے بچنا چاہتا ہے جو اس وقت دنیا پر چھا گیا ہے اور روز بروز چھاتا جا رہا ہے تو اسے یوروپین اصولوں پر نیشنلزم کو ترقی دینا چاہیئے پچھلے زمانے میں ہمارا ملک جس قدر نامور رہا ہے اسے دنیا جانتی ہے مگر اس سے ہم کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے جب تک آج کی قوموں میں ہم اپنا وقار ثابت نہ کر سکیں[1]"

صوبہ سندھ کے لئے جو معاشرتی انقلاب تجویز کیا، اس میں فرمایا:

"سندھی اپنے وطن کا بنا ہوا کپڑا پہنے گا مگر وہ کوٹ پتلون کی شکل میں ہوگا یا کالر دار قمیص اور نیکر کی صورت میں۔ مسلمان اپنا نیکر گھٹنے سے نیچے تک استعمال کر سکتے ہیں۔ ہیٹ دونوں صورتوں میں بے تکلف استعمال کیا جاتے گا۔ جب مسلمان مسجد میں آئے گا ہیٹ اتار کر ننگے سر نماز پڑھے گا[2]"

بتایئے یہ خیالات اسلام کے اصولوں سے کس حد تک میل کھاتے ہیں؟

(۳) تیسری طرف شریعت، تصوف اور ویدانت کا معجون مرکب بھی یہیں تیار ہو۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار و نظریات یہیں سے پھولے پھلے جنہیں اسلامی کہنا

---

[1] مولانا عبید اللہ سندھی، پروفیسر محمد سرور، سندھ ساگر اکادمی لاہور ص ۱۳۰، ۱۳۱

[2] ایضاً ص ۱۳۱

بڑا مشکل ہے

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ موجودہ ہندی تصوف کا بڑا حصہ ویدانت اور ہندو جوگیوں سے ماخوذ ہے۔ اصل جذبۂ تصوف جسے حدیث میں "احسان" کہا گیا ہے، یقیناً خالص اسلامی چیز ہے لیکن موجودہ فنِ تصوف، تزکیہ اور ریاضت کے نت نئے طریقے بیرونی اثرات کی غمازی کرتے ہیں۔ مولانا کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

"ہمارے بعض علماء اس سے بہت چڑتے ہیں، انہیں یہ گراں گزرتا ہے کہ مسلمان صوفیاء نے ہندوستان کے ویدانت سے استفادہ کیا۔ چنانچہ وہ ایسے تصوف کو غیر اسلامی قرار دیتے ہیں .... ان ارباب علم و فضل کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ ایک ہے جذبۂ تصوف اور ایک ہے علم تصوف، اسی جذبۂ تصوف کو حدیث شریف میں احسان کا نام دیا گیا ہے .... اور جس طرح اور علوم کی تدوین میں دوسری قوموں کی تحقیقات اور تلاش و جستجو سے مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا، اسی طرح تصوف کے طُرق میں بھی دوسری قوموں سے استفادہ کیا گیا[۱]"

انسانی تصوف پر سب سے زیادہ اثر ہندو ویدانتی کا ہوا ہے[۲]"

وحدت ادیان کی وکالت دیکھئے کس طرح کرتے ہیں :

"عقیدہ وحدۃ الوجود، وحدت ادیان، اور ایک مستقل دین کی جو بالترتیب جدا جدا حیثیتیں ہیں، ان کی وضاحت کرتے ہوئے ایک دفعہ مولانا نے فرمایا کہ اُن کی مثال انسانیت بین الاقوامیت اور قوم کی ہے۔ میں انسانیت عامہ پر عقیدہ رکھتا ہوں اور اس بنا پر میں بین الاقوامیت پر بہت زور دیتا ہوں لیکن انسانیت اور بین الاقوامیت پر عقیدہ رکھنے سے میرے نزدیک یہ لازم نہیں آتا کہ قوم کے مستقل وجود کو نہ مانا جائے ..... قوم، بین الاقوامیت اور انسانیت ایک سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ بعینہٖ میرا شخصی عقیدہ، میرا قومی اور ملی مذہب، وحدت ادیان اور وحدت وجود ذہنی ارتقاء کے مراحل ہیں[۳]"

۱ے مولانا عبید اللہ سندھی۔ پروفیسر محمد سرور ص ۱۳۰، ۱۳۱۔

۲ے ایضاً ص ۱۳۱۔ ۳ے ایضاً ص ۱۵۱

بتائیے ان خیالات کی کیا توجیہ کی جا سکتی ہے؟[1]

ان تمام خامیوں کے باوجود دارالعلوم دیوبند نے اسلام کی حفاظت میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ چنانچہ اس طرز پر ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں مدارس قائم ہوئے۔ ۱۲۸۳ھ میں مولانا سعادت علی سہارنپوری نے شہر سہارنپور میں مدرسہ مظاہر العلوم کی بنیاد رکھی جہاں سے علماء اور علم دین کے خدمت گزار بڑی تعداد میں فارغ ہوئے اور فن حدیث کی خاص طور پر خدمت کی۔ درس نظامی کے طرز پر اور بھی بہت سے دوسرے مدارس قائم ہوتے جن میں مراد آباد کا مدرسہ شاہی، دربھنگہ کا مدرسہ امدادیہ، متوناتھ بھنجن کا مفتاح العلوم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اہل حدیث کے متعدد مدارس مدرسہ رحمانیہ دہلی، مدرسہ سلفیہ بنارس، مدرسہ احمدیہ سلفیہ لہریا سرائے دربھنگہ وغیرہ قائم ہوئے جن میں دہلی کا مدرسہ رحمانیہ تقسیم کے بعد بند ہو گیا البتہ جامعہ سلفیہ بنارس اور مدرسہ احمدیہ لہریا سرائے اب بھی دینی و ملی خدمات میں مشغول ہیں۔

مدرسہ عالیہ رامپور، مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ بھی تعلیم کے اہم مراکز رہے ہیں۔ جنوبی ہند میں حیدر آباد کا مدرسہ نظامیہ، ویلور کا الباقیات الصالحات خاص طور پر ممتاز ہیں ان مدارس نے دارالعلوم دیوبند سے اپنا ربط رکھا اور علم کی اشاعت، عقائد کی اصلاح اور مسلمانوں کی دینی و اصلاحی خدمت میں بڑا حصہ لیا ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے مولانا سندھی کے افکار و خیالات پر ایک نظر، مولانا مسعود عالم ندوی، مکتبہ دین و دانش بانکی پور پٹنہ

تحریک ندوۃ العلماء

ندوہ ۱۸۹۴ء میں مولانا محمد علی مونگیری کے ہاتھوں قائم ہوا جس کا مقصد علی گڑھ اور دیوبند کو ملانا اور دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کرنا تھا۔ جدید و قدیم کا سنگم اس کا آئیڈیل قرار پایا۔ خود اس کے بانی مرحوم اسی نقطۂ نظر کے حامی تھے چنانچہ انہوں نے صاف طور سے لکھا کہ:

"بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جماعت علماء کی دنیا کے حالات و واقعات سے بھی باخبر ہو اس کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ بسر کرتی ہے اس کے اصولِ سلطنت کیا ہیں، اس کو سلطنت سے کس قسم کا تعلق ہے، ملک میں علماء کا جو اثر کم ہوتا جارہا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ خیال عام طور پر پھیلتا جارہا ہے کہ علماء حجروں میں معتکف ہیں، ان کو دنیا کے حال کی بالکل خبر نہیں، اس لئے دنیاوی معاملات میں ان کی ہدایت اور ان کا ارشاد بالکل ناقابلِ التفات ہے[1]"

چنانچہ اس ضرورت کے پیش نظر ایک ایسا نصاب تعلیم مرتب کرنے کی کوشش کی گئی جو قدیم و جدید تقاضوں کے مطابق اور ہم آہنگ ہو اور بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کی تعلیم کو عام کرسکیں اور مدلل اور سائنٹفک انداز میں جدید ذہنوں کو مطمئن کرسکیں۔ خود بانیٔ تحریک نصاب تعلیم کا مکمل خاکہ پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

"ان تجاویز کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ لڑکے ایسے مہذب اور پابند مذہب ہوں کہ دوسروں پر اپنا اثر ڈال سکیں۔ طالب علموں میں دلیری و بلند ہمتی و عالی ظرفی و فراخ حوصلگی پیدا ہو جو بغیر اس قسم کے دار العلوم کے جس میں تمام

---

[1] تجویز دار العلوم ندوۃ العلماء۔ ص ۲۱

باتیں نہایت شان و شوکت کے ساتھ ہوں حاصل نہیں ہو سکتی ــــــ علوم دینیہ خصوصاً علم کلام میں جس کی اس وقت نہایت ضرورت ہے، نہایت اعلیٰ درجہ کا کمال پیدا کیا جائے تاکہ الحاد و دہریت کا مقابلہ پورے زور و قوت سے ہو سکے[۱]"

علامہ شبلی نعمانی نے دارالعلوم کا جو خاکہ مرتب کیا تھا اس میں بھی زیادہ زور اس بات پر تھا کہ طلبہ ایک طرف علوم دینیہ میں ملکۂ تامہ حاصل کریں تو دوسری طرف علوم عصریہ سے اس قدر آشنا ہوں کہ دُنیاوی حالات سے پورے طور پر باخبر رہ سکیں۔ ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی نے ۲۸ رجب ۱۳۱۶ھ کو مولانا عبدالحئی مددگار ناظم اور مولانا عبداللطیف رحمانی مدرس دارالعلوم کے نام دارالعلوم کے نصب العین کی وضاحت میں جو مشترکہ خط لکھا وہ کافی اہمیت کا حامل ہے جس میں مولانا نے چار چیزوں پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا تھا:

(۱) جزئیات سے گہری اور علمی واقفیت جو کہ ایک تجربہ کار اور کامیاب قائد اور رہنما کے لئے بے حد ضروری ہے۔

(۲) دور اندیشی اور وسیع النظری

(۳) اعتدال اور توازن

(۴) علوم قرآن اور ادب عربی پر خاص زور

نصاب کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

" ابتدائی درجات میں دینیات کا بہت خیال رکھئے، نصاب میں عمدہ کتابیں ہوں عقائد کی عمدگی سے تعلیم دی جائے مگر اس طرح کہ نئی تعلیم کے مناسب ہو، قرآن مجید کی طرف زیادہ توجہ رہے ایسا ضرور کیجئے کہ ابتدائی درجہ کا طالب علم قرآن مجید کی تفسیر سے عاری نہ رہے[۲]"

ندوۃ العلماء کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ علماء کے باہمی نزاعات رفع کئے جائیں اور انہیں اشاعت اسلام کے کام پر متحد کیا جائے۔ چنانچہ جب ہندوستان کے اہم علاقوں کے دورے

---

[۱] دیکھئے روداد ندوۃ العلماء بابت سال اوّل حصہ اوّل (غیر مطبوعہ) بحوالہ اسلام اور عصر جدید جلد ۷، شمارہ ۲، اپریل ۱۹۷۵ء۔ [۲] سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص ۲۴۴، سید محمد الحسنی

پر مولانا مشتاق علی نگینوی استاذ مدرسہ اسلامیہ فیض آباد کو مامور کیا گیا تو انہیں ناظمِ اوّل ندوۃ العلماء نے جو تحریر دی اس میں ندوہ کے قیام کی یہ غرض بھی بتائی گئی تھی کہ:

"اس وقت ہمارے علماء کی باہمی نزاعیں سخت نقصان پہنچا رہی ہیں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے امروں میں بڑا بڑا فساد پیدا ہوتا ہے جس سے علمائے اسلام اور خود ہمارے پاک مذہب اسلام کی مخالفین کی نظروں میں اہانت ہوتی ہے۔ یہ انجمن کوشش کرے کہ یہ باہمی نزاع نہ ہونے پاتے اور جب کوئی اختلاف کسی گروہ میں واقع ہوا کرے تو وہ اس انجمن کے ذریعہ طے ہو جایا کرے" [1]

ندوۃ العلماء کے دوسرے اجلاس ۱۲، ۱۳، ۱۴ اپریل ۱۸۹۵ء منعقدہ بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ میں علمائے اسلام کے فرائض پر علامہ شبلی نعمانی نے جو تقریر کی تھی وہ بڑی اہم تھی۔ مولانا نے فرمایا تھا کہ:

"جس زمانے میں یہاں اسلامی حکومت قائم تھی اس وقت قوم کے دینی و دنیوی دونوں قسم کے معاملات علماء کے ہاتھ میں تھے۔ نماز روزہ وغیرہ کے احکام بتلانے کے علاوہ علماء ہی ان کے مقدمے فیصل کرتے تھے۔ علماء ہی جرائم پر حدود و تعزیر کی سزا دیتے تھے۔ علماء ہی قتل و قصاص کے احکام صادر کرتے تھے غرض قوم کی دین و دنیا دونوں کی عنانِ اختیار علماء کے ہاتھ میں تھی اب جبکہ انقلاب حکومت ہو گیا اور دنیوی معاملات کے فیصلے گورنمنٹ کے ہاتھ میں آ گئے تو ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ قوم سے علماء کا کیا تعلق باقی ہے جو در اصل علماء کا حق ہے اور جس میں دست درازی کرنی خود گورنمنٹ کا مقصود نہیں ہے ...... علماء کی موجودہ حالت، ان کی عزلت نشینی بلکہ بے پروائی نے عام طور پر یہ یقین دلایا ہے کہ ان کو جو تعلق قوم سے باقی رہ گیا ہے وہ صرف مذہبی تعلق ہے یعنی یہ کہ صرف نماز روزہ وغیرہ کے مسائل بتا دیا کریں باقی معاملات ان کی دسترس سے باہر ہیں اور ان کو ان معاملات میں دست اندازی کا کوئی حق حاصل نہیں .... الحاد اور دہریت

---

[1] روداد ندوۃ العلماء بابت سال اول حصہ اول ص ۲۳، ۲۴

کی طرف میلان جو روز بروز عام ہوتا جا رہا ہے، اس کا روکنا گورنمنٹ کو ممکن ہوتا تو زیادہ نہیں تو مذہب عیسوی کو اس سے محفوظ رکھ سکتی۔ لیکن اگر ہمارے علماء معقول طریقے پر اس کو روکنا چاہیں تو اس طرح اس کا قلع قمع کر سکتے ہیں جس طرح یونانی فلسفے کے پھیلنے کے وقت امام غزالیؒ، قاضی عضد، ابن رشد نے زندقہ والحاد کا استیصال کر دیا تھا۔[1]

دارالعلوم کے قیام کے بعد ۴ راکتوبر ۱۸۹۶ء کو جو جلسہ منعقد ہوا تھا اس موقعہ پر رپورٹ میں یہی بات دہرائی گئی تھی کہ دارالعلوم کے قیام کے چار مقاصد ہیں:

(۱) علوم وفنون کی تکمیل
(۲) علومِ دینیہ خصوصاً علم کلام میں کمال تاکہ دہریت والحاد کا مقابلہ کیا جا سکے اور علم فقہ میں تبحر تاکہ فارغین کے فتاویٰ مستند اور واجب العمل ہوں۔
(۳) مسلمانوں کو اسلامی اخلاق واطوار کا خوگر بنانا۔
(۴) طلبہ میں علو نظر اور بلند ہمتی پیدا کرنا۔[2]

مندرجہ بالا مقاصد کے مطابق نصاب بھی تیار کیا گیا اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ تعلیمی نصاب تیار کرنے کی بھی کوشش ہوئی اور دارالعلوم آج تک اسی نہج پر چل رہا ہے۔

کارنامے

چنانچہ اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ اس ادارے نے لٹریچر کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اس نے ایسے افراد پیدا کئے جو تحریر وتقریر کی بہترین صلاحیتوں سے مزین تھے۔ اس نے اسلامی تہذیب وتمدن پر بیش بہا کتابیں اردو زبان میں مہیا کیں جن سے قوم کے اندر بیداری آئی اور مغرب پر علمی تنقید سے اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ بالخصوص اسلامی تاریخ، سیرت اور مختلف اسلامی علوم پر اس ادارے کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

اس ادارے کے بانیوں اور سرپرستوں میں مولانا محمد علی مونگیریؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ،

---

[1] مضامین اربعہ ص ۱ تا ۳، شبلی نعمانی

[2] روداد اجلاس ششم ندوۃ العلماء (کانپور، ب، ت) ص ۳۰

مولانا شیروانی اور مولانا سید عبدالحیؒ وغیرہ کے نام ایسے ہیں جو برصغیر میں اسلامی علوم اور تقویٰ وطہارت کا نشان سمجھے جاتے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی نے جس علم کلام کی بنیاد رکھی اس کی تازگی وشادابی اب بھی باقی ہے، علامہ کی لازوال تصانیف سیرت النبی حجۃ الاسلام، الجزیۃ فی الاسلام، کتب خانہ اسکندریہ، الفاروق وغیرہ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ اسی لئے علامہ شبلی کے بارے میں سید سلیمان ندوی نے کہا ہے کہ "جو شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے جنہوں نے مستشرقین کے طریقہ سے انہی کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی فرحت بخش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا ——؟"

سید سلیمان ندویؒ نے سیرت النبی کی بقیہ جلدیں مکمل کیں جن میں اسلام کے مکمل نظام کی پوری تفصیل سے وضاحت کی۔ خصوصیت سے ساتویں جلد میں اسلام کے نظام حکومت کو نکھارا اور غلبۂ اسلام اور اقامت دین کے لئے مسلمانوں کو ابھارنے کی کوشش کی۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ نے ان کے بارے میں یہ شہادت دی تھی کہ "آج ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد سید سلیمان ندوی کے سوا اور کون ہوسکتا ہے؟"

لیکن اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ ندوہ وہ انقلابی شخصیات پیدا نہ کرسکا جو صحیح معنوں میں قدیم وجدید کی جامع ہوں اور علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان پل کا کام دے سکیں۔

دوسری طرف وہاں کا نصاب تعلیم ابھی تک ایسا جامع ومانع اور قدیم وجدید کا سنگم نہیں ہوسکا ہے کہ اس سے مطلوبہ فوائد حاصل ہوسکیں۔ چنانچہ سابق مدیر البعث الاسلامی مولانا محمد حسنیؒ کو بھی اس کمی کا احساس تھا۔ انہوں نے ایک بار فرمایا تھا کہ "نصاب تعلیم میں اس قدر تبدیلیاں ہونے کے باوجود اب بھی اس میں انقلابی تغیرات بلکہ اس کو نئے سرے سے ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ حقائق سے گریز اور واقعات سے چشم پوشی کسی خامی اور کمی کا ازالہ نہیں کرسکتی اور دیر سویر یہ پردہ چاک ہوکر رہتا ہے"[1]

---

[1] پیام ندوۃ العلماء ص ۱۴، سید محمد حسنیؒ

چنانچہ ندوہ کے پچاس سالہ جشن تعلیمی منعقدہ ۳۱ ر اکتوبر تا ۲ ر نومبر ۱۹۷۵ء میں اس ادارے کے ایک ہونہار فرزند کو مایوسی ہوئی کیونکہ اسے توقع تھی کہ اسلام اور اس کی تعلیمات کو نئے زمانے اور بدلتے ہوتے حالات کے پس منظر میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے کوئی پیش رفت ہوگی تاکہ اسلامی علوم و فنون میں ایسے متبحر اور بالغ فکر و نظر کے علماء پیدا ہوں جو اسلامی تعلیمات کو نئے انداز اور اس زبان میں پیش کریں جسے دُنیا سمجھتی اور قدر کرتی ہے[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ نصاب تعلیم اب بھی اصلاح طلب ہے۔ چنانچہ دسیوں سال پہلے مولانا مودودیؒ نے اس نصاب تعلیم پر جو تبصرہ کیا تھا وہ آج بھی درست ہے آپ نے فرمایا تھا کہ :

"اس نصاب تعلیم کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ کامیاب قسم کے مولوی پیدا کر لئے جائیں جو کچھ جرمن و امریکہ کی باتیں بھی کرنے لگیں۔ اس ذراسی اصلاح کا یہ نتیجہ کبھی نہیں نکل سکتا کہ دُنیا کی امامت و قیادت کی باگیں علمائے اسلام کے ہاتھ میں آجائیں اور وہ دُنیا جو آگ کے پیچھے چلانے والے ائمہ کے پیچھے چلی جارہی ہے، جنت کی طرف بلانے والے ائمہ کی رہبری قبول کرنے پر مجبور ہو جائے"[2]

اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا نظام وضع کیا جائے :

(۱) جس کی پہلی خصوصیت یہ ہو کہ دینی اور دنیوی علوم کی انفرادیت مٹا کر دونوں کو ایک جان کر دیا جائے۔

(۲) دوسری خصوصیت یہ ہو کہ ہر طالب علم کو مجموعۂ علوم بنانے کے بجائے اختصاصی تعلیم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

(۳) تیسری خصوصیت یہ ہو کہ تعلیم دینے والے اور تعلیم پانے والے دونوں کے سامنے ایک متعین اور واضح مقصد زندگی اور منتہائے سعی و عمل ہو یعنی یہ کہ ان سب کو

---

[1] اسلام اور عصر جدید جلد ۸ شمارہ ۱، جنوری ۱۹۷۶ء ص ۱۰۶ عبدالحلیم ندوی

[2] سید مودودی کا عہد ص ۱۰۲، سید نقی علی

مسلک خدا پرستی کی امامت دُنیا میں قائم کرنے کے لئے جہاد کبیر کرنا ہوگا۔[۱]

ندوۃ العلماء نے جدید و قدیم کے سنگم کا جو نعرہ لگایا تھا وہ مسلمانوں میں کافی مقبول ہوا۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء میں سرائے میر اعظم گڑھ میں مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد ڈالی گئی جسے علامہ فراہی اور مولانا شبلی نے کافی پروان چڑھایا۔ اس مدرسہ میں تفسیر قرآن اور فہم قرآن پر خصوصی توجہ دی گئی، عربی ادب کا مطالعہ ذوق و شوق سے کرایا گیا، سادہ، بااَنش اور فقر و سادگی کو شعار بنایا گیا۔ تحریک اسلامی ہند کو اس ادارے سے کافی تقویت ملی اور یہاں سے اسلام کے بہترین سپاہی نکلے۔

جامعہ دارالسلام عمرآباد میں بھی یہی نصاب کم و بیش جاری ہوا اور جدید و قدیم کے سنگم کی بات اس نے بھی کی۔ جنوبی ہند کے مسلمانوں میں اس نے جو دین کی خدمت انجام دی ہے اور گروہی عصبیت سے اعراض کر کے مسلکی آزادی اور رواداری کو جس طرح فروغ دیا ہے اس کی مثال ان مدارس میں مشکل سے ملے گی۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اسے جنوب کا ندوہ کہا تھا۔

۱۳۲۹ھ میں بھوپال میں تاج المساجد کی وسیع مسجد میں ایک دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا جس میں ندوۃ العلماء کے نصاب اور طریق تعلیم کی پیروی کی گئی۔ مدھیہ پردیش میں آج بھی یہ اہم دینی و تعلیمی مرکز سمجھا جاتا ہے۔

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ نے بھی قدیم و جدید کے امتزاج کا نعرہ بلند کیا ہے اور اس نے اپنے مقاصد میں یہ شامل کر رکھا ہے کہ ایسے افراد تیار کئے جائیں جو قرآن و سُنت کا گہرا علم اور صحیح دینی بصیرت رکھتے ہوں، جن کی نظر وقت کے اہم مسائل پر بھی ہو اور جو غیر اسلامی نظریات سے بھی بخوبی واقف ہوں، جو اسلامی اخلاق و کردار کے حامل ہوں جن میں احیائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کا صحیح جذبہ ہو اور جو گروہی، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالا ہو کر وسعت قلب و نظر کے ساتھ معاشرے کی اصلاح و تعمیر کا فریضہ انجام دیں۔ اور دوسری طرف اس نے اپنے مقصد میں یہ بات بھی شامل کر رکھی ہے کہ ایسا نصاب تعلیم زیر عمل لایا جائے جس میں دینی اور دنیوی تعلیم کا بہترین امتزاج ہو۔ جامعۃ الفلاح اپنے ان مقاصد کے حصول میں کسی حد تک کامیاب بھی ہے۔ اس کی عالمیت کی سند انٹرمیڈیٹ

کے مساوی تسلیم کی جاتی ہے اس کے طلبہ تحریکِ اسلامی کا علم اُٹھاتے ہوئے ہیں اس کے طلبہ قدیم اپنا ایک آرگن حیات نو کے نام سے نکالتے ہیں جس نے نہایت قلیل مدّت میں علمی و ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔

اس طرح ندوہ نے جس سفر کا آغاز کیا تھا اس پر متعدد مدارس نے اس کا ساتھ دیا۔ کہیں جوں کا توں اسے راہنما بنا لیا گیا، کہیں حذف و اضافہ کے بعد اس کی رہنمائی تسلیم کی گئی اور کہیں اس کے بنیادی مقصد کو سامنے رکھ کر طریقہ کار اور رفتار کار کو خود متعین کیا گیا۔

آٹھواں باب

بیسویں صدی کی چند شخصیات

جنہوں نے معاشرے میں ہلچل پیدا کردی

(۱) علّامہ شبلی نعمانیؒ

(۲) مولانا الطاف حسین حالیؒ

(۳) اکبر الہ آبادیؒ

(۴) حمید الدین فراہیؒ

(۵) ابو الکلام آزادؒ

(۶) حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ

(۷) علّامہ شبیر احمد عثمانیؒ

نیا دور

بیسویں صدی کے آغاز سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جسے حرکت و عمل کا دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں علامہ شبلی کی تاریخ نویسی اور سیرت نگاری معاشرے میں ایک انقلاب پیدا کرتی ہے، حالی کی مسدس گھر گھر پہنچتی ہے اور مسلمانوں کے خون میں گرمی پیدا کر دیتی ہے، اکبر الہ آبادی مغربی تہذیب پر نشتر زنی کرتے ہیں، معلم فراہی قرآن کے نظم کلام اور اصولِ تفسیر کے ذریعہ اُمت کو براہِ راست قرآن سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امام الہند آزاد الہلال اور البلاغ کے مضامین سے صورِ انقلاب پھونک دیتے ہیں، حکیم الاُمت اشرف علی تھانوی اپنی تحریروں سے دین کے مسائل کی توضیح و تشریح کرتے ہیں اور علامہ عثمانی دو قومی نظریہ کی حمایت کر کے مسلمانوں کو متحدہ قومیت کی گود میں جانے سے روکتے ہیں اور اس طرح مسلمانوں کے اندر حرکت اور بیداری پیدا ہوتی ہے اور ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

علّامہ شبلی نعمانیؒ

مولانا (۱۸۵۷ء — ۱۹۱۴ء) نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، مسلمانوں کا دانشور طبقہ انگریزوں کے علوم اور ان کی تہذیب سے پوری طرح مرعوب تھا۔ سرسید، مولوی چراغ علی اور دوسرے مخلص مسلمان مَا لَا يُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا يُتْرَكُ كُلُّهٗ، کہ اگر پورا نہ مل سکے تو ادھورا ہی سہی کے اصول پر اپنے فرائض نبھا رہے تھے لیکن یہ پورا گروہ زمانے کی ترقیوں اور عصرِ جدید کے افکار سے اتنا متاثر اور مرعوب تھا کہ یورپ کے نظریات کو صحیح مان کر شریعت اسلامیہ کے اندر پیوند کاری کر رہا تھا اور "خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں" کا مصداق ثابت ہو رہا تھا۔ یہ علامہ شبلی تھے جنہوں نے پوری جرأت و بے باکی سے انبیاء کی تعلیمات کو قطعی و یقینی مان کر زمانہ کے حالات و مسائل کو ان پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ ہم علامہ مرحوم کے کارناموں کو مختصر انداز میں تین شقوں میں بیان کر سکتے ہیں:

(۱) مسلمانوں کا ماضی سے رشتہ جوڑنا

علامہ مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ یورپ کی علمی وفکری بالادستی اور چیرہ دستی کا جو رعب مسلم نوجوانوں پر چھا گیا تھا اور جس کی وجہ سے انہیں نہ صرف اپنا حال بلکہ اپنا ماضی بھی تاریک نظر آ رہا تھا، اس کو دور کیا۔ یورپ کے اہلِ قلم اور مصنفین نے اسلام سلاطین اسلام اور علوم اسلامیہ کی طرح طرح برائیاں لکھ کر لوگوں کو ماضی سے کاٹ دیا تھا اور مسلمانوں کی نئی پود کے اندر اپنی قوم سے نفرت اور حقارت پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ مسلمان قوم جس نے ماضی میں تہذیب و تمدن کے بے مثال کارنامے انجام دیئے اور جس سے یورپ کے ماہرین نے استفادہ کیا تھا، اب وہ اپنی تاریخ سے گھن کرنے لگی تھی۔ مولانا نے اس احساسِ کہتری کو ختم کرنے اور اس سازش کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے قلم کو جنبش دی

اور "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم"، "المامون"، "سیرۃ النعمان"، الغزالی اور الفاروق جیسی بے مثال کتابیں لکھ کر اور اپنے خطبوں اور مقالات کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر پھر اپنے ماضی سے محبت کو اجاگر کیا۔ علمی تحقیق وتدقیق کے ذریعہ مستشرقین کے حوالوں کی کمزوری اور غلطی بتائی اور دوسری طرف اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تاریخ وتمدن کے شاندار واقعات اور اہم کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کیا جس سے قوم کے فسردہ اور پژمردہ دلوں میں تازگی پیدا ہوئی۔ ایک نئی اُمنگ، نیا جذبہ اور حوصلہ ابھرا۔ دشمنوں کے اعتراضات کی بے وقعتی سامنے آئی اور مستشرقین کا سارا پول کھل گیا۔

(۲) جدید تعلیم اور اس کے اثرات پر تنقید کی

علامہ شبلی علی گڑھ میں کافی دنوں تک رہے اور سر سید کی معیت میں ایک لمبا عرصہ گزارا لیکن نئی تہذیب وتعلیم کی چمک دمک ان کو نگاہوں کو خیرہ نہ کر سکی کیونکہ حق وباطل کی تمیز کی پوری بصیرت ان میں موجود تھی۔ جدید تعلیم پر ان کا پہلا تبصرہ ان کے ایک خط سے دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں:

> "یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش نام کو نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا۔ بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے لَاحَولَ وَلاَ .... وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے۔
>
> سید صاحب نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے۔ صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی پیدا نہیں کرتی"[۱]

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مولانا انگریزی تعلیم کے مخالف تھے۔

---

[۱] مکاتیب سمیع ۱۰، ماخوذ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی ص ۱۳۱

اس کے آپ کتنے زبردست حامی تھے اس کا اندازہ آپ کے زندہ جاوید کارنامے شہر اعظم گڈھ میں نیشنل اسکول کے قیام مورخہ ۲۰ رجون ۱۸۸۳ء سے ہو سکتا ہے۔ پھر اس سلسلے میں آپ کے احساسات کا اندازہ اس دلچسپ واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے جو ۱۹۱۲ء میں انہوں نے اپنی ایک تقریر میں بیان کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں ٹرکی سے واپس آیا تھا تو اتفاق سے گھر میں علالت تھی۔ ایک رات کو بارہ بجے تار آیا۔ میں نے اس کو کھولا۔ دل میں دُبدھا پیدا ہوا کہ کیا واقعہ ہے۔ خدا جانے کیسا تار ہے۔ خیر میں دوڑا ہوا سر سید مرحوم کے نواسے کے پاس گیا۔ انہوں نے پڑھ کر سنایا کہ یہ تار نواب علی حسن خاں صاحب نے بھوپال سے بھیجا ہے وہ آپ کو ٹرکی سے واپس آنے پر مبارک باد دیتے ہیں۔ یہ حال ہم مولویوں کا ہے[1]۔ اسی لئے وہ ندوہ میں انگریزی پڑھانے پر بضد تھے چنانچہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں اس کے داخل کئے جانے کی تحریک ۱۸۹۹ء میں کی مگر کامیابی نہ ہوئی آخر ان ہی کے اصرار سے ۱۹۰۳ء میں انگریزی ایک ضروری مضمون کی حیثیت سے شریک کی گئی۔ اصل میں مولانا کا احساس تھا کہ اگر وہ انگریزی جانتے ہوتے تو کیا کچھ اسلام کی خدمت کر سکتے تھے اس لئے من نہ کردم شما حذر بکنید۔ کے اصول پر وہ چاہتے تھے کہ اب علماء ایسے ہوں جو اس خدمت کو بجا لا سکیں[2]۔

(۳) سیرت النبی کا بے مثال کارنامہ

علامہ مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سیرت النبیؐ سے مسلمانوں کا رابطہ جوڑا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہونے والے اعتراضات کا کافی و شافی جواب دیا۔ دوسری طرف اُسے مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ بنا کر پیش کیا۔ مولانا کی نگاہ میں سیرت کی حیثیت ایک کتاب کی نہ تھی بلکہ وقت کے علم کلام کی سب سے بڑی ضرورت کا نام ان کی اصطلاح میں سیرت تھا۔ فرماتے ہیں:

> " اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب

---

[1] روداد ندوہ اجلاس لکھنؤ ۱۹۱۲ء ص ۱۵۶

[2] حیات شبلی ص ۱۲۵، سید سلیمان ندوی

صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے لیکن جب اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے[1]

اسی بنا پر ان کی اصطلاح میں سیرت کلمۂ اسلام کے دوسرے جزو یعنی محمد رسول اللہ کی پوری تفسیر و تشریح کا نام تھا اور یہی آپ کا آخری اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

---

[1] سیرت النبی جلد اول

مولانا الطاف حسین حالیؔ

۱۸۳۷ء ـــــ ۱۹۱۴ء

مولانا حالی کو حساس اور درد آشنا دل میسّر ہوا تھا۔ حق پسندی اور حق گوئی اس مرد درویش کی نمایاں صفت تھی۔ دینداری اور خدا پرستی کا یہ سچا مبلغ تھا۔ اس نے جب آنکھیں کھولیں اور اپنے ماحول پر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ:

"قوم کی حالت تباہ ہے، عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے ہیں، علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے، افلاس کی گھر گھر پکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے، اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا پوری قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امراء جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے تھے غافل اور بے پروا ہیں۔ علماء زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں"[1]

مولانا حالی نے اس اجڑے باغ کی نشاندہی کرنے کے بعد گل و بلبل کی شاعری نہ کی۔ قوم کا گھر جلتا دیکھ کر روما کے شہنشاہ نیرو کی طرح بیٹھے بانسری بجانا پسند نہ کیا۔ بلکہ انہوں نے دل و دماغ سے جو کچھ محسوس کیا وہ آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک پڑا۔ حالی کی شاعری چوٹ کھائے ہوئے دل کی فریاد ہے مگر کس کے دل کی؟ وہ ایک فرد واحد الطاف حسین حالی کا دل نہیں، بلکہ قوم و ملت اور ایک تہذیب و تمدن کا دل ہے جو اسی وسعت میں ایک جہان درد و آرزو لئے ہوئے ہے[2]

---

[1] دیباچہ طبع اوّل مسدس ص ۵۱، ۵۲، مولانا حالی،

[2] مسدس حالی کی مصلحانہ شان از خواجہ غلام السیدین تقریب مسدس حالی صدی ایڈیشن ص ۴۱

دعوت دین اور اصلاح و تبلیغ کے نقطۂ نظر سے مسدس کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں قوم کے ہر طبقہ کو اپنی دردناک تنقید کے ذریعہ بے نقاب کیا ہے۔ سرورِ کائناتؐ کی بارگاہ میں عرضِ حال کرتے ہوئے کہتے ہیں :

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے　　اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے　　اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آکے ملائے　　اُس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جُدا ہے
جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا　　اب جنگ و جدل چار طرف اُس میں بپا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی　　اس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے
عالم ہے سو بے عقل ہے، جاہل ہے سو وحشی　　منعم ہے سو مغرور ہے، مفلس ہے سو گدا ہے
چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں　　پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے
دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے　　اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے[1]

جو لوگ یہ کہتے تھے کہ شاعری تو فنِ لطیف ہے جس کا اخلاق کی اصلاح یا تعمیرِ انسانیت سے کوئی مطلب نہیں، انہیں مولانا حالیؒ نے بُری طرح لتاڑا ہے۔ ان کے نزدیک شاعری اور ادب اور دوسرے تمام فنونِ لطیفہ انسانی اخلاق سے براہِ راست متعلق ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں :

"شعر سے جس طرح نفسانی جذبات کو اشتعال ہوتی ہے اسی طرح طوفانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں اور انسان کی رُوحانی اور پاک خوشیوں کو اس کے اخلاق کے ساتھ ایسا صریح تعلق ہے جس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ شعر اگرچہ براہِ راست علمِ اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا، لیکن از روئے انصاف اس کو علم الاخلاق کا نائب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں"[2]

شعر و ادب کے نام پر جو اباحیت، خدا بیزاری، اقدار کی بیخ کنی، آزادیٔ شہوت اور ہوس رانی پروان چڑھی اس پر مولانا حالی نے کھل کر تنقید کی اور صاف لفظوں میں کہا کہ ـــ

---

[1] عرضِ حال از مسدس حالی ص ۱۷۷،

[2] مقدمہ شعر و شاعری ص ۲۰، ۲۱، مولانا حالی۔

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر — ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر

ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ ہے بعف نظر علم انشا ہمارا

اور آخر میں تو شعراء بد کے خلاف فتویٰ تک صادر کر دیتے ہیں :

گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے — جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے[1]

یہ دراصل اس آیت کی تفسیر ہے جو سورۃ شعراء میں ارشاد ہوئی ہے - اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَالَا يَفْعَلُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۔ (شعراء ۲۲۴ تا ۲۲۷)

(رہے شعراء تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں - کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں - بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو صرف بدلہ لے لیا -)

یہاں شعراء کی مذمت سے صرف انہی کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار خصوصیات کے حامل ہوں - اوّل یہ کہ وہ مومن ہوں ، دوسرے یہ کہ اپنی عملی زندگی میں صالح ہوں ، تیسرے یہ کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہوں اور چوتھے یہ کہ وہ ذاتی اغراض کے لئے تو کسی کی ہجو نہ کریں ، البتہ جب ظالموں کے مقابلے میں حق کی حمایت کے لئے ضرورت پیش آئے تو پھر زبان سے وہی کام لیں جو ایک مجاہد تیر و شمشیر سے لیتا ہے[2]

شرک و بدعت میں ملوث مسلمانوں پر دیکھئے ، مولانا حالی کس طرح تنقید کرتے ہیں

---

[1] مسدس حالی ص ۱۲۱ ، ۱۲۲ ۔

[2] ترجمہ قرآن مجید سورۃ شعراء حاشیہ ۱۴۵ ص ۹۵۰ ، مولانا مودودیؒ

کرے غیر گر بُت کی پوجا تو کافر   جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
کہے آگ کو اپنا قبلہ تو کافر   کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں،
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں   اماموں کا رُتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں   شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دُعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے[1]

مولانا حالی نے گل و بلبل کی شاعری میں اُمت مرحومہ کے عروج وزوال کی داستان چھیڑ کر ایک عظیم انقلاب برپا کیا۔ شاعری کو مقصدیت اور تعمیر زندگی سے ہمکنار کیا اور بے مقصد شاعری پر کاری ضرب لگائی ہے۔ آپ کی کتابیں مسدس اور مقدمہ شعر و شاعری اصلاح و تبلیغ کی دُنیا میں اہم مقام رکھتی ہیں۔

---

[1] مسدس حالی ص ۱۰۸

لسانُ العصر اکبر الہ آبادیؒ

(۱۸۴۶ء — ۱۹۲۱ء)

تقریباً یہی دور ہے جب اکبر الہ آبادی اصلاح معاشرہ اور تبلیغ اسلام کے اسٹیج بلوہ گر نظر آتے ہیں۔ اکبر مذہب کے پکے متبع اور مشرقیت کے دلدادہ تھے۔ انہیں مشرق رب کا غلبہ کبھی گوارا نہ تھا، چنانچہ انہوں نے تیکھے اور ترش اشعار سے مغربی تہذیب کے ات کو زائل کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف قدیم ماحول کے جمود اور اندھی تقلید پر ا کاری ضرب لگائی۔ مسلمانوں کی معاشرت اور تہذیب و تمدن کا نقشہ اشعار میں کھینچ کر دیا اور انہیں بتایا کہ ترقی یہ نہیں ہے جو تم سمجھ بیٹھے ہو بلکہ تمہاری ترقی ماضی کی طرف نے میں ہے ؎

ان کے مضبوط جہازوں کی مددگار ہے آگ
میری ٹوٹی ہوئی کشتی کا سہارا اسلام

علی گڑھ کی جدت پر بڑی کڑی تنقید کی ؎

ابتدا کی جناب سید نے جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پر ہوئی قوم کا کام اب تمام ہوا

مغربی مستشرقین کی سازشوں کو دیکھئے کس طرح بے نقاب کرتے ہیں ؎

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے — جب بسولہ ہٹا تو رندہ ہے

مستقبل کے سلسلے میں بڑے تیکھے انداز میں پیش گوئی کرتے ہیں ؎

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے — نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نہ قانونوں میں رہ جائے گی پردے کی پابندی — نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے
بدل جائے گا معیار شرافت چشمِ دنیا میں — زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے | نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا | ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے

تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

اور یہ مزاحیہ شعر بھی دیکھتے چلئے ؂

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

پرانی روشنی اور نئی روشنی پر یہ تبصرہ بھی ملاحظہ فرمایئے :

اُدھر یہ ہٹ ہے کہ لمنیڈ بھی چھو نہیں سکتے
اِدھر یہ ضد ہے کہ ساقی صراحی مے لا

⁂ ⁂ ⁂

پُرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے | اُسے کشتی نہیں ملتی اِسے ساحل نہیں ملتا

تہذیب جدید پر دیکھئے کس بلا کی تنقید کی ہے ؂

عقل سپرد ماسٹر، مال سپرد آنجناب | جان سپرد ڈاکٹر، رُوح سپرد ڈارون

⁂ ⁂ ⁂

لکھے گا کلکِ حسرت دُنیا کی ہسٹری میں | اندھیرا ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

⁂ ⁂ ⁂

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے | تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ ہے کوئی جج ہے

⁂ ⁂ ⁂

بے پردہ نظر آئیں کل جو چند بی بیاں | اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ یہ کیا ہوا | کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

اس بابت یہاں تک پیشین گوئی کردی ہے کہ ؂

بٹھائی جائیں گی پردے میں بیبیاں کب تک | بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک
حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی | تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک
جو منہ دکھائی کی رسموں پہ ہے مصر ابلیس | چھپیں گی حضرت حوا کی بیٹیاں کب تک

سُنا ہے حضرت اکبر ہیں حامیٔ پردہ   مگر وہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک

ہوتے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جاکر

حق گوئی اور بیباکی کا پیکر تھے۔ بلاخوف لَو مَتہ لاَئم دل کی بات کہتے تھے ؎

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

خدا کی پاکی پکارتا ہوں   ہوا کرے ناخوشی بتوں کو

ملک میں مجھ کو ذلیل و خوار رہنے دیجئے   آپ اپنی عزت دربار رہنے دیجئے
ٹیمز میں ممکن نہیں نظارہ موجِ فرات   ایسی خواہش کو سمندر پار رہنے دیجئے

سید بشیر حسین صاحب کا بیان ہے کہ نان کوآپریشن کے دور میں مسٹر گوج کمشنر نے لکھ کر بھیجا کہ آپ گورنمنٹ سے پنشن پاتے ہیں۔ نان کوآپریشن کی مخالفت میں شعر کہیئے۔ ناگوار ہوا اور فرمایا :؎

بھرتے ہیں میری آہ کو مونوگراف میں   کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے

اشارہ کیا گیا کہ خاموش رہیئے۔ کچھ نہ کہیئے تو فرمایا ؎

اک غل مچا کہ اس میں بھی لیسنس ہے ضرور
منہ کھل چکا تھا ورنہ مرا آہ کے لئے[1]

ایک جگہ اور فرماتے ہیں ؎

یاالٰہی یہ کیسے بندر ہیں   ارتقاء پر بھی آدمی نہ ہوئے

آپ نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان مغربی علوم و فنون حاصل کریں لیکن خدا و مذہب سے بیزار نہ ہوں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں پہ اڑو چرخ پہ جھولو

پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

کامیابی خارج از علت سے ناکامی بھلی
لطف دشمن ہی سے شہرت ہو تو ناکامی بھلی

بے وفا سمجھیں تمہیں اہلِ حرم اس سے بچو
دیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی

ایک اور غزل کے اشعار ہیں ؎

آج وہ ہنستے ہیں میرے جبہ و شلوار پر
ایک دن ان کو فلک بندھوائے دھوتی تو سہی

اپنی اسکولی بہو پر ناز ہے ان کو بہت
کمپ میں ناچے کسی دن ان کی پوتی تو سہی

غرضیکہ اکبر الٰہ آبادی نے اپنے تیکھے اشعار سے جہاں قدیم ماحول کے جمود کو توڑا وہیں جدید تہذیب کی آلائشوں کو بھی منظر عام پر لائے اور اسلامی تہذیب و تمدن کو اپنانے اور اسلام کی طرف پلٹنے کی دعوت دی۔

معلّم حمیدالدین فراہیؒ

(سنہ ۱۲۸۰ھ ـــ سنہ ۱۳۴۹ھ)

علامہ حمیدالدین فراہیؒ گرچہ میدان عمل میں اتر کر عوام کی قیادت و رہنمائی کا فریضہ انجام نہ دے سکے اور یہ طریق کار ان کے فکر و نظر سے مختلف تھا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ پہلے علماء کی فکری و علمی خرابیاں دور ہونی چاہئیں کیونکہ جب تک ان کی اصلاح نہ ہو، عوام کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ علماء کی اصلاح کو مسلمانوں کی اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے اظہار افکار کا ذریعہ عربی زبان کو بنایا[1]

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خالص اکیڈمک طرز کے مصنف اور محقق تھے بلکہ ان کی تمام فکری کاوشیں ایک گہرے جذبۂ اصلاح کا نتیجہ تھیں۔ وہ قرآن کی روشنی میں مسلمانوں کے تمام علوم و افکار کا جائزہ لے کر ایک طرف تو یہ چاہتے تھے کہ باطل افکار و نظریات کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیں اور دوسری طرف زندگی کے تمام پہلوؤں اور اس کے مسائل پر غور کرنے کے لئے قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کی راہیں کھول دیں چنانچہ وہ اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

علامہ نے قرآن پاک پر غور و تدبر کا کام باضابطہ طور پر اس زمانہ میں شروع کیا جب وہ علی گڑھ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرسید مرحوم مغربی نظریات سے مرعوبیت کے نتیجے میں قرآن کی من مانی تاویلات کر رہے تھے اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جو انگریزوں اور ان کے افکار و نظریات سے مرعوب تھا بڑی طرح ان تاویلات کا شکار ہو رہا تھا۔ علامہ فراہی نے اس فتنہ کو جہاں انگریزوں کے تسلط کا ایک قدرتی نتیجہ

---

[1] ترجمہ قرآن مجید کا مقدمہ ص ۳۴۲، مولانا امین احسن اصلاحی

خیال کیا، وہیں انہیں یہ بھی احساس ہوا کہ مذہبی علوم خصوصاً قرآن پاک کی تعلیم و تعلّم کا جو طریقہ مسلمانوں میں رائج رہا ہے وہ بالکل ہی غلط اور فرسودہ ہے اور اسی غلط اور فرسودہ طریقے نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو فکری اعتبار سے اس قدر کمزور اور منفعل بنا دیا ہے کہ بڑی آسانی سے وہ ہر فتنے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ قرآن پاک پر غور کرنے کا وہ صحیح طریقہ اختیار کیا جائے جس سے حکمت قرآن کے دروازے کھلیں تاکہ مسلمان مغرب کی فاسد عقلیت سے مرعوب ہونے کے بجائے قرآن کی صالح عقلیت سے اس کا مقابلہ کر سکیں[1]۔ چنانچہ علّامہ نے رفتہ رفتہ قرآن کے وہ اصول دریافت کیے جن کی تھوڑی سی وضاحت یہاں ضروری ہے۔

فہم قرآن کے چند اصول

(۱) علامہ مرحوم نے سب سے اوّلین توجہ قرآن پر دی۔ ان کی نگاہ میں تفسیر قرآن میں جو پہلی چیز مرجع کا کام دے سکتی ہے وہ خود قرآن ہے اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا فہم ہے۔ علامہ مرحوم کو اس بات پر یقین تھا کہ صحیح احادیث اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ تاہم انہوں نے روایات کو بطور تائید پیش کیا ہے بطور اصل نہیں[2]۔

(۲) علّامہ مرحوم کا خیال تھا کہ شان نزول کی تلاش میں سر رشتہ نظم کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیئے ورنہ اس کی مثال اس مسافر کی ہو جائے گی جو اندھیری رات میں ایک چوراہے پر پہنچ گیا ہو اور نہیں جانتا کہ اب کدھر جائے۔ علّامہ کا کہنا تھا کہ شان نزول خود قرآن سے اخذ کرنا چاہیئے۔ اور احادیث اور روایات کے ذخیرے میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی تائید کریں[3]۔

(۳) خبر اگرچہ متواتر ہو قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ اس کی یا تو تاویل کریں گے یا اس میں توقف کریں گے، لیکن اس کی خاطر قرآن کو منسوخ نہیں کریں گے[4]۔

---

[1] علّامہ حمید الدین فراہی ــــ ایک عظیم مفسر ص ۱۵، ۱۶، عنایت اللہ سبحانی

[2] مقدمہ تفسیر ص ۲۰، حمید الدین فراہیؒ

[3] ایضاً ص ۲۶ [4] ایضاً ص ۳۲

(۴) اسی کتاب (مقدمہ تفسیر) کے صفحہ ۵۴ پر لکھتے ہیں:

"قرآن مجید بالکل قطعی الدلالت ہے، ہر آیت میں مختلف معانی کا احتمال محض ہمارے قلت علم و تدبر کا نتیجہ ہے جن علماء نے اپنی تفسیروں میں بہت سے اقوال نقل کر دیئے ہیں، ان کا منشا یہ ہے کہ آیت کی تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کو ہمارے سامنے رکھ دیں۔ اس میں سے قول راجح کا انتخاب انہوں نے ہماری تمیز پر چھوڑا ہے پس یہ بات جائز نہیں ہے کہ ہم بغیر کسی ترجیح و انتخاب کے تمام رطب و یابس یاد کر چھوڑیں۔"

(۵) مولانا کے نزدیک اعجاز قرآن کے اغراض و مقاصد میں سے نہیں بلکہ اس کے لوازم میں سے ہے۔ اس کائنات کے اندر ایک چھوٹے سے دانے بلکہ ایک حقیر سے حقیر ذرے سے لے کر اس گنبد گردوں تک جو کچھ ہے معجزہ ہی معجزہ ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی بھی خلقت اظہار اعجاز کے لئے نہیں ہوتی ہے۔

(۶) علامہ کے نزدیک ہر سورہ کا عمود ایک ہی ہوتا ہے اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ سب سے زیادہ عظیم الشان بات ہو بلکہ اس کا سب سے زیادہ جامع ہونا ضروری ہے کیونکہ وہ سورہ کے تمام مطالب کے لئے شیرازہ کا کام دیتا ہے ہاں بیان کے لحاظ سے وہ سورہ کے اندر سب سے اہم چیز ہوتی ہے۔

(۷) تمام آیات ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں۔ ان کے اندر باہم ترتیب و مناسبت ہوتی ہے۔ اگر کوئی چیز قرآن میں کسی دوسری چیز کے ساتھ ملائی جاتی ہے تو اس میں "قران نجوم" کے مانند گوناگوں مناسبتیں ہوتی ہیں اور ہر ترتیب اپنے اندر ایک نیا جلوۂ حسن و جمال رکھتی ہے۔

(۸) ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے اور سورتوں کے مطالب میں جو بے نظمی نظر آتی ہے وہ محض قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔

(۹) چھوٹی سورتیں بھی ربط و نظام کے محاسن کے لحاظ سے بڑی سورتوں کی ہمسر ہیں۔ چھوٹی سورتوں کے اندر بھی ربط و پیوستگی کی وہ تمام نزاکتیں موجود ہیں۔ جو بڑی سورتوں کے اندر ہیں۔

(۱۰) اپنی کتاب نظام القرآن میں بنیادی طور پر نظم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ان

کا کہنا ہے کہ قرآن جو اسرار و حکم کا ایک لازوال خزینہ ہے یا علوم و معارف کا ناپیدا کنار سمندر ہے، اس کا راز اسی نظم میں پوشیدہ ہے[1]

(۱۱) قسموں کے سلسلے میں مولانا کا بیان تھا کہ وہ مُقسَم علیہ پر دلیل و شہادت ہیں۔ چنانچہ قرآن کی مختلف قسموں کو بطور مثال پیش کر کے اپنے خیال کو مدلل اور مستحکم بنایا ہے[2]

علمائے تفسیر پر آپ کے اثرات

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ آپ کے بعد ہند و پاک میں جتنی تفسیریں لکھی گئیں ان سب میں فکرِ فراہی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ میری مراد مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی سے ہے۔

مولانا آزاد نے مولانا فراہی سے کس قدر خوشہ چینی اور استفادہ کیا ہے، اس کا اندازہ علامہ سید سلیمان ندوی کی اس تحریر سے لگایا جا سکتا ہے کہ:

"مولانا شبلی کے اصرار سے کئی دفعہ مولانا فراہی ندوہ میں آ کر رہے اور طلبہ کو کبھی فلسفۂ جدیدہ اور کبھی قرآن کے سبق پڑھائے۔ میں بھی اس زمانہ میں ندوہ کا طالب علم تھا مولانا کے ان درسوں سے مستفید ہوا۔

اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد مولانا شبلی مرحوم کے پاس ندوہ میں مقیم تھے اور الندوہ کے مددگار ایڈیٹر تھے۔ وہ مولانا حمید الدین صاحب کی ان صحبتوں سے مستفید ہوتے رہے اور قرآن پاک کے درس و نظر کے نئے راستوں کے نشان پانے لگے۔ اور بالآخر الہلال کے صفحات میں اس جادہ پیمائی کے مختلف مناظر سب کی نظروں کے سامنے آتے۔"[3]

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر نظام القرآن، علامہ حمید الدین فراہی

[2] ملاحظہ ہو رسالہ اِمعان فی اقسام القرآن

[3] ماہنامہ معارف اعظم گڈھ شمارہ ۱ جلد ۲۶

اُس دور میں (۱۹۱۹ء سے پہلے) دو یا تین زندہ ہستیاں بھی ایسی تھیں جن سے طبیعت رفتہ رفتہ اور بہت تدریجی ارتقاء سے سہی، —— لیکن بہرحال اصلاحی اثر قبول کرتی رہی، ایک اردو کے مشہور کلیم ظریف شاعر اکبر الہ آبادی ہیں، دوسرے کامریڈ کے ایڈیٹر اس وقت کے مسٹر اور اس درمیان میں مولانا ہو جانے والے محمد علی، ان دو کے بعد ہلکا ہلکا اثر مولانا حمید الدین مفسر قرآن کا بھی پڑتا رہا۔[۱]

مولانا مودودیؒ ان سے کتنا متاثر تھے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل تحریر سے لگائیے:

"سلسلۂ تفاسیر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ اس کے جس جزو کو بھی پڑھیں گے وہ آپ کو صرف اس سورہ کے معنی و مطلب سے آشنا نہ کرے گا جس کی تفسیر اس جزو میں کی گئی ہو بلکہ اس کے ساتھ ہی پورے قرآن کو سمجھنے کے لئے آپ کو بہت سی اصولی معلومات بھی دے گا، تحقیق کے نئے راستے دکھائے گا۔ تدبر فی القرآن کے نئے نئے دروازے کھولے گا۔"[۲]

مولانا امین احسن اصلاحی تدبر قرآن میں بار بار اس حقیقت کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں کہ اس تفسیر کے ذریعہ اگر کوئی خدمت قرآن پاک کی انجام پائی ہے تو یہ سراسر امام کی صحبت و تربیت کا اثر ہے۔

اسلام سے شدید محبت

علامہ مرحوم کو اسلام سے کتنا لگاؤ تھا اور وہ حق گوئی میں کتنے بیباک تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ میں قیام کے دوران جب سرسید مرحوم کو اپنی تفسیر قرآن کا عربی ترجمہ کرانے کا خیال پیدا ہوا اور اس کے لئے نگاہ انتخاب مولانا مرحوم پر پڑی تو انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ میں اس معصیت میں اور اس کی اشاعت میں حصہ لوں اس کی مجھ سے توقع نہ رکھنی چاہیئے۔ غالباً مولانا کے اس جواب کے بعد تفسیر کے عربی ترجمہ کی تجویز ہی سرے سے ختم ہو گئی۔

علی گڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر مشہور مستشرق ڈاکٹر آرنلڈ تھے۔ مولانا ان سے

---

[۱] مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ۵۰۔

[۲] ترجمان القرآن جلد ۱۹ عدد ۴، ۵، ۶۔

خوش ہرگز نہیں تھے۔ وہ آرنلڈ صاحب کو بھی اسی بساط سیاست کا ایک مہرہ سمجھتے تھے جو انگریزوں نے ہندوستان بھر میں بچھا رکھی تھی۔ علی گڑھ کا حلقہ ڈاکٹر آرنلڈ صاحب کی کتاب (PREACHING OF ISLAM) کا بڑا مدّاح تھا، لیکن مولانا اس کے سخت مخالف تھے وہ فرماتے تھے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے اندر سے رُوحِ جہاد ختم کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔

معاصرین کا خراجِ عقیدت

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق ناظم مولانا عبدالحیؒ لکھنوی علامہ فراہی کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

"وہ چوٹی کے علماء میں سے تھے، علوم ادبیہ سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے۔ انشاء و ادب پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ ادباء اور ادبی علوم سے انہیں بڑا لگاؤ تھا۔ فہم و فراست، ذکاوت و ذہانت، زہد و عفت، نیک نفسی و بلند ہمتی کی وہ تصویر تھے۔ لایعنی باتوں سے بہت دُور، ابنارِ دُنیا سے بالکل بے پروا، عربی علوم میں انہیں رسوخ حاصل تھا۔ بلاغت پر گہری نظر تھی۔ جاہلی دواوین اور عربی اسالیب کلام پر وہ حاوی تھے، صحف سماویہ کا بڑا وسیع مطالعہ تھا۔ یہود و نصاریٰ کی کتابوں پر اچھی نظر تھی۔ ان کی ساری دلچسپیوں اور عرق ریزیوں کا محور قرآن پاک تھا۔ وہ قرآن پاک پر غور و تدبر کرتے، اس کے بحرِ معانی میں غوّاصی کرتے، اس کے تمام اسالیب کو سمجھنے کی کوشش کرتے، ان کا عقیدہ تھا کہ پورا قرآن ایک مرتب و منظم کلام ہے ساری آیات ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں۔ چنانچہ ان کی تفسیر نظام القرآن کا اصل الاصول یہی ہے[1]۔"

علامہ مناظر احسن گیلانی فرماتے ہیں کہ میرا قیام دیوبند میں کچھ تو طالب علم کی حیثیت سے رہا اور کچھ دن مدرسہ کی ملازمت اور خدمت میں گزرے کہ اچانک مجھے مقادیر نے حیدر آباد پہنچا دیا۔ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی قرآن دانی کا شہرہ سن چکا تھا، خدا نے ان کی صحبت کی سعادت سے سرفراز فرمایا اور قرآن کے چند جدید پہلو مجھ پر مولانا کی صحبت میں کھلے[2] ایک دوسرے

---

[1] نزھۃ الخواطر ج ۸ ص ۳۰ - ۲۲۹ [2] مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ۵۰

مقام پر لکھتے ہیں :

"اسی طرح تفسیر قرآن کے سلسلے میں ہندوستان کے بعض جدید کارنامے ایسے ہیں کہ کسی دوسرے اسلامی ملک کی طرف سے مشکل ہی سے کوئی ایسی چیز پیش ہوسکتی ہے جسے ہم ہندوستان کے ان کارناموں کے مقابلے میں قابل لحاظ قرار دے سکتے ہوں۔

قرآن کا ایک بڑا عمیق اور گہرا علم جس پر اس وقت تک بہت کم کام ہوا ہے وہ قرآنی آیات اور سورتوں کے باہمی ربط کا مسئلہ ہے۔ عجیب بات ہے کہ باوجود اہم ہونے کے اس وقت تک قرآن کے اس پہلو کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے اور کوئی تفسیر اس خاص نقطۂ نظر سے ایسی نہیں لکھی گئی جسے خصوصی حسن قبول اہل علم کے حلقوں میں حاصل ہوتا ہو۔ سب سے پہلے اس سلسلہ میں جو چیز یعنی نویں صدی کی ابتدا میں پیش ہوئی وہ ہندوستان کے ایک عالم حضرت شیخ علی المہائمی کا کارنامہ ہے یعنی اپنی تفسیر تبصیر الرحمٰن نامی میں علامہ مہائمی نے قرآن کے اس پہلو پر بحث کرنے میں بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے اور ان کی تفسیر کی امتیازی صفت یہی شمار ہوتی ہے۔

مگر یہ تو پچھلے زمانے کی بات ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا، ولی اللّٰہی تجدید کے بعد ہندوستان نے اپنی نشأۃ ثانیہ میں جو کام اس سلسلے میں انجام دیا ہے، میرا اشارہ حضرت الاستاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر نظام القرآن کی طرف ہے جس میں علاوہ دوسری خوبیوں کے (یعنی بائیبل اور قرآن کے تعلقات اور ادبی مباحث) سب سے بڑی اور مشترک خصوصیت مولانا کی اس تفسیر کے تمام حصوں میں یہی ہے کہ انہوں نے آیات قرآنی میں ربط پیدا کرنے کی ایسی عدیم النظیر کوشش فرمائی ہے کہ بسا اوقات صرف آیات کے یہی روابط اس کی دلیل بن جاتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کے سوا اور کسی کی طرف سے نہیں ہوسکتی۔"[1]

---

[1] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد دوم ص ۲۷۹، ۲۸۰، مناظر احسن گیلانیؒ

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی نے آپ کی وفات کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی خدمت میں جو تعزیت نامہ ارسال فرمایا تھا، اس میں تحریر فرماتے ہیں کہ :

"مجھ کو مولانا سے دیرینہ نیاز حاصل تھا۔ ابتدائی ملاقات کا ذریعہ علامہ شبلی مرحوم تھے، علی گڑھ کی پروفیسری کے زمانے میں ملا پھر حیدر آباد میں ..... علی گڑھ کے دور میں بھی تدبر قرآن کا شغف جاری رہا۔ روزانہ تین بجے شب سے صبح کے نو بجے تک اس میں وقت صرف کرتے تھے"[1]

صدقۂ جاریہ

آپ کا ایک عظیم کارنامہ جسے صدقۂ جاریہ کی حیثیت حاصل ہے، یہ ہے کہ مدرسۃ الاصلاح (سرائمیر اعظم گڑھ) کو باقاعدہ اپنے تعلیمی نظریات پر گامزن کر دیا۔ جہاں آج بھی ادب عربی اور قرآن مجید کی محققانہ تعلیم دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۲۵ء سے ۳۰ء تک اسی مدرسہ کی خدمت میں مصروف رہے۔ اساتذہ اور منتہی طلبہ کو قرآن پاک کا درس دیتے، منتظمین کو اپنے تعلیمی اور اصلاحی نظریات سے روشناس کراتے۔ چند ہونہار طلبہ کا انتخاب کر کے ان کی خاص طور سے تربیت فرمائی تا کہ وہ ان کے افکار و نظریات کو اچھی طرح جذب کر لیں اور ان کے بعد ان ہی کے خطوط پر اس تعلیمی اور فکری اصلاح کے مشن کو جاری رکھ سکیں۔

چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ علامہ فراہیؒ کے اس مکتب فکر سے تحریک اسلامی کو کافی تقویت ملی۔ غلط افکار و نظریات کا تسلط رفتہ رفتہ ختم ہوا اور عربی طلبہ نے قرآن سے قریب ہو کر خدمت اسلام اور اقامت دین کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ چنانچہ ایک زمانے میں یہ مدرسہ تحریک اسلامی ہند کا مرکز ثانی تھا اور تحریک اسلامی کے ہراول دستے کے طور پر کام کر رہا تھا۔ یہیں سے وہ فارغین نکلے جنہوں نے تحریک اسلامی کے علمی لٹریچر میں زبردست اضافہ کیا[2] اور جامعۃ الفلاح (بلریا گنج اعظم گڈھ) جو

---

[1] علامہ حمید الدین فراہی، ایک عظیم مفسر ص ۴۴۔ عنایت اللہ سبحانی

[2] میری مراد مولانا صدر الدین اصلاحی، مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ (باقی اگلے صفحہ پر)

آج تحریک اسلامی کا ہتھیار خانہ سمجھا جاتا ہے جہاں قدیم وجدید نصاب تعلیم کا بہترین سنگم تیار کیا جا رہا ہے اور ایسے علماء کی تربیت وتیاری کی کوشش جاری ہے جو قدیم علوم پر مہارت رکھنے کے ساتھ جدید زمانہ کے تقاضوں سے بھی واقف ہوں، اس کا مصدر اور سرچشمہ مدرسۃ الاصلاح ہے اور فکر فراہی وہاں بھی اساتذہ وطلبہ کی رہنمائی کر رہی ہے۔

(بقیہ صـ۲۶۴ سے ہے)

یہاں اس دلچسپ حقیقت کی طرف اشارہ بے جا نہ ہوگا کہ "اقامت دین" کی اصطلاح بھی جماعت اسلامی کو مدرسۃ الاصلاح کے ایک ہونہار اور فاضل قرآن فارغ نے دی۔ میری مراد مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم سے ہے۔ اس سے پہلے حکومت الٰہیۃ کے قیام کا نصب العین دستور میں درج تھا، لیکن مولانا نے قرآنی اصطلاح کی تجویز سامنے رکھ کر بہت سی غلط فہمیوں اور اعتراضات کو رفع کر دیا۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے، شیدائے قرآن مولانا اختر احسن اصلاحی از عنایت اللہ سبحانی)

ابوالکلام آزادؒ

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت جدید طبقہ علی گڑھ تحریک سے متاثر اور مغربی تہذیب کا دلدادہ تھا۔ اسلام کا مطلب رہبانیت، تقشف اور ترک دنیا سمجھا جاتا تھا۔ انفرادی معاملات میں تھوڑی بہت مذہب کی پابندی کافی سمجھی جاتی تھی۔ علماء و مشائخ اپنی ذمہ داریوں سے غافل تھے۔ انہیں ملک و ملت کی ابتری اور خستہ حالی سے کوئی سروکار نہ تھا اور اگر کچھ لوگ اس ناگفتہ بہ حالت پر دل گرفتہ تھے تو حالات کے آگے ڈگیں ڈال چکے تھے۔ مسلمانوں کی زندگی، ان کے فریضہ منصبی اور امامت و قیادت کی بازیافت ان کے نزدیک "کار دنیا" تھی۔ انہی حالات میں ۱۹۱۲ء سے کلکتہ سے الہلال نکلا اور اس شان سے نکلا کہ تمام ملک کی نظریں اس جانب اُٹھ گئیں اور مولانا مسلمانان ہند کی سیاسی اور اجتماعی زندگی پر ایک طوفان کی طرح چھا گئے۔ الہلال سے حزب اللہ تک آپ نے ایک زبردست کارنامہ انجام دیا اور پورے ملک میں امام الہند تسلیم کئے گئے۔

آزادی کی پکار

مولانا نے اپنی آتش بیانی اور شعلہ صفت تقریروں اور تحریروں سے پورے ملک میں آگ لگا دی، انگریزوں سے غیر مشروط تعاون کرنے، ان کے آگے سپر ڈال دینے اور ان سے حقوق کی بھیک مانگنے کی پالیسی پر سخت تنقید کی اور سامراج سے مکمل عدم تعاون اور عدم اشتراک کا سبق پڑھایا۔ الہلال نے پوری جرأت اور قوت سے سرسید علیہ الرحمہ کی پالیسی کے خلاف آواز بلند کی، اس طریقۂ کار کی فرسودگی اور بے مقصدیت کو بے نقاب کیا[1] اس تعلیم کی تہ میں جو رُجحان کام کر رہا تھا اور اس سے جو خطرناک نتائج پیدا ہو سکتے تھے، اس سے

---

[1] تذکرہ، مرتبہ مالک رام ۱۹۶۸ء کا پیش لفظ ص ہ

مسلمانوں کو آگاہ کیا اور کھلم کھلا اسے تقویم پارینہ کہہ کر ترک کرنے کی تلقین کی۔ آپ نے کھل کر کہا کہ:

"اسلام کسی اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیورو کریسی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے جو نوع انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لئے آیا تھا۔ یہ آزادی بادشاہوں، اجنبی حکومتوں، خود غرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی کی طاقتور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی وہ سمجھتے تھے کہ حق اور طاقت قبضہ ہے، لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں ہے بلکہ خود حق ہے اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگان خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے اس نے امتیاز اور بالادستی کے تمام قومی اور نسلی مراتب یک قلم مٹا دیئے اور بتلا دیا کہ سب انسان درجہ میں برابر ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ نسل، قومیت، رنگ معیار فضیلت نہیں ہے بلکہ صرف عمل ہے اور سب سے بڑا وہی ہے جس کے کام سب سے اچھے ہوں"۔

" موجودہ گورنمنٹ محض ایک ناجائز بیورو کریسی ہے۔ وہ کروڑوں انسانوں کی مرضی اور خواہش کے لئے محض نفی ہے اور ہمیشہ انصاف اور سچائی پر پرسٹیج کو ترجیح دیتی ہے وہ جلیان والا باغ (امرتسر) کا وحشیانہ قتل عام جائز رکھتی ہے۔ وہ انسانوں کے لئے اس حکم میں کوئی ناانصافی نہیں مانتی کہ چارپایوں کی طرح پیٹ کے بل چلائے جائیں۔ وہ بے گناہ لڑکوں کو صرف اس لئے تازیانہ کی ضرب سے بے ہوش ہو جانے دیتی ہے کیونکہ وہ ایک بت کی طرح یونین جیک کو سلام نہیں کرتے۔ وہ تیس کروڑ انسانوں کی پیہم التجاؤں پر بھی اسلامی خلافت کی پامالی سے باز نہیں آتے"۔

"مسٹر مجسٹریٹ میں اب زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں مشغول ہیں۔ ہمارے حصہ میں مجرموں کا کٹہرا آیا ہے، تمہارے حصے میں مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لئے وہ کرسی بھی اتنی ضروری چیز ہے جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس

یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے، وقت اُس کا جج ہے۔ وہ فیصلہ لکھے گا اور اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔[1]

مسلمانوں میں بیداری کا صُور پھونکتے ہوئے انہیں خواب غفلت سے جھنجھوڑا اور للکار کر کہا:

"وہ صُور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دے؟ میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں جس کی سینہ کوبی کے شور سے سرگشتگانِ خواب موت آور ہوشیار ہو جائیں؟ آہ کہاں ہیں وہ آنکھیں جن کو دردِ ملت میں خوں باری کا دعویٰ ہے؟ کہاں ہیں وہ دل، جن کو زوالِ اُمت کے زخموں پر ناز ہے؟ کہاں ہیں وہ جگر جو آتشِ غیرت و حمیت کی سوزش سے لذت آشنا ہیں؟ اور پھر آہ کہاں ہیں اس برہم شدہ انجمن کے ماتم گسار، اس برباد شدہ قافلے کے نالہ ساز، اس صفِ ماتم کے فغاں سنج اور اس کشتیٔ طوفاں کے مایوس مسافر جن کی موت وحیات کے آخری لمحے جلد جلد گزر رہے ہیں اور وہ بے خبر یا خاموشی سے روتے ہیں یا مایوسی سے چپ و راست نگراں، مگر نہ ان کے ہاتھ میں اضطراب ہے نہ پاؤں میں حرکت، نہ ہمتوں میں اقدام ہے اور نہ ارادوں میں عمل کا ولولہ۔ دشمن شہر کے دروازے توڑ رہے ہیں اور اہل شہر رونے میں مصروف ہیں مگر ڈاکوؤں نے قفل توڑ ڈالے ہیں اور گھر والوں کو اب تک آنکھ ملنے سے مہلت نہیں ملی۔ جب کسی کے گھر میں آگ لگتی ہے تو حملہ کے وقت دوست دشمن سب ہی پانی کے لئے دوڑتے ہیں لیکن رونے کو ہمت اور مایوسی کو زندگی سمجھنے والو، یہ کیا ہے کہ تمہارے

---

[1] مقدمہ کراچی میں مولانا ابوالکلام آزاد کے تاریخی بیان سے اقتباسات ماخوذ چراغ راہ کراچی کا نظریۂ پاکستان نمبر ص ۴۴۵، ۴۴۶

گھر میں آگ لگ چکی ہے، ہوا تیز ہے اور شعلوں کی بھڑک سخت مگر تم میں سے کوئی نہیں جس کے ہاتھ میں پانی ہو؟ پھر اگر اسی وقت کے منتظر تھے تو کیا نہیں سُنتے کہ وہ وقت آگیا ہے؟ اگر تم کشتی ڈوبنے کا انتظار کر رہے تھے تو کیا نہیں دیکھتے کہ اب اس میں دیر نہیں[1]؟"

امام الہند کی ان تحریروں نے مسلمانوں کے اندر جہاد، جدّوجہد، ایثار و قربانی اور فداکاری کی بجلیاں بھر دیں اور وہ حکومت کی باگ غیر ملکی غاصبوں سے چھیننے کے لئے میدان عمل میں اُتر آتے۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۹ء کی وہ تقریر تاریخ میں یادگار رہے گی جو آپ نے کلکتہ میں کی تھی۔ اس میں اقوام یوروپ کو براہ راست خطاب کر کے کہا تھا کہ:

"اے اقوام یوروپ! اے دزدانِ قافلۂ انسانیت! اے مثالِ درندگی و سبعیت! اے مجمع وحوش و کلاب! یہ ظلم و عدوان تا بکے اور خون و خوں ریزی تا چند؟ کب تک خدا کی سرزمین کو اپنے حیوانی غرور سے ناپاک رکھو گے؟ کب تک انصاف ظلم سے اور روشنی تاریکی سے مغلوب رہے گی؟ تبریز میں تمہارے ہاتھوں انسانوں کی گردنیں سولی پر لٹک رہی ہیں۔ طرابلس کی ریت پر اب تک اس جمے ہوئے خون کے ٹکڑے باقی ہیں جو تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے ایک پیشرو نے بہایا۔ مراکش میں ان لاشوں کا شمار کوئی انسان نہیں کر سکتا جن میں سے سینکڑوں کو مٹی کے بوجھ کی جگہ تمہارے گھوڑوں کے سموں کی پامالیاں اور تمہارے جنگی بوٹوں کی ٹھوکریں نصیب ہوئی ہیں[2]"

تقلید فرنگ کے خلاف معرکہ آرائی

مولانا کا دوسرا زبردست کارنامہ یہ ہے کہ الہلال کے ذریعہ آپ نے جدید تہذیب اور اس کے ایجنٹوں کی خوب خبر لی۔ تقلید فرنگ کے جو رجحانات مسلمانوں میں پرورش پا رہے تھے ان پر نقد و احتساب کیا۔ قرآن کی من مانی تاویلات کے ذریعہ اُمت کے نوجوان طبقہ کو جس طرح

---

[1] نوائے آزادی بمبئی ص ۱۶۹

[2] خطبات آزاد ص ۲۴۴، مرتب مالک رام، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی۔

بہکایا جا رہا تھا اس پر ضرب لگائی۔ جدید تعلیم کی خرابیوں، الحاد و دہریت کی زہرناکیوں اور مذہب بیزاری کے مضر اثرات سے عوام کو متنبہ کیا۔

علی گڑھ تحریک کے ذریعہ جو مرعوبانہ اور معذرت خواہانہ انداز و اسلوب پنپ رہا تھا اسے ترک کر کے قرآن و سنت سے روشنی حاصل کرتے ہوئے مغربی تہذیب کی بنیادوں پر گہرا وار کیا تحریک علی گڑھ پر دیکھئے کس طرح طنز کرتے ہیں:

"جس قدر مقامی کوششیں آج عمل میں آ رہی ہیں، خواہ وہ مصر میں ہوں یا ترکی میں، الجزائر میں ہوں یا اس تیرہ زار ہند میں، میرے عقیدے میں یہ سب کچھ کاہن شیطان کا ایک عمل السحر ہے جو اس لئے سلاتا ہے کہ سونے والوں کا اُٹھنا اسے پسند نہیں۔ میں نے کہا کہ ہم میں سچا پان اسلامزم یا بالفاظ دیگر اصلی رشتہ اخوتِ دینی باقی نہیں رہا اور کیونکر باقی رہے جب کہ ہندوستان میں ایسے عظیم الشان اشغال ہمارے لئے موجود ہیں جو نفسِ اسلام کی بقا سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ ان کو چھوڑ کر ہم غریب ترکوں یا ایرانیوں کی کیونکر خبر لیں۔ سب سے مقدم امر یہ ہے کہ ہمیں علی گڑھ میں ایک یونیورسٹی بنانی ہے اس کے لئے تیس لاکھ روپیہ جمع کرنا ہے۔ یہ مانا کہ دنیا کی کوئی سرزمین ہے جہاں خود اسلام کے بقا و فنا کا سوال درپیش ہے مگر اس کو کیا کہئے کہ "مسلم یونیورسٹی" ہمارے قومی مقاصد کا اصلی نصب العین کعبۂ علی گڑھ کے شب زندہ داران عبادت کی چہل سالہ تہجد گزاری کی مراد، آرزو اور ہمارے رہنمائے اوّل کی دی ہوئی شریعت تعلیم کا یوم تکمیل ہے۔ جس دن یونیورسٹی بن جائے گی اس دن اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ أَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا ط کی وحی اسٹریچی ہال کی چھت پر نازل ہوگی"[1]

آگے اسی تقریر میں فرماتے ہیں کہ:

"وہ ہاتھ نہایت مقدس ہے جس میں صلح کا جھنڈا لہرا رہا ہے مگر زندہ وہی ہاتھ رہ سکتا ہے جس میں خونچکاں تلوار کا قبضہ ہو۔ یہی اقوام کی زندگی کا منبع، قیام عدل و میزان کا

---

[1] خطبات آزاد ص ۲۷، مرتبہ مالک رام

وسیلہ، انسانی سبعیت و درندگی کا بچاؤ اور مظلوم کے ہاتھ میں اس کی حفاظت کی ایک ہی ڈھال ہے۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کو کتاب اور میزان دی تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہوں اور نیز لوہا پیدا کیا جو ہتھیاروں کی صورت میں سخت خطرناک بھی ہے اور نفع رساں بھی)[1]

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کی تفسیر کے ذریعہ خاص طور پر مسلمانوں میں ایک نئی حرکت پیدا کی اور انہیں بتایا کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات کی تشکیل کرتا ہے۔ انہوں نے ہی پہلی مرتبہ مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ قرآن پاک میں پچھلی امتوں کی داستانوں کے علاوہ زندگی کے معاملات کے بارے میں بھی ہدایات موجود ہیں۔ مولانا کی اس تفسیر کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوگوں نے سوچنا شروع کیا کہ قرآن ایک مکمل دستورِ حیات ہے جو ہماری زندگی کے تمام مسائل و معاملات سے بحث کرتا ہے۔

مقصدِ حیات کی یاددہانی

مسلمانوں کو ان کا فریضۂ منصبی یاد دلایا۔ اپنی ادبی زبان میں انہیں چودہ صدی پہلے کی طرف لوٹنے کی دعوت دی، ببانگ دہل اعلان کیا:

"سفر سے پہلے زادِ راہ کی فکر کر لو اور طوفان سے پہلے کشتی بنالو کیونکہ سفر نزدیک ہے اور طوفان کے آثار ظاہر ہوگئے ہیں جن کے پاس زادِ راہ نہ ہوگا وہ بھوکے مرجائیں گے اور جن کے پاس کشتی نہ ہوگی وہ غرق ہو جائیں گے۔ جب تم دیکھتے ہو کہ مطلع غبار آلود ہوا اور دن کی روشنی بدلیوں میں چھپ گئی تو تم سمجھتے ہو کہ برق و باراں کا وقت آگیا۔ پھر تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ دنیا کی امن و سلامتی کا مطلع غبار آلود ہو رہا ہے۔ دینِ الٰہی کی روشنی ظلمت کفر و طغیان میں چھپ رہی ہے مگر تم یقین نہیں کرتے کہ موسم بدلنے والا ہے اور تیار نہیں ہوتے کہ انسانی بادشاہوں سے کٹ کر

---

[1] خطبات آزاد ص ۲۷، مرتبہ مالک رام۔

خدا کی بادشاہت کے مطیع ہو جاؤ۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا کے تخت جلال کی منادی پھر بلند ہو اور اس کی زمین صرف اسی کے لئے ہو جائے حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔ [1]

۱۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو پریس ایکٹ کے تحت جب الہلال سے دو ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کی گئی تو مولانا نے شمارے میں لکھا کہ:

"الہلال اور پریس ایکٹ کا سوال بالکل اسلام اور پریس ایکٹ کا سوال ہے۔ الہلال اپنے ہر خیال کو خواہ وہ کسی موضوع سے تعلق رکھتا ہو، محض اسلامی اصولوں کے ماتحت ظاہر کرتا ہے اور کوئی آواز ایسی بلند نہیں کرتا جو اسلام کے قانون اور دستور العمل یعنی قرآن کریم سے ماخوذ نہ ہو پھر اگر ہلال پریس ایکٹ کی دفعات کے تحت میں آسکتا ہے تو ہم کو اس دن کا منتظر رہنا چاہیئے جب پریس ایکٹ کی دفعہ ۱۲ کے بموجب "قرآن کریم" نامی ایک کتاب کا بھی سوال پیدا ہو جائے گا اور برطانوی قوانین کا یہ عجیب الخلقت فرزند اپنے سامنے صرف الہلال کے دار الاشاعت ہی کو نہیں بلکہ چالیس کروڑ پیروان قرآن کو پائے گا جو اس کی ہر دفعہ کے بموجب مجرم ہوں گے اور ہر شخص کے ہاتھ میں ایک حکم نامہ ہو گا جس میں لکھا ہو گا "سات دن کے اندر اندر دو ہزار روپیہ داخل کر دو۔" [2]

جب مولانا نے البلاغ نکالا تو اس میں بھی اپنے مقصد حیات کو سامنے رکھا اور مسلمانوں کو دعوت اسلامی کی پکار پر لبیک کہنے کے لئے آمادہ کیا۔ ۱۷، ۲۴، اور ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء کے شمارہ میں لکھا کہ:

"ابتدا ہی سے اس عاجز نے تمام نام نہاد سیاسی تعلیمی و قومی تحریکوں سے الگ ہو کر صرف دعوت و تبلیغ اسلامی و قرآنی کی صراط مستقیم کو اپنا شعار و دستور العمل قرار دیا اور ایک ایسے عہد ضلالت میں جو طرح طرح کی آوازوں سے گونج رہا تھا، سب سے پہلے اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ کی صدا بلند کی۔ نیز اس گم شدہ حقیقت

---

[1] انتخاب الہلال ص ۱۵ ناشر حمید برادرز بل روڈ لاہور۔

[2] الہلال یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء۔

کو آشکارا کرنے کی توفیق پائی کہ مسلمانوں کی نجات و فلاح نہ تو محض دعوتِ تعلیم میں ہے نہ دعوت قومیت و سیاست میں، نہ انجمنوں کی کثرت میں ہے اور نہ محض مدرسوں اور کالجوں کے قائم کرنے میں، بلکہ جب تک حضرات انبیاء کرام کے اُسوۂ حسنہ اور داعیٔ اسلام کی سُنّتِ مقدسہ سے کوئی دعوت حق ماخوذ نہ ہوگی اور انسانی طریقوں کی جگہ انہی سرچشموں سے فیضیاب ہوکر نشوونما نہ پائے گی اس وقت تک وہ کامیابی اور فلاح حاصل نہیں ہوسکتی جس کے متعلق کلام الہٰی نے فرما دیا ہے کہ صرف متقین اور مومنین ہی کے لئے مخصوص ہے[1]

ایک مقام پر علماء و شیوخ کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتے ہیں :

"لیکن نہ تو عبّاد و زُہّاد وقت کو تسبیح ہزار دانہ کی گردش مہلتِ ساعت دیتی ہے اور نہ ہنگامہ سازان مدارس و مجامع کو اساطیرِ جدل و جلاف و دساتیر قیل و قال کا شور و غوغا فرصت بصارت ۔ اصل حقیقت سے اس درجہ بُعد و ہجر طاری ہو جاتا ہے کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی احیاء شریعت و تجدید ملت کا خطرہ نہیں گزرتا اور کوئی نہیں سوچتا کہ یہ سارے کارخانے اور ہنگامے تو اس لئے تھے کہ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۔ سو جب وہ سرنگوں ہو گیا تو ان اجسادِ بے رُوح و قشورِ بے مغز کی پرستش کیا سود علم و عمل ہو سکتی ہے ؟ اور جب رُوحِ اُمّت مضمحل ہو گئی اور حق کی جگہ باطل کی اور سُنّت کی جگہ بدعت کی حکومت چھا گئی تو پھر یہ تمام باتیں کب مثمر و منتج ہو سکتی ہیں ؟ بلکہ ان کا شمار تو اب موانع و مہالک راہ میں ہو گیا ؎

من لم یکن للوصال اھلا
فکل طاعاتہ ذنوب[2]

مولانا آزاد نے دورِ جدید کے فراعنہ و نماردہ اور اہل باطل کی اطاعت سے انکار کا اعلان

---

[1] البلاغ ۱۷، ۲۴، ۳۱، مارچ ۱۹۱۶ء کا مشترکہ شمارہ ماخوذ ابوالکلام آزاد ۔۔۔ فکر و فن ص ۱۴۴، ۱۴۵، ملک زادہ منظور احمد

[2] تذکرہ، مرتبہ فضل الدین احمد حصہ اول ص ۱۲۱، ناشر انارکلی کتاب گھر لاہور

کیا۔ اور مسلمانوں سے کھل کر کہا کہ آج کے سائنسی دور میں تم نے نئے بُت تراش لئے ہیں۔ پہلے مٹی کی مورتیں پوجی جاتی تھیں۔ آج تم نے ان کی جگہ نئے نئے فکری بُت تراش لئے ہیں۔ آج امراء و حکام کو اور دنیوی مناصب اور اعزازات کو تم نے وہی جگہ دے رکھی ہے اور ان سب سے تمہیں معرکہ آرا ہونا ہے ورنہ یہ جذبہ توحید کے منافی ہوگا فرمایا:

" قریش مکہ نے اپنے بڑوں کی مورتیں بنا رکھی تھیں تم نے دُنیوی تاج و تخت اور حکام و امراء کو ان کی جگہ دے دی ہے۔ تم ان سے اس طرح ڈرتے اور ان کے نام سے کانپتے ہو جو صرف خدا ہی کے ساتھ سزاوار تھا۔ تم ان کا ذکر اس احترام و عظمت سے کرتے ہو جو صرف خدا ہی کا حق خالص تھا۔ تم ان کے آگے اس عاجزی اور ذلت سے جھکتے ہو جو صرف خدا ہی کے سامنے زیب دیتی تھی۔ تم ان کے احکام جائرہ اور اوامر مستبدہ کی اس طرح بلا چون و چرا تعمیل کرتے ہو جس کا حق خدا کے سوا کسی ہستی کو نہ تھا۔ تم خدا کے گھر کے اندر ان کا ذکر کرتے اور ان کی تعریف و تہنیت میں گیت گاتے ہو اور ان کے حکموں اور فرمانوں کا منبروں پر چڑھ چڑھ کر اعلان کرتے ہو پھر اگر یہ شرک فی الصفات نہیں ہے تو کیا ہے؟ کیا شرک و بُت پرستی بغیر پتھر کی مورت اور بغیر قربانی کے بچھڑے کے ممکن نہیں؟ کیا شرک و بُت پرستی کا گھر دل اور ارادہ نہیں بلکہ مندر کا کلس اور پوجا کا چبوترہ ہے[۱]"

مسلمانوں کو مقام عزیمت اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

" بڑوں بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سر و سامان و اسباب کار فراہم نہیں۔ لیکن وقت کا عازم و فاتح اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سر و سامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کر لوں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اُترنا چاہیئے۔ اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیئے۔ اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہوگئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیئے۔ اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ درختوں کو دوڑنا چاہیئے۔ اگر دشمن بے شمار ہیں تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں۔

---

[۱] مقالات الہلال ص ۳۸

اگر رُکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفان کو کیا ہو گیا کہ راہ صاف نہیں کرتے! وہ زمانہ کا مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکری کرائے۔ وہ وقت کا خالق اور عہد کا پلٹنے والا ہوتا ہے اور زمانے کے حکموں پر نہیں چلتا بلکہ زمانہ آتا ہے تاکہ اس کی جنبشِ لب کا انتظار کرے۔ وہ دنیا پر اس لئے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھر لوں! وہ یہ دیکھنے کے لئے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے جس کو پورا کر دوں۔"[1]

ارتقائے معکوس!

لیکن یہ بیسویں صدی کی مسلم تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ جس ابُوالکلام نے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۲۴ء تک مسلم ملت کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی، اپنی تقریر و تحریر کی بے مثال صلاحیتوں سے کام لے کر مسلمانوں کے اندر صور پھونکا اور اسلامی ہند کی نشاۃ ثانیہ میں ایک اہم کردار ادا کیا وہی پھر ارتقائے معکوس کی نذر ہو گیا۔ عالمی اخوت کا پیامبر متحدہ قومیت کے جال میں ایسا پھنسا کہ عمر بھر اس سے نکلنا نصیب نہ ہوا۔ جنگ آزادی کے موقعہ پر مولانا آزاد نے مغربی قومیت کی جو وکالت کی اس کی کوئی اسلامی توضیح نہیں کی جا سکتی۔ ایک مقام پر لکھا:

> "ایک طرف تو یہ لوگ ہیں جو نکتہ چینی کے رنگ میں اس مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں۔ دوسری طرف مسلمان اہل قلم ہیں اور چونکہ ان کے سامنے بھی کوئی صاف اور واضح حقیقت نہیں اس لئے کچھ عجیب طرح کے افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے الہلال کے پچھلے صفحات پر اسی قسم کی بحثیں دیکھی تھیں کہ اسلام کی وُسعتِ نظر وطنیت کی تنگ نظری کی متحمل نہیں۔ چونکہ بات کے محل اور موقع پر ان کی نظر نہیں ہے اس لئے وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نیشنلزم کا مخالف ہے اور کسی مسلمان کو نیشنلسٹ نہ ہونا چاہیئے حالانکہ نہ تو اسلام کی وسعت نظر کے یہ معنیٰ ہیں کہ وہ قومیت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا نہ قومیت کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اسلامی ذہنیت کا دائرہ تنگ کیا جائے

---

[1] تذکرہ ص ۲۷۲، مرتبہ مالک رام

یہ دونوں صورتیں افراط و تفریط میں داخل ہیں اور ہر معاملے کی طرح یہ بھی حقیقت اطراف میں نہیں بلکہ وسط میں ڈھونڈھنی چاہیئے[1]

پھر ۱۹۴۲ء میں اس مسئلہ پر انھوں نے جو بیان دیا اس کا تضاد باہمی ملاحظہ ہو:

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری زندگی کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں — میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے میں اس کی تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا[2]"

جب کانگریس کے ایوان سے مسلم ماس کنٹیکٹ (MUSLIM MASS CONTACT) کا علم اُٹھایا گیا تو اس کے ساتھ ہی مولانا کا ایک سپہ سالارانہ خطبہ بھی اخبارات میں شائع ہوا جس میں مولانا اپنی تمام تقریر اس انداز میں فرماتے ہیں کہ یا تو مسلمان اس تحریک میں آنکھیں بند کر کے شریک ہو جائیں جس کی اساس وطنی قومیت اور ڈیموکریسی کے انگریزی نمونہ پر رکھی گئی ہے یا نہیں تو وہ بزدل ہیں، کم ہمت ہیں اور ذلت کی موت مرجانے والے ہیں۔ پوری تحریر نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے مگر چند فقرے نقل کئے بغیر چارہ بھی نہیں:

---

[1] مضامین ابوالکلام آزاد، مرتبہ ثناء اللہ خاں لاہور ص ۱۴۲، ۱۴۳

[2] خطبات آزاد مرتبہ شورش کاشمیری، مکتبہ شعر و ادب لاہور ۱۹۴۴ء ص ۳۸، ۳۹

"ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں نے کانگریس کی شرکت سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ وہ سرے سے سیاسی اصلاح و تغیر کے مخالف تھے۔ انہیں یہ بات سمجھائی گئی تھی کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اس لئے یہاں جو تبدیلی بھی جمہوری و نیابتی اداروں کے طریقہ پر کی جائے گی ہندوؤں کے لئے مفید ہوگی، مسلمانوں کے لئے مضر ہوگی۔ چنانچہ ۱۸۸۸ء میں لارڈ ڈفرن اور مسٹر آکلینڈ کالون نے سر سید احمد خاں مرحوم کو یہی راہ دکھائی تھی اور اسی بنا پر انہوں نے کانگریس کی مخالفت کا اعلان کیا تھا۔۔۔۔۔۔ اب ملک اصلاحات کے لئے نہیں بلکہ کامل تبدیلی کے لئے لڑ رہا ہے ظاہر ہے کہ ان تغیرات کے بعد اب کانگریس کی عدم شرکت کے لئے ۱۸۸۸ء والی بات سودمند نہیں ہو سکتی۔ ناگزیر ہے کہ کوئی دوسری ہی بات اختیار کی جائے۔ چنانچہ اب بعض حضرات نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب کبھی کانگریس کی تحریک میں شرکت کا سوال اُٹھتا ہے یا خود کانگریس کا کوئی رُکن مسلمانوں کو توجہ دلاتا ہے تو فوراً یہ حضرات فرقہ دارانہ حقوق اور تحفظات کا سوال چھیڑ دیتے ہیں۔ انہیں خطرہ ہے کہ اگر برطانوی اقتدار ملک میں باقی نہیں رہے گا یا بالکل کمزور پڑ جائے گا تو ہندو اکثریت ان کے حقوق پامال کر دے گی۔"

"خطروں اور تباہ حالیوں کی اس اندیشہ ناکی کا کن لوگوں کو یقین دلایا جا رہا ہے ان لوگوں کو جو بلحاظ تعداد کے ہندوستان کی سب سے بڑی دوسری اکثریت اور بلحاظ معنوی قویٰ کے سب سے طاقتور جماعت ہیں! اور پھر ان تمام خطروں کا انسداد کیونکر ہو سکتا ہے؟ صرف اس طرح کہ انڈین نیشنل کانگریس ایک ریزرولیوشن پاس کر دے جوں ہی اس نے ریزرولیوشن پاس کر دیا خطروں اور تباہ حالیوں کا تمام بادل جو آٹھ کروڑ انسانوں کے سروں پر چھایا ہوا ہے، معاً چھٹ جائے گا۔"

"انہیں اگر کانگریس میں شریک ہونا چاہیئے تو صرف اس لئے کہ انہیں اپنے اوپر بھروسہ ہے اس لئے نہیں کہ دوسروں نے انہیں بھروسہ دلایا ہے یا دوسرے انہیں بھروسہ دلا سکتے ہیں۔ اگر فی الحقیقت ان کی بے بسی اور بے چارگی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ خطرہ اور تباہ حالیوں میں گھر گئے ہیں اور

تحفظ کی راہ اس کے سوا کچھ نہ رہی کہ یا تو انگریزی اقتدار کے سہارے جئیں یا کانگریس کے اطمینان دلانے پر، اور خود ان کے اندر خود اعتمادی و ہمت کی ایک چنگاری بھی نہیں رہی جو ان کی ٹھنڈی رگوں کو گرم کر سکے، تو میں کہوں گا کہ ایسی زندہ نعشوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ جہاں پڑی ہیں پڑی رہیں [1]

مسلمانوں کی یہ تصویر کون شخص کھینچ رہا ہے اور کانگریس میں شرکت کے لئے کون للکار رہا ہے؟ وہ جو کبھی الہلال اور البلاغ کا ایڈیٹر اور مسلمانوں کا ہردل عزیز لیڈر تھا بتائیے اس سے بڑی ٹریجدی اور کیا ہو سکتی ہے؟!

وحدت ادیان کی جھلک

دوسری طرف مولانا آزاد کی تحریروں میں وحدت ادیان کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں معروف اور منکر کی توضیح کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

"قرآن کہتا ہے، یہ اعمال جن کی اچھائی عام طور پر نوعِ انسانی نے جانی بوجھی ہوئی ہے، دین الٰہی کے مطلوبہ اعمال ہیں۔ اسی طرح وہ اعمال جن سے عام طور پر انکار کیا گیا ہے اور جن کی برائی پر تمام مذاہب متفق ہیں، دین الٰہی کے ممنوعہ اعمال ہیں۔ یہ بات چونکہ دین کی اصل حقیقت تھی اس لئے اس میں اختلاف نہ ہو سکا اور مذہبی گروہوں کی بے شمار گمراہیوں اور حقیقت فراموشیوں پر بھی ہمیشہ معلوم و مُسلّم رہیں۔ ان اعمال کی اچھائی اور برائی پر نوعِ انسانی کے تمام عہدوں، مذہبوں اور تمام قوموں کا عالم گیر اتفاق ان کی الہامی اصلیت پر ایک بہت بڑی دلیل ہے پس جہاں تک اعمال کا تعلق ہے میں انہی باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہوں جن کی اچھائی عام طور پر جانی بوجھی ہوئی ہے اور انہی باتوں سے روکتا ہوں جن سے عام طور پر نوعِ انسانی نے انکار کیا ہے یعنی میں معروف کا حکم دیتا ہوں اور منکر سے روکتا ہوں۔ پس جب میری دعوت کا یہ حال ہے تو پھر کسی انسان کو بھی جسے نیکی اور راستی

---

[1] تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان، سید ابو الاعلیٰ مودودی، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور بار ہشتم ۱۹۷۹ء ص ۱۶۸، ۱۶۹۔

سے اختلاف نہیں کیوں مجھ سے اختلاف ہو؟[1]

سورہ بقرہ آیت ۶۲ کی تفسیر میں مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ:

"اس اصل عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات ایمان و عمل سے وابستہ ہے، نسل و خاندان یا مذہبی گروہ بندی کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ یہودی جب ایمان و عمل سے محروم ہو گئے تو نہ ان کی نسل کام آئی نہ یہودیت کی گروہ بندی سودمند ہوسکی خدا کے قانون نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ کون ہیں اور کس گروہ بندی سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ صرف یہ دیکھا کہ عمل کا کیا حال ہے اور پھر جب آزمائش عمل میں پورے نہ اترے تو مغضوب و نامراد ہو گئے۔"[2]

پھر بقرہ آیت ۱۱۱ کی تفسیر میں لکھا کہ:

"یہودی کہتے تھے: جب تک ایک انسان یہودی گروہ بندی میں داخل نہ ہو نجات نہیں پا سکتا۔ عیسائی کہتے تھے: جب تک عیسائی گروہ بندی میں داخل نہ ہو نجات نہیں مل سکتی۔ قرآن کہتا ہے: نجات کا دارومدار خدا پرستی اور نیک عمل پر ہے نہ کہ کسی خاص گروہ بندی پر۔ جو انسان بھی خدا پرست اور نیک عمل ہو گا، نجات پائے گا خواہ تمہاری گھڑی ہوئی گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔"[3]

بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد نے گو کہ وحدت ادیان کے مروجہ عقائد سے برأت کا اظہار کیا اور کھل کر لکھا کہ اگر ایک یہودی حضرت موسیٰ کی سچی تعلیم پر عمل کرنا چاہے گا یا ایک

۱؎ ترجمان القرآن جلد اول ص ۱۵۶، ابوالکلام آزاد۔ معروف و منکر کی اس تعریف پر قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی لکھتے ہیں:

"تفصیل بالا سے واضح ہو جاتا ہے کہ فاضل مفسر کی یہ تعریف جامع و مانع نہیں بلکہ معروف و منکر کے اولین مصداق (جس کا اچھا یا برا ہونا شریعت سے معلوم ہو) کو ہی شامل نہیں ہے۔ علاوہ ازیں "وحدت الادیان" کے عقیدہ باطل کی بھی مُوہم ہے۔"

(قاموس القرآن از قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی ص ۱۴۰، مکتبہ علمیہ دفتر الحرم قاضی منزل میرٹھ)

۲؎ ترجمان القرآن جلد دوم، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی ۱۹۶۶ء ص ۴۰

۳؎ ترجمان القرآن جلد دوم ص ۸۷

مسیحی حضرت مسیح کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہوگا تو اسے ٹھیک یہی راہ اختیار کرنی پڑے گی جو قرآن نے واضح کردی ہے اور یہ کہ ایمان سے مقصود یہ ہے کہ آدمی اللہ پر، اللہ کے رسولوں پر، یوم آخرت پر اور قرآن اور صاحب قرآن پر ایمان لائے[1] لیکن ترجمان القرآن کی مندرجہ بالا تفسیروں نے ایک طرف تو غیر مسلموں کو قرآن کی دعوت حق قبول نہ کرنے کے لئے خود قرآن ہی سے دلیل بہم پہنچادی۔ دوسری طرف جماعت مسلمین میں جو منافقین اسلام کی گرفت سے آزاد ہونے کے لئے بے چین تھے ان کو کفر و اسلام کا امتیاز اٹھا دینے کی اجازت خود اسلام کی زبان سے دلوائی اور تیسری طرف جو اچھے خاصے صاحب ایمان خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی پیروی پر قائم تھے ان کے ایمان کو بھی متزلزل کردیا۔ غرض یہ ایک شاہ ضرب تھی جس نے ہر طرف سے اندر سے بھی اور باہر سے بھی اسلام کو نشانہ بنایا[2]

اسلوب نگارش ـــ مذہبی رومانیت

مولانا آزاد نے اپنے خطیبانہ جوش، طوفانی تحریر اور سیلابی گفتگوؤں سے مسلم قوم کے اندر ایک ہلچل پیدا کی، انہیں خواب غفلت سے بیدار کیا اور زندگی کے میدان میں سرگرم عمل کیا۔ بلاشبہ مولانا کی تحریریں مسلمانوں کے لئے ایک طوفان کی حیثیت رکھتی ہیں جو خس و خاشاک باطل کو اپنی رو میں بہالے گیا کلیم الدین نے ٹھیک ہی لکھا ہے:

> "ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں یہی فوق فطری زور ہے اور اسی زور کی وجہ سے ان کی انشا محض انشا لعینی لفظوں کا مجموعہ نہیں ہوتی۔ یہ ایک کھنچی ہوئی تلوار، ایک بڑھتا ہوا سیلاب، ایک اٹھتا ہوا طوفان اور ایک دنیا کو ہلا دینے والا بھونچال ہے یہ ایسا عصائے موسوی ہے جو افعی بن کر ہر شئے کو نگل جاتا ہے"[3]

لیکن اس حقیقت کا انکار مشکل ہے کہ ابوالکلام کے یہاں ہوش پر جوش کا اور فکر و استدلال پر جذباتیت اور خطابت کا پہلو غالب ہے جو تحریک اسلامی اور اقامت دین

---

[1] افکار آزاد، ص ۱۱۲، ۱۱۳، مرتبہ فارقلیط

[2] تفہیمات جلد اول بار دوم، ص ۳۷۸، مولانا مودودیؒ،

[3] سخنہائے گفتنی، ص ۲۳، فروغ اردو لکھنؤ اکتوبر ۱۹۵۵ء

کی تفہیم و تشریح میں رکاوٹ ہے۔ غالباً اسی پہلو کی طرف مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے خط میں اشارہ کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"یاد رکھئے کہ خطیبانہ حربے عوام فریب تقریروں اور تحریروں میں خواہ کتنے ہی کارگر ہوتے ہوں، لیکن علمی مباحث میں ان کا استعمال قطعاً بے محل اور غیر مؤثر ہونے کے ساتھ بے حد شرمناک ہے سیاست اور مذہب مدت سے آپ کی تیغ خطیبانہ کے زخم خوردہ ہو رہے ہیں"[1]

تذکرہ جو مولانا ابوالکلام آزاد کی لازوال تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں بھی یہ پہلو غالب ہے اسی لئے آپ کے مداح بھی یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ "خطابت میں چونکہ تکرار اور طوالت سے بھی کام لینا پڑتا ہے اسی لئے تذکرہ میں بھی تکرار اور طوالت کی بے شمار مثالیں بھری پڑی ہیں۔ ان کی طویل فصلوں کی بھی اگر تلخیص کی جائے تو وہ آسانی کے ساتھ صرف چند صفحات کا مواد فراہم کر سکتی ہے"[2] اس اسلوب نگارش کے سلسلے میں ملک زادہ منظور کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ:

"یہ صحیح ہے کہ عربی و عجمی تشبیہات، بھاری بھرکم الفاظ، عالمانہ طمطراق اور شان و شوکت کی وجہ سے یہ عوام کا مشترک سرمایہ نہیں بن پاتا"[3]

اور اسی وجہ سے یہ اسلوب زیادہ مفید اور نتیجہ خیز نہیں ثابت ہو سکتا۔ غالباً اسی وجہ سے بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ مولانا آزاد کی تحریروں میں یک گونہ مذہبی رومانیت[4] پائی جاتی ہے۔

مولانا آزاد کے نظریۂ وحدت ادیان کی ایک اور مثال

شاہ جہاں کے بڑے لڑکے دارا شکوہ نے ہندومت اور یوگ کی تبلیغ و اشاعت میں جس قدر غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اسلامی عقائد و شعائر کو مٹانے کی اس نے جو ناپاک کوشش

---

[1] الہلال ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۳ء

[2] مولانا ابوالکلام آزاد — فکر و فن، ص ۲۹۶، ملک زادہ منظور احمد

[3] " " " ص ۲۱۶ "

[4] تحریک اسلامی — شاہ ولی اللہ سے علامہ اقبال تک، ص ۱۶۴، پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد

کی اس کا تذکرہ اپنے محل پر گزر چکا ہے، اس کی صرف ایک کتاب "سر اکبر" اس کے مشرکانہ عقائد کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ علامہ شبلی نے سر اکبر کے نسخہ کو ۱۹۰۶ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس کی علمی نمائش میں دیکھا تھا، اس کتاب کے دیباچہ کو پڑھنے کے بعد انہوں نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے:

"عالمگیر نے دارا شکوہ کے مقابلہ کا جب قصد کیا تو اس کا سبب یہ ظاہر کیا کہ دارا شکوہ بدعقیدہ اور بددین ہے اس لئے اگر وہ ہندوستان کا فرماں روا ہوا تو ملک میں بددینی پھیل جائے گی۔ عام مؤرخوں کا خیال ہے کہ یہ محض ایک فریب تھا، نہ دارا شکوہ بے دین تھا اور نہ عالمگیر کی مخالفت کا یہ سبب تھا دلوں کا حال خدا کو معلوم، لیکن اس کتاب کے دیباچہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دارا شکوہ بالکل ہندو بن گیا تھا اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر وہ تخت شاہی پر متمکن ہوتا تو اسلامی شعار اور خصوصیات بالکل مٹ جاتے۔"[1]

لیکن مولانا ابوالکلام آزاد اسی دارا شکوہ کی صفائی کرتے ہیں اور عالمگیر کو اس کے خون ناحق کا مجرم قرار دیتے ہیں:

"شاہ جہانی حکومت کا عہد آخری اور شہزادہ دارا شکوہ ولی عہد سلطنت تھا۔ سلسلہ مغلیہ میں دارا شکوہ ایک عجیب طبیعت اور دماغ کا شخص گزرا ہے اور ہمیشہ افسوس کرنا چاہیئے کہ تاریخ ہند کے قلم پر اس کے دشمن کا قبضہ رہا۔ اس لئے اصلی تصویر پولیٹیکل چالوں کے گرد وغبار میں چھپ گئی۔ وہ ابتداء سے درویش دوست اور صوفیانہ دل ودماغ کا شخص تھا اور ہمیشہ فقراء اور ارباب تصوف کی صحبت میں رہتا تھا اس کی بعض تحریرات جو دست برد حوادث سے بچ گئی ہیں، بتلاتی ہیں کہ ان کا لکھنے والا خود بھی ذوق وکیفیت سے خالی نہیں۔ اس کے صاحب ذوق ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تلاش مقصد میں دیر وحرم کی تمیز اٹھا دی تھی اور جس نیازکیشی کے ساتھ مسلمان فقراء کے آگے سر جھکاتا تھا ویسی ہی عقیدت وہ ہندو درویشوں کے ساتھ رکھتا تھا۔ اس اصول سے کون صاحب حال اختلاف کر سکتا ہے کیونکہ اگر اس عالم میں بھی کفر واسلام کی تمیز ہو تو

---

[1] مقالات شبلی ج ۷، ص: ۱۰۱، دار المصنفین اعظم گڑھ۔

پھر امی اور بصیر میں کیا فرق باقی رہ گیا۔ پروانہ کو تو شمع ڈھونڈھنی چاہیئے، اگر صرف حرم ہی کا شیدا ہے تو شیدا طلبی کامل نہیں ؎

عاشق ہمہ اسلام خرابست و ہم از کفر
پروانہ چراغ حرم و دیر نداند[1]

مولانا آزاد کی یہ عبارت پڑھنے والا یقیناً سب سے پہلے اس حیرت میں پڑ جائے گا کہ اس عبارت کا لکھنے والا وہی شخص ہے کہ جب وہ الہلال میں پر شور دینی مضمون لکھتا تھا تو محسوس ہوتا تھا کہ وہ فاران کی چوٹی سے بول رہا ہے اور جس نے تذکرہ لکھ کر مجددین ملت کے کارناموں کو والہانہ عقیدت پیش کیا تھا اور شرک و بدعت کے جو پردے دین مبین کے اوپر پڑ گئے تھے ان کو تار تار کرنے کی کوشش کی تھی، وہ اب نیشنلزم کی وادیٔ تیہ میں پہنچ کر کفر و اسلام اور دیر و حرم کی تفریق مٹا دینے کی اور وحدت دین کی تبلیغ کر رہا ہے[2]

---

[1] رباعیات سرمد، ابوالکلام آزاد ص: ۱۰

[2] ماہنامہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ، اگست ۱۹۸۳ء، ص: ۴۶، مولانا مجیب اللہ ندوی،

حکیم الاُمّت اشرف علی تھانویؒ

(۱۸۶۳ء ـــــ ۱۹۴۳ء)

تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ نام عبدالغنی تھا لیکن اشرف علی سے مشہور ہوئے، پانچ سال کی عمر میں ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والد نے تربیت و پرورش کی سار[ی] ذمہ داری قبول کی۔ بچپن ہی سے نماز روزوں کا شوق تھا۔ مولانا شیخ محمد محدث تھانوی میاں جی نور محمد جھنجھانوی کے اجل خلفاء میں تھے، انہوں نے مولانا اشرف علی کو بچپن میں دیکھ[کر] فرمایا تھا کہ میرے بعد یہ لڑکا میری جگہ لے گا۔[1]

فارسی کی متوسط درجہ کی کتابیں اور عربی ابتدائی مولانا فتح محمد صاحب سے تھانہ بھون میں پڑھی اور فارسی کی کچھ اعلیٰ کتابیں اپنے ماموں واجد علی صاحب سے پڑھیں اس کے بعد دیوبند آ گئے یہاں مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا سیّد احمد صاحب، مولانا عبدالعلی صاحب اور ملّا محمود وغیرہ سے مختلف کتابیں پڑھیں ۱۳۰۱ھ کے آغاز میں یہاں سے فارغ ہو گئے۔

درسیات سے فراغت کے بعد چودہ سال تک کان پور میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ درسی خدمات کے علاوہ وعظ و نصیحت اور تقریروں کا سلسلہ جاری رکھا جس سے عوام آپ کے نزدیک آ گئے۔ وہاں سے ہٹنے کے بعد تھانہ بھون کو مستقل مستقر بنایا اور تاحیات وہیں رہے البتہ مجالس وعظ میں کثرت سے اور کبھی کبھی مناظروں میں شرکت فرماتے رہے۔ آپ کے مواعظ اور تصنیف کردہ رسائل سے ہزارہا غافل مسلمانوں کو اصلاح کی توفیق نصیب ہوئی اور بیشمار بدعات کے دروازے بند ہوئے، آپ کی تصنیف کردہ کتابو[ں]

---

[1] اشرف السوانح جلد اول، ص ۵۴، خواجہ عزیز الحسن مجذوب۔

رر رسائل کی مجموعی تعداد سات سو سے متجاوز ہے۔

علمی آثار

آپ کی کتابیں زیادہ تر تفسیر، حدیث، منطق، کلام، عقائد اور تصوف سے متعلق ہیں۔ ب سے پہلی تصنیف زیر و بم ہے جو آپ کے عہد طالب علمی کی یادگار ہے اور آخری منیف البوادر والنوادر ہے جو ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی یہ آپ کی بے شمار تحریروں کا انتخاب ہے۔ آپ کی زیادہ مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں :

(۱) بیان القرآن ۔ اردو زبان میں بارہ جلدوں میں قرآن پاک کی تفسیر ہے یہ ڈھائی سال میں مکمل ہوئی اور سب سے پہلی مرتبہ ۱۹۱۶ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ قرآن پاک کی تفسیر اور ترجمہ میں یہ ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔

(۲) بہشتی زیور۔ یہ دس حصوں میں ہے۔ اردو زبان میں ہے تعلیمات اسلامی کا خلاصہ ہے جو عورتوں کے لئے لکھا گیا ہے، گیارھویں جلد کا مردوں کے لئے خود آپ نے بعد میں اضافہ کیا۔ ہند و پاک کے گھر گھر میں یہ کتاب پڑھی جاتی ہے اور مسائل کے سلسلے میں کافی معلومات افزا اور مستند سمجھی جاتی ہے۔

(۳) فتاویٰ کا مجموعہ جو آٹھ جلدوں میں ہے اور آپ کی وفات کے بعد مرتب ہوا۔[۱]

حکیم الامت کا سب سے بہترین تعارف ان کی وہ تحریر کرائی ہے جو انہوں نے غانہ بھون میں متعین ایک پولیس افسر کی بیعت کی درخواست پر لکھی۔ فرماتے ہیں :

"میں ایک خشک طالب علم ہوں۔ اس زمانہ میں جن چیزوں کو لوازم درویشی سمجھا جاتا ہے جیسے میلاد شریف، گیارھویں، عرس، نیاز، فاتحہ، قوالی و تصرف و مثل ذالک میں ان سب سے محروم ہوں اور اپنے دوستوں کو بھی اس خشک طریقہ پر رکھنا پسند کرتا ہوں۔

میں نہ صاحب کرامت ہوں اور نہ صاحب کشف۔ نہ صاحب تعریف ہوں اور نہ عامل، صرف اللہ اور رسول کے احکام پر مطلع کرتا رہتا ہوں اور اپنے دوستوں سے کسی قسم کا تکلف نہیں کرتا نہ اپنی تعلیم کو نہ امور دینیہ کے متعلق کوئی مشورہ چھپانا چاہتا

---

[۱] اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۲۹۲ دانش گاہ پنجاب لاہور

ہوں۔ عمل کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کرتا، البتہ عمل کرتا ہوا دیکھ کر خوش اور عمل سے دور دیکھ کر رنجیدہ ضرور ہوتا ہوں۔

میں کسی سے نہ کوئی فرمائش کرتا ہوں نہ کسی سے سفارش۔ اس لئے بعض اہل الرائے مجھ کو خشک کہتے ہیں۔ میرا مذاق یہ ہے کہ ایک دوسرے کی رعایت سے کوئی اذیت نہ دوں۔ خواہ حرفی ہی اذیت ہو۔

سب سے زیادہ اہتمام مجھ کو اپنے لئے اور اپنے دوستوں کے لئے اس امر کا ہے کہ کسی کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائی جائے خواہ بدنی ہو جیسے مار پیٹ۔ خواہ مالی ہو جیسے کسی کا حق مار لینا یا ناحق کوئی چیز لے لینا خواہ آبرو کے متعلق ہو، جیسے کسی کی تحقیر کسی کی غیبت خواہ نفسانی ہو جیسے کسی کو تشویش میں ڈالنا یا کوئی ناگوار رنجیدہ معاملہ کرنا اور اگر اپنی غلطی سے کوئی ایسی بات ہو جائے تو معافی چاہنے سے عار نہ کرنا۔

مجھے ان کا اس قدر اہتمام ہے کہ کسی کی وضع خلاف شرع دیکھ کر تو صرف شکایت ہوتی ہے مگر ان امور میں کوتاہی دیکھ کر بے حد صدمہ ہوتا ہے اور دُعا کرتا ہوں کہ اللہ اس سے نجات دے۔ یہ ہے کچا چٹھا ورنہ لوگوں نے تو ؎

منش کردہ ام رستم پہلواں   دگرنہ یلے بود در سیستاں [۱]

جہاد کی ضرورت

حکیم الاُمت مذہب اسلام کو عبادات کے اندر محصور نہیں سمجھتے تھے اور اسلام۔ خانقاہی تصور کے خلاف تھے۔ جو نماز مسلمانوں کو نظم وضبط اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے تیار نہ کرے اسے نماز ہی نہیں سمجھتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ دین کے غلبہ اور اسلام کی اشاعت کے لئے جدّوجہد ضروری ہے اور اس راہ میں مرحلہ جہاد کا آنا ناگزیر ہے بغیر قتال کے دین قائم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ:

"جیسے یہ غلط ہے کہ نماز روزہ کو کامیابی میں کیا دخل ہے اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ خالی نماز روزہ کامیابی کے لئے کافی ہے بلکہ دلائل اس کے شاہد ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کبھی کامیابی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے بلکہ ایک دوسری

---

[۱] بیس بڑے مسلمان، عبدالرشید ارشد ص ۳۰۵، مکتبہ رشیدیہ لاہور

چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ چیز قتال وجہاد ہے۔ کیا مکہ میں نماز روزہ نہ تھا۔ بھلا صحابہ سے بڑھ کر نماز روزہ کس کا ہو سکتا ہے مگر اس کے باوجود دیکھ لیجئے کہ مکہ کے اندر مسلمان اتنے دنوں تک رہے لیکن غلبہ نہ ہوا۔ جب ہجرت ہوئی، قتال ہوا اس وقت غلبہ حاصل ہوا۔ تمام تاریخ اسلام اٹھا کر دیکھ لو، کہیں اس کی نظیر نہ ملے گی کہ خالی نماز روزہ سے مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا ہو البتہ ضروری نماز روزہ بھی ہے۔ غلبہ کی حیثیت سے نماز روزہ اور قتال میں فرق یہ ہے کہ نماز روزہ تو شرط ہے غلبہ کی۔ اگر نماز روزہ اور اطاعت ہوگی تو غلبہ ہوگا اور جہاد علت ہے غلبہ کی۔ گو نماز روزہ فرض عین ہے اور جہاد فرض کفایہ ہے مگر غلبہ کی علت جہاد ہی ہے پس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا غلبہ دونوں ہی چیزوں پر موقوف ہے اور یہ میری رائے آج سے نہیں ہمیشہ سے ہے کہ جب تک طاقت کے ساتھ قتال نہ ہوگا اس وقت تک مسلمانوں کو فلاح میسر نہیں ہو سکتی اور جہاد کے لئے مرکز ضروری ہے لہٰذا سخت ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز قائم ہو دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی امیر المومنین ہو اور جس کو امیر المومنین بنایا جائے گا اس کے تین صفات ہوں، ایک تدین یعنی وہ دیندار ہو دوسرے وہ سیاست سے واقف ہو اور تیسرے اس کے اندر ہمت ہو۔ اب مشکل یہ ہے کہ بعض کے اندر تدین تو ہے مگر سیاست سے واقفیت نہیں اور بعض کے اندر ہمت نہیں ہے[1]

متحدہ قومیت کی مخالفت

حکیم الامت اول روز سے آزادی وطن کے لئے ہندو اور مسلم کی مشترکہ جدوجہد کے خلاف تھے۔ آپ کے نزدیک اس جہاد میں کافروں سے امداد لینے کی اجازت نہ تھی چنانچہ آپ نے مشترکہ جدوجہد کا ساتھ دینے سے انکار کیا اور اس موقف پر تاحیات قائم رہے اور ہر طرح کے طعن و تشنیع برداشت کرتے رہے ان کا خیال شروع سے یہ رہا کہ مسلمانوں کی الگ تنظیم ہونی چاہیئے[2] اور اسی بنا پر مولانا حسین احمد مدنی رح اور دوسرے علماء سے

---

[1] آثار رحمت ص ۱۰۴ [2] چراغ راہ کراچی کا نظریہ پاکستان نمبر ص ۲۳۰

زبردست اختلاف بھی ہوا لیکن مولانا شبیر احمد عثمانی اور حکیم الامت تمام مخالفتوں کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑے رہے اور دیوبند کے حلقہ میں متحدہ قومیت کے خلاف بولتے اور لکھتے رہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا بیان ہے کہ

"پاکستان کا تخیل۔ خالص حکومت اسلامی کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں، پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں بس صرف حضرت کو ہم لوگوں کے اس وقت کے طریق کار سے پورا اتفاق نہ تھا لیکن یہ اختلاف کچھ ایسا بڑا اختلاف نہیں۔ نفس مقصد یعنی حکومت کافرانہ سے گلو خلاصی اور دارالاسلام کے قیام میں تو حضرت ہم لوگوں سے کچھ پیچھے نہ تھے۔ عجب نہیں جو کچھ آگے ہی ہوں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا۔ حضرت کو حکومت وقت سے جو مخالفت تھی وہ اس کے "کافرانہ" ہونے کی بنا پر تھی نہ کہ اس کے بدیسی یا غیر ملکی ہونے کی بنا پر[1]"

اس بیان سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ حکیم الامت نظام اسلام کا قیام چاہتے تھے اور اس کے لئے جد و جہد کو ضروری قرار دیتے تھے لیکن آپ کے نزدیک اس جد و جہد اور جہاد میں غیر مسلموں سے سمجھوتہ کرنا صحیح نہ تھا۔

مسلم لیگ کی حمایت

چونکہ لیگ نے اسلامی حکومت کا نعرہ بلند کیا تھا اور پاکستان کا تخیل پیش کرتے وقت اسلام کو آگے آگے رکھا اور محمد علی جناح اور دوسرے لیڈران اپنی تحریروں اور تقریروں میں بار بار اسلامی نظام کے قیام کا وعدہ کر رہے تھے اس لئے آپ نے مسلم لیگ کی حمایت کی اور اپنے مریدین اور احباب کو بھی اس کی حمایت کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ پوری وضاحت کے ساتھ آپ نے فرمایا کہ:

"شرح صدر کے ساتھ میری یہ رائے قائم ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو اطمینان و توکل کے ساتھ مسلم لیگ میں داخل ہونا چاہیئے پھر ان میں جو اہل قوت اور اہل اثر ہیں ان کو اپنی قوت و اثر سے اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہیئے اور جو اہل قوت نہیں وہ

---

[1] حکیم الامت نقوش و تاثرات ، ص ۲۳، عبدالماجد دریابادی

اہل قوت کو وقتاً فوقتاً یاددہانی کرکے تقاضے کے ساتھ ان سے اصلاح مطلوب کی درخواست کرتے رہیں اور اصلاح کے طریقوں میں علماء محققین سے مدد لیتے رہیں جو علماء اس میں شریک ہوں اُن سے تو علمی و عملی دونوں قسم کی امداد حاصل کریں اور جو اس میں کسی مصلحت یا عذر سے باضابطہ شریک نہ ہوں اُن سے صرف علمی مدد لیں یعنی ان سے واقعات ظاہر کرکے احکام شرعیہ معلوم کرتے رہیں اور ان کے موافق مسلم لیگ کی حالت کو درست کرتے رہیں اور مسلم لیگ میں جو معاملات پیش آدیں اُن کے متعلق اگر علماء میں اختلاف رہے تو جو علماء کسی جماعت میں باضابطہ شریک نہ ہوں اُن سے استفتاء کیا جائے اور ان میں بھی اگر اختلاف ہو تو شرعاً دونوں شقوں میں گنجائش سمجھی جاوے۔ اور دونوں شقوں میں سے مدبروں کے نزدیک جو مصلحت ہو اس پر عمل کیا جاوے اور جو علماء کسی جماعت میں باضابطہ شریک نہ ہوں وہ بھی بیکار نہ رہیں بلکہ وہ اس سے اہم خدمت میں مشغول رہیں اور وہ خدمت بندگانِ خدا کو احکام شرعیہ کی تعلیم و ترغیب دینے کی ہے جو مشترک طریقہ ہے حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا، بلکہ پہلی قسم کے علماء کو بھی جتنا وقت مسلم لیگ کی خدمت سے بچے اس میں اشاعتِ احکام میں حصہ لینا ضروری ہے پس اس تفصیل سے باقاعدہ تقسیم عمل (جو آیت وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ سے بھی ماخوذ ہے) سب کو اپنے کام میں مشغول ہونا چاہیے پھر اس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ وعدۂ الٰہیہ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ اور إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ کا ظہور ہوگا[1]

مسلم لیگ کی حمایت کے ساتھ ہی حکیم الامت اس کی خرابیوں اور خامیوں پر تنقید بھی کرتے تھے اور اس کے کارکنان کی اصلاح حال کی کوشش بھی کرتے تھے۔ چنانچہ آنریری سکریٹری پراونشل مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کی معرفت سرسکندر حیات خاں وزیراعظم پنجاب نے جب حضرت تھانوی کو مسلم لیگی امیدوار شیخ صادق حسین کی حمایت حاصل کرنے

---

[1] افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص ۷۳

کے لئے خط لکھا تو اس کا جو جواب آپ نے دیا وہ بڑا بصیرت افروز ہے۔ اس میں حضرت تھانوی نے فرمایا تھا کہ:

"احقر تو مسلم لیگ کا ہمیشہ حامی ہے اور وہ حمایت الحمدللہ کہ کسی غرض کی وجہ سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی دینوی اصلاح ہیں اس وقت مسلم لیگ ہی میں شامل ہونے میں سمجھ رہا ہوں اور کانگریس میں داخل ہونے میں دینی و دُنیوی دونوں کا نقصان خیال کرتا ہوں لیکن ہر مُسلمان جانتا ہے کہ دُنیا سے دین مقدم ہے اور تاریخی واقعات و شواہد سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب تک مسلمان دین اور مذہب پر قائم رہے اور اس قدر پختگی سے قائم رہے کہ لوگ ان کو مجنون سمجھتے تھے ان کو دین کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل کی دھن تھی، اس وقت دُنیوی اعتبار سے بھی مسلمان ہر طرح کامیاب رہے اور تمام دُنیا میں ان سے آنکھ ملانے والا کوئی نہ تھا اور جب سے اس میں کمی آئی اسی وقت سے ذلیل ہوتے ہوتے اب ان کی ذلت کی انتہا ہو چکی ہے اور تمام سمجھدار حضرات اپنی تحریروں اور تقریروں میں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے ماضی کی طرف پلٹنا چاہیئے مگر نہ معلوم اس کا کیا مفہوم لیا ہے کہ اس کو فرماتے سب ہیں، جانتے سب ہیں مگر دین کی باتوں سے گریز ہے کہتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے۔ سو اگر حضراتِ لیگ دینداری کی طرف توجہ فرماتے تو آج لیگ کی ترقی سے تمام اقوام خائف ہوتیں مگر نہ معلوم کہ کون سی چیز مانع ہے کہ اس طرف نہیں آتے۔ میں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسہ پٹنہ میں ایک پیام بھیجا تھا جو وہاں پڑھا بھی گیا تھا اور سب حضرات کو تقسیم بھی کیا گیا تھا، اُس میں صرف دو چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی تھی، اوّل نماز کی پابندی کو لیگ کے مقاصد میں شامل کیا جاوے، دوسرے وضعِ اسلامی کو لیگ کے ہر ممبر پر لازمی قرار دیا جاوے۔ نماز کا ارکانِ اسلام میں اہم ترین رُکن ہونا ہر مُسلمان کو معلوم ہے، اور وضع خاص رکھنا تو ایسی چیز ہے کہ دُنیا کے تمام سیاست داں اس کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ جرمنی کا لباس الگ ہے جاپان کا الگ ہے۔ فرانس کا الگ وعلیٰ ھٰذا۔ اور فوجی وردی تو لازمی

طور پر الگ ہوتی ہے اگر جرمنی سپاہی مثلاً انگریزی وردی پہن کر جرمن فوج میں شامل ہو اور ویسے ہر طرح وفادار اور مستعد ہو، لیکن صرف وردی کی تبدیلی کی وجہ سے وہ مستوجب سزا ہو گا وعلیٰ ھٰذا تو کیا مسلمانوں کے لئے جو حق تعالیٰ کی فوج ہے کوئی خاص وضع اور امتیاز ضروری نہیں ہے؟ ہے اور ضروری ہے۔[1]

---

[1] بیس بڑے مسلمان ص ۲۶۲، عبدالرشید ارشد

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

(۱۸۵۵ء ـــــ ۱۹۴۹ء)

دیوبند جائے ولادت ہے۔ والد اپنے زمانہ کے فاضل اور اردو ادب کے ماہر اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے، فارسی کی تعلیم منشی منظور احمد دیوبندی اور مولانا محمد یٰسین صاحب سے حاصل کی۔ عربی اساتذہ میں مولانا محمد یٰسین شیرکوٹیؒ، مولانا غلام رسول ہزاروی، مولانا حکیم محمد حسن اور بالخصوص شیخ الہند مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا تھے۔ ۱۹۰۸ء میں تعلیم سے فراغت پائی اور درس و تدریس کی خدمت میں لگ گئے۔ ۱۳۴۴ھ میں شاہِ حجاز کی دعوت پر جمعیت العلماء ہند کی طرف سے نمائندہ بن کر گئے اور وہاں عربی میں زبردست تقریریں کیں۔ ۱۳۴۸ھ میں جامعہ ڈابھیل ضلع سورت تشریف لے گئے اور وہاں تفسیر و حدیث پڑھاتے رہے۔ ۱۹۳۶ء میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے اور دارالعلوم کی ترقی میں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ جمعیت علمائے اسلام کے صدر کی حیثیت سے آپ نے ملک کے طول و عرض میں دورے کئے۔ پاکستان بننے پر ۱۶ اگست ۱۹۴۷ء کو افتتاح پاکستان کی تقریب میں حصہ لینے کے لئے دیوبند سے کراچی روانہ ہوئے اور وہیں مقیم ہو گئے اور تاحیات پاکستان کی خدمت اور نظریۂ اسلامی کی تبلیغ و اشاعت میں لگے رہے۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں قانونِ اسلامی کی تجویز پاس کرائی جو مسلمانانِ عالم پر ایک زبردست احسان اور اسلامی حکومت کے قیام کے لئے ایک اہم اقدام تھا۔

علمی کارنامے

آپ نے اسلام، قرآن اور تبلیغ سے متعلق متعدد رسالے، مضامین اور کتابیں لکھیں جن میں قرآن کریم کی تفسیر اور مسلم کی شرح زیادہ مشہور ہوئیں۔ آپ کی یہ تفسیر شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے مترجم قرآن کریم کے حاشیہ پر لکھ کر چھپوائی گئی ہے۔ اس

تفسیر کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں :

(۱) جامع و مانع ہے۔ اختصار کی جگہ اختصار اور وضاحت و تفصیل کی جگہ اس میں تفصیلات ہیں۔ یعنی حسب موقع و محل ہے۔ ضرورت سے زیادہ اور ضرورت سے کم کا راستہ اختیار نہیں کیا گیا ہے۔

(۲) یہ تفسیر بڑی بڑی ضخیم تفسیروں سے بے نیاز کر دیتی ہے اور مضامین قرآن سے واقفیت کے لئے کافی ہے۔

(۳) مشکل سے مشکل مسائل کو نہایت سلیس اور دل چسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ قاری کے دماغ کو قبول کرنے میں قطعاً دقت محسوس نہیں ہوتی۔

(۴) یہ تفسیر اہل سُنّت والجماعت کے مسلک کے مطابق ہے اس میں ضروریات زمانہ کا بھی خیال رکھا گیا ہے یعنی قدیم و جدید خیالات والے اہل علم دونوں کے فکری تقاضے پوری کرتی ہے۔

(۵) فصیح و بلیغ، شستہ اور شگفتہ اردو زبان میں ہے اس کا طرز بیان خشک اور مُغلق نہیں ہے[1]

قرآن کریم کی تفسیر کے سلسلے میں آپ کا اصول کیا تھا، اُس تحریر سے ملاحظہ فرمایئے جو آیت وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا کی تفسیر میں آپ نے لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

> "یعنی سب مل کر قرآن کو تھامے رہو جو خدا کی مضبوط رسّی ہے۔ یہ رسّی ٹوٹ تو نہیں سکتی ہاں چھوٹ سکتی ہے .... لیکن تمسک بالقرآن کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن کو اپنی آراء و اہواء کا تختۂ مشق بنالیا جائے بلکہ قرآن کریم کا مطلب وہی معتبر ہوگا جو احادیث صحیحہ اور سلف صالحین کی متفقہ تصریحات کے خلاف نہ ہو[2]"

آپ کی دوسری مایۂ ناز تصنیف مسلم کی شرح "فتح الملہم" ہے۔ اس کتاب کی خصوصیات کیا ہیں، علامہ انور شاہ کشمیری کے قلم سے پڑھئے:

---

[1] تجلیات عثمانی ص ۹۴، ۹۵، پروفیسر انوار الحسن شیر کوٹی، ادارہ نشر المعارف چہلیک ملتان

[2] قرآن کریم بتفسیر عثمانی ص ۸۱ فوائد ص ۹۱ ۔

(۱) حدیث کے ان مشکل مضامین کی شرح کی گئی ہے جو اللہ کی ذات وصفات اور دوسرے خدائی افعال یا دقیق حقیقتیں جو انسانی عقلوں سے بلند ہیں، حدیث میں وارد ہوئی ہیں۔

(۲) دقیق اور مشکل مسائل کو مثالوں اور نظیروں سے سمجھایا گیا ہے۔

(۳) چاروں اماموں کے اقوال قابل اعتماد کتابوں سے پیش کئے گئے ہیں اور اختلافی مسائل میں مذہب حنفیہ کو احتیاط اور انصاف کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

(۴) ہر باب کے متعلق جو میسر ہو سکے، بزرگ عارفین اور صوفیائے کرام کے اسرار اور نکات کو نقل کیا گیا ہے جو شیخ اکبر کی فتوحات اور حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ سے مل سکے ہیں

(۵) موجودہ نئی روشنی کے لوگوں کے شبہات کو جو یورپ کی پیروی میں اطمینان قلب کھو چکے ہیں، دُور کیا گیا ہے۔

(۶) احادیث کی تطبیق میں تا مقدور کوشش کی گئی ہے کہ تعارض نہ رہے [۱]

انہی خصوصیات کی بنا پر علامہ سید سلیمان ندوی نے اس شرح کو بہت سراہا[۲] اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے مدح کے انداز میں لکھا کہ:

"بخاری کی شرح تو عمدۃ القاری کے نام سے علامہ عینی حنفی مدت ہوئی لکھ چکے تھے، لیکن صحیح مسلم کا قرضہ حنفیہ پر صدیوں سے چلا آ رہا تھا مولانا ہی کی ذات تھی کہ فتح الملہم کے نام سے مبسوط و مستند شرح لکھ کر دنیائے حنفیت سے فرض کفایہ ادا کیا[۳]"

---

[۱] تجلیات عثمانی ص ۲۱۲، ۲۱۳، انوار الحسن شیرکوٹی

[۲] معارف اپریل ۱۹۵۰ء میں علامہ نے لکھا کہ:

"صحیح بخاری کی شرح تو احناف میں سے حافظ بدر الدین عینی نے بہت پہلے لکھ کر احناف کی طرف سے حق ادا کر دیا تھا مگر صحیح مسلم کی کوئی شرح حنفی نقطۂ نظر سے اب تک نہیں لکھی گئی اس کے لئے مرحوم نے اپنے دست و بازو کو آزمایا۔"

[۳] اخبار صدق لکھنؤ، دسمبر ۱۹۴۹ء

دو قومی نظریہ کی حمایت

آپ کی ملکی و ملی خدمات کا آغاز جنگ بلقان سے ہوا۔ اس موقعہ پر آپ نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ساتھ ترکوں کی امداد و اعانت کے لئے دوڑ دھوپ کی۔ اخبار احسان کے الفاظ میں :

"شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے جذبۂ اخوت میں جوش پیدا ہوا اور آپ نے بذات خود چندہ جمع کیا۔ ہلال احمر کے کام میں آپ نے دن رات ایک کر دیا اور ایک سچے مومن اور مجاہد کی طرح مردانہ وار ترکوں کی مدد کی"[1]

پھر آپ نے تحریک خلافت میں زبردست حصہ لیا۔ اور انگریزوں کے خلاف یہاں کا ماحول شعلہ جوالہ بن گیا۔ اسیر مالٹا کی واپسی اور رہائی پر آپ نے اپنے استاذ کی معیت میں طوفانی دورے کئے اور شیخ الہند کی زبان اور قلم بن کر پوری ترجمانی کی۔ چنانچہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں کہ

"حضرت شیخ الہند کے مالٹا سے واپس آنے کے بعد آپ نے ۱۹۱۹ء کے آخر میں اور ۱۹۲۰ء کے شروع میں سہارنپور، غازیپور، لکھنؤ، بنارس، کانپور علی گڑھ، دہلی کے بڑے بڑے اجتماعات میں حضرت شیخ الہند کے ترجمان کی حیثیت سے جو بلند پایہ تقریریں کیں انہوں نے ملک کے گوشے گوشے میں مولانا عثمانی کی عظمت و برتری کا سکہ جما دیا"[2]

جمعیت العلماء ہند کی مجلس عاملہ کے زبردست رکن تھے۔ ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک اس میں شریک رہے، لیکن جب دیکھا کہ جمعیت العلماء کانگریس کی گود میں چلی گئی ہے اور بلا شرط اس کی تائید و حمایت کرنے لگی ہے تو اس سے الگ ہو گئے چنانچہ علامہ موصوف اپنے پیغام کلکتہ میں لکھتے ہیں :

" ہم سب کو معلوم ہے کہ جمعیت العلمائے ہند دہلی بھی اپنے شائع کردہ مقاصد کے لحاظ سے کچھ بری نہ تھی وہ اپنی خدمات اور قربانیوں کے اعتبار سے اچھی خاصی

---

[1] احسان ۱۵ دسمبر ۱۹۴۹ء ص ۱ کالم ۱

[2] نظرات، برہان دہلی ماہ جنوری ۱۹۵۰ء

تاریخ رکھتی ہے۔ جو کچھ اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ اس کے اخیر کے چند سالہ طرزِ عمل پر ہیں۔[۱]

پھر آپ نے مسلم لیگ کی تائید و حمایت کی اور پاکستان کی تشکیل و تعمیر اور وہاں دستور میں اسلامی قانون کا آئین پاس کروانے میں آپ نے بنیادی کردار ادا کیا۔

سیاست میں آپ دو قومی نظریہ کے حامی تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آپ کا وہ پیغام درج کر دیا جائے جو موتمر کل ہند جمیعت علمائے اسلام کلکتہ مورخہ ۲۶ تا ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء کے اجلاس میں آپ نے پیش کیا تھا۔ فرماتے ہیں :

"ہندوستان میں جو سیاسی کشمکش اس وقت جاری ہے میرے نزدیک اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل تنفر بلکہ اشتعال انگیز جھوٹ اور سب سے بڑی اہانت آمیز دیدہ دلیری یہ ہے کہ یہاں کے دس کروڑ فرزندانِ اسلام کی مستقل قومیت کا صاف انکار کر دیا جائے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ غلط یا صحیح طور دنیا میں اقوام کی تقسیم وطن، نسل، زبان اور طرز تمدن وغیرہ کے لحاظ سے ہوتی رہی ہے اور اب بھی موجود ہے، لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے دُنیا کی جو تعمیر جدید ہوئی اس میں تخلیق کے اعلیٰ ترین مقاصد کے پیش نظر، اللہ کے پیدا کئے ہوئے تمام انسانوں کی باعتبار قومیت کے ایسی ثُنائی تقسیم کر دی گئی جس کے احاطے سے کوئی فردِ بشر باہر نہ رہ سکے۔ اب اسلامی نقطۂ نظر سے گویا رُوئے زمین پر دو ہی قومیں آباد ہیں ایک وہ قوم جس نے فاطرِ ہستی کی صحیح معرفت حاصل کر کے اس کے مکمل اور آخری قانون کو اس کی زمین پر رائج کرنے کا التزام کر لیا ہے وہ مسلم و مومن کہلاتی ہے۔ دوسری جس نے اپنے اوپر ایسا التزام نہیں کیا اس کا شرعی نام کافر ہوا۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ

(وہی خدا ہے جس نے تم کو پیدا کیا پس تم میں سے بعض کافر ہیں اور تم میں سے بعض مومن۔)

---

[۱] پیغام کلکتہ ص ۱۱، ہاشمی بکڈپو لاہور،

یاد رہے کہ ایمان و کفر کی یہ تقسیم حضورؐ سے پہلے بھی تھی لیکن آپ سے قبل چونکہ ہر نبی کسی مخصوص قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اس لئے ان کی بعثت سے قومیتوں کے قائم شدہ امتیازات کلیتہً مٹائے نہیں جا سکتے تھے۔ البتہ رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ اور نَذِیۡرًا لِّلۡعٰلَمِیۡنَ کی بعثت عامہ نے جو کسی ملک و خاندان یا زمان و مکان سے مقید نہ تھی ان تمام چھوٹے چھوٹے تشخصات اور محدود امتیازات کی قدر و قیمت گھٹا دی یا ختم کر دی۔ جس کو لوگوں نے اپنے جہل و تنگ نظری سے شرافت و کرامت کا اصلی معیار بنا رکھا تھا۔

اسلامی قومیت کا بحرِ ناپیدا کنار

اسے آپ یوں خیال کیجئے کہ ہمارے ملک میں چھوٹے بڑے دریا گنگا، جمنا، نربدا، اٹک وغیرہ بجائے خود اپنے تشخصات کے موجود ہیں اور ایک دوسرے سے جدا گانہ وجود رکھتے ہیں مگر یہ سب دریا ایک حد پر پہنچ کر اپنی اپنی ہستیوں کو سمندر کی بڑی ہستی میں اس طرح گم کر دیتے ہیں کہ وہاں ان کا کوئی امتیازی وجود باقی نہیں رہتا۔ ٹھیک اسی طرح دنیا میں وطنی، نسلی، لونی، حرفتی اور تمدنی تقسیم کے اعتبار سے گو سیکڑوں قومیتیں سہولت تعارف کے لئے اپنی اپنی جگہ موجود اور قائم ہوں پھر بھی یہ محدود قومیتیں اسلامی قومیت کے بڑے سمندر میں گر کر ایک قوم کی تشکیل میں شامل ہو جاتی ہیں جہاں ان کے وہ سارے امتیازات اور تفرقے ختم ہو جائیں ؎

چوں سلطان عزت علم بر کشد　　　جہاں سر بہ جیب عدم در کشد

اسی عالمگیر اسلامی قومیت کا بیان صحیح مسلم کی اس حدیث میں ہے:

عن ابن عباس عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انہ لقی رکبا بالروحاء فقال من القوم قالوا المسلمون فقالوا من انت قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم (صحیح مسلم مصری طبع جدید ۹۹)	ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ مقام روحا میں ایک قافلہ سے ملے تو آپؐ نے پوچھا کہ کون قوم ہے انہوں نے کہا مسلمان، پھر انہوں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قافلہ سے پوچھا تھا کہ تم کون قوم ہو؟ جواب میں انہوں

نے یہ نہ کہا کہ ہم حجازی یا نجدی یا یمنی یا قریشی یا ہذیل یا تمیم یا کچھ اور ہیں۔ ان سب سے زیادہ قبائلی تعصب و غرور رکھنے والے ملک میں ان کا جواب صرف یہ تھا کہ ہم مسلمان ہیں حالانکہ اس وقت تک انہوں نے حضور کو پہچانا بھی نہ تھا گویا وطنی اور نسلی سب کے سب بت ٹوٹ چکے تھے اور بجز اسلام کے اب کوئی حقیقی قومیت ان کے نزدیک باقی نہ رہی تھی۔ ابوعقبہ فارسی کے قصے میں جو آپ "انا الغلام الفارسی" کے نعرہ پر ناخوش ہوئے اور جب انہوں نے آپ کی تنبیہ کے مطابق "وانا الغلام الانصاری" کا نعرہ لگایا تو آپ کو مسرت ہوئی، اس کا راز بھی یہی تھا کہ مسلمان کی نظر میں قومیت کی تاسیس بجائے ملک و وطن کے دین اور کمالات دین پر ہونی چاہیے[1]۔

آپ کا سب سے زبردست اور آخری کارنامہ یہ ہے کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں اسلامی آئین کی تجویز پاس کرائی۔ اس مقصد کے لئے آپ نے پوری قوم کو بیدار کیا۔ عوام کے اندر سے آواز بلند کرائی۔ اراکین دستور ساز کمیٹی پر زور دیا۔ مسٹر لیاقت علی مرحوم کو فہمائش کی اور اس مقصد کے لئے ڈھاکہ میں فروری ۱۹۴۹ء میں تین روزہ کانفرنس منعقد کرائی جس میں آپ نے ایک زبردست خطبہ دیا۔ آپ نے حکومت کو چیلنج کیا کہ:

> "خواہ ارباب اقتدار ہمارے ساتھ کچھ ہی برتاؤ کریں...... ہم اس کوشش سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتے کہ مملکت پاکستان میں اسلام کا وہ دستور و آئین اور وہ نظام حکومت تشکیل پذیر ہو جس کی رو سے اس بات کا موثر انتظام کیا جائے کہ مسلم قوم اپنی زندگی اسلام کے انفرادی و اجتماعی تقاضوں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق، جو قرآن و سنت سے ثابت ہوں، مرتب و منظم کر سکے[2]۔

پھر آپ نے وہ بنیادی اصول بھی پیش کئے جن پر کوئی حکومت چل کر فلاح و کامیابی کا راستہ حاصل کر سکتی ہے۔ آپ کی انہی کوششوں کی بنا پر مسٹر لیاقت علی مرحوم نے حضرت علامہ ہی کے بتاتے ہوتے اصولوں اور مضمون کے مطابق دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد کے نام سے تجویز پیش کی اور اسے منظور کرائی اور اس طرح دستور مملکت نے گویا اسلام کا کلمہ پڑھ لیا۔

---

[1] پیغام کلکتہ ص ۱۲ تا ۱۶، شبیر احمد عثمانی۔

[2] قرارداد مقاصد ص ۶، ۷، بحوالہ تجلیات عثمانی ص ۷۰۳، پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی۔

نواں باب

اقامتِ دین کی جدّوجہد

تحریک تبلیغ اور مولانا الیاسؒ

ڈاکٹر اقبالؒ اور احیائے دین

مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی

تحریک تبلیغ اور مولانا الیاسؒ

(١٨٨٤ء — ١٩٤٤ء)

سیاسی وسماجی پس منظر

١٩٢٠ء کی بات ہے کہ ہندوستان میں آریوں کی کوشش سے جاہل دیہاتوں میں ارتداد کی آگ پھیلی اور مسلمان جو اپنے دین سے ناواقف اور خدا ورسول سے بیگانہ تھے اس آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس آگ کو بجھانے کے لئے ہر طرف مسلمان اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تبلیغی انجمنیں سرگرم عمل ہوئیں۔ مناظرین اسلام نے اسلام کی فوقیت ثابت کرنے کے لئے بحث وجدال کے میدان گرم کئے۔ ہزاروں روپیہ چندہ میں وصول کرکے مبلغین جگہ جگہ پھیلائے گئے۔ اور اسلام کو بچانے کے لئے ہر ممکن جدوجہد کی گئی۔

اسی دور میں مولانا محمد الیاس کاندھلوی نے نہایت خاموشی سے دعوت وتبلیغ کی کوشش کی اور اس مقصد کے لئے ایک ہمہ گیر تحریک چلائی جس نے دس بارہ سال کے قلیل عرصے میں میوات کے علاقے میں ایک نیا انقلاب برپا کردیا۔ اور گاؤں گاؤں نمازی بن گیا۔ اور خود دوسروں تک اسی دعوت کو پہنچانے میں لگ گیا۔

میو قوم دہلی کے آس پاس الور، بھرت پور، گوڑ گانوہ اور دوسرے متصل علاقوں میں آباد تھی۔ اس کی مجموعی تعداد ٣٦ لاکھ بتائی جاتی ہے۔ صدیوں پہلے نظام الدین محبوب الٰہیؒ اور ان کے خلفاء ومتبعین کی کوششوں سے اس قوم میں اسلام پہنچا تھا مگر افسوس کہ بعد کے زمانوں میں مسلمان حکمرانوں اور جاگیرداروں کی غفلت سے وہاں اسلامی تعلیم اور اسلامی تربیت کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ حکومت کے مرکز سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود اسلام سے دور ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ غیر مسلم مورخین کو بھی میواتیوں کی اسلام سے دوری اور بیگانگی کا احساس تھا۔ میجر پاؤلٹ جو انیسویں صدی

کے آخر میں ریاست الور کا آفیسر بندوبست رہا ہے۔ الور کے گزیٹر (شائع شدہ ۱۸۷۸ء) میں لکھتا ہے:

"میو اب تمام تر مسلمان ہیں، لیکن برائے نام، ان کے گاؤں کے دیوتا وہی ہیں جو ہندو زمینداروں کے ہیں۔ وہ ہندوؤں کے کئی ایک تہوار مناتے ہیں۔ ہولی میواتیوں میں مذاق اور کھل کھیلنے کا زمانہ ہے اور اتنا ہی اہم اور ضروری تہوار سمجھا جاتا ہے جتنا محرم، عید اور شب برات۔ اسی طرح وہ جنم اشٹمی، دسہرا اور دیوالی بھی مناتے ہیں، ان کے یہاں "پیلی چٹھی" لکھنے کے لئے یا شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لئے برہمن پنڈت بھی ہوتے ہیں، ایک رام کے لفظ کو چھوڑ کر وہ ہندوانہ نام بھی رکھتے ہیں اگرچہ خان جتنا ان کے ناموں کے اخیر میں ہوتا ہے اتنا نہیں لیکن پھر بھی بکثرت سنگھ ان کے ناموں کا اخیر جزو ہوتا ہے"

"میو اپنے مذہب (اسلام) سے بہت ناواقف ہیں، خال خال کوئی کلمہ جانتا ہے اور پابندی سے نماز پڑھنے والے اس سے بھی کم ہیں اور ان کے اوقات و مسائل سے تو وہ بالکل ہی ناواقف ہیں"

"مرد دھوتی اور کمری پہنتے ہیں۔ پائجامہ کا رواج نہیں۔ ان کا لباس حقیقتاً ہندوانہ ہے۔ مرد سونے کے زیورات بھی استعمال کرتے ہیں"

۹۷ "میو اپنے عادات میں آدھے ہندو ہیں ان کے گاؤں میں شاذونادر ہی مسجدیں ہوتی ہیں۔ تحصیل تجارہ میں میوؤں کے باون گاؤں میں صرف آٹھ مسجدیں ہیں البتہ مندروں کو چھوڑ کر میوؤں کی عبادت کی ویسی ہی جگہیں ہوتی ہیں جیسی ان کے ہمسایہ ہندوؤں کے یہاں ہوتی ہیں مثلاً پانچ پیرا، بھیسا اور چاہنڈ یا کھیڑا، دیو مہادیوی کے نام ہوتا ہے جس پر قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں۔ شب برات میں سید سالار مسعود غازیؒ کا جھنڈا بھی ہر میو گاؤں میں پوجا جاتا ہے۔" [1] ۹۸

---

[1] GAZETTEIR OF ULWURR 1878 LONDON

بحوالہ مولانا محمد الیاس اور ان کی دعوت ص ۶۸ ،

بھرت پور کے گزیٹر ۱۹۱۱ء میں ہے :

" وہ تمام تر جاہل اور غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں بھاٹ اور گویے بھی ہوتے ہیں جن کو وہ بڑی بڑی رقمیں اور انعامات دیتے ہیں۔ دیہاتی زندگی اور کاشتکاری کے موضوع پر بہت سی چوپائی نظمیں بنی ہوتی ہیں جو وہ مزے لے کر پڑھتے ہیں۔ بولی ذرا درشت اور سخت ہے جس میں عورت اور مرد سے یکساں طریقہ پر خطاب ہوتا ہے۔

ان میں محرک اور نشہ آور چیزوں کے استعمال کا بھی رواج ہے۔ وہ بہت ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست واقع ہوتے ہیں۔ شگون بہت لیتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کا لباس ہندوانہ ہے۔ پہلے زمانہ میں ان میں نوزائیدہ بچوں کے مار ڈالنے کی بھی رسم تھی، لیکن یہ رسم بالکل جاتی رہی ہے۔ غارت گری اور رہزنی ان کا پیشہ رہ چکا ہے اب اگرچہ ان کی اصلاح اور ترقی ہوگئی ہے پھر بھی جانور اڑا کر اور گائے بیل کھول کر لیجانے میں اب بھی وہ بہت مشہور ہیں۔

دعوت کا آغاز

ان حالات اور مقامات میں مولانا محمد الیاسؒ نے دین کی تحریک چلائی اور نہایت قلیل مدت میں وہاں کی کایا پلٹ دی۔ پورے علاقے میں دین کی رغبت پیدا ہوگئی اور اس کے آثار نظر آنے لگے۔ جس علاقہ میں کوسوں مسجد نظر نہ آتی تھی وہاں گاؤں گاؤں مسجدیں بن گئیں اور دیکھتے دیکھتے اس ملک میں ہزاروں مسجدیں کھڑی ہوگئیں صدہا مکتب اور متعدد عربی کے مدارس قائم ہوگئے۔ حفاظ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہوگئی۔ ہندوانہ وضع ولباس سے نفرت پیدا ہونے لگی اور اسلامی وشرعی لباس کی وقعت دلوں میں ہوگئی۔ حتیٰ کہ اکتوبر ۱۹۴۱ء میں ایک عالمِ دین نے وہاں کا دورہ ومشاہدہ کرنے کے بعد لکھا کہ:

" مولانائے محترم (محمد الیاسؒ) نے خود اسی قوم کے مبلغوں سے اس کی اصلاح کا کام لیا اور ان کی پیہم کوششوں کا نتیجہ، جو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، یہ ہے کہ بعض علاقوں میں گاؤں کے گاؤں ایسے ہیں جہاں ایک بچہ بھی آپ کو بے نمازی نہ ملے گا۔ دیہات کی وہ مسجدیں جہاں یہ لوگ کبھی اپنے مویشی باندھتے تھے، آج وہاں پانچوں وقت اذان اور جماعت ہوتی ہے۔ آپ کسی راہ چلتے دیہاتی کو روک کر اس کا امتحان لیں۔ وہ آپ کو صحیح تلفظ کے ساتھ کلمہ سنائے گا۔

اسلام کی تعلیم کا سیدھا سادا لُبِّ لُباب، جو ایک بدوی کو معلوم ہونا چاہیئے آپ کے سامنے بیان کرے گا، وہ آپ کو بتائے گا کہ اسلام کے ارکان کیا ہیں۔ اب آپ وہاں کسی مسلمان مرد، عورت یا بچے کو ہندوانہ لباس میں نہ پائیں گے، نہ اس کے جسم کو بے ستر دیکھیں گے اور نہ اس کے گھر کو یا اس کے لباس کو نجاستوں میں آلودہ پائیں گے۔ ان کے عادات و خصائل اور ان کے اخلاق میں بھی اس مذہبی تعلیم و تبلیغ کی وجہ سے نمایاں فرق ہو گیا ہے۔ اب وہ متمدن اور مہذب طرزِ زندگی کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ جرائم میں حیرت انگیز کمی ہو گئی ہے۔ لڑائیاں فسادات اور مقدمات بہت کم ہو گئے ہیں۔ ان کا علاقہ اب پر امن علاقہ ہے جس کا اعتراف خود وہاں کے حکام کر رہے ہیں۔ ان کی مُعاشرت، ان کے لین دین، ان کے برتاؤ غرض ہر چیز میں عظیم تغیّر ہو گیا ہے جس کی وجہ سے گرد و پیش کی آبادی پر ان کا اچھا اخلاقی اثر مرتب ہو رہا ہے اب وہ ذلت اور بے اعتباری کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے، بلکہ ان کی عزّت قائم ہوتی جا رہی ہے اور ان کے کیرکٹر پر اعتماد کیا جانے لگا ہے[1]۔

یہ انقلاب حال اور یکلخت تبدیلی محض ایک مخلص آدمی کی محنت و کاوش کا ثمرہ ہیں۔ یہاں نہ کوئی کمیٹی تھی نہ چندہ تھا، نہ کوئی اخبار اور ترجمان تھا، نہ قواعد پریڈ، یونیفارم اور باجوں اور جھنڈوں کے نمائشی مظاہرے تھے۔ بس مولانا نے خاموشی سے دعوت دین کا کام شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے اصلاح و تعمیر کا وہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا مکاتب و مدارس کے ذریعہ، دینی تعلیم کی اشاعت کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس معمولی اور انفرادی اصلاح سے حالات نہیں بدل سکتے اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام کی جماعتیں اہل علم افراد اور مرکزوں تک جائیں اور کچھ وقت فارغ کر کے دین سیکھنے سکھانے میں صرف کریں چنانچہ آپ کی کوششوں سے سب سے پہلے دس آدمیوں کی ایک جماعت

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۱۵ عدد ۲ ، اکتوبر ۱۹۳۹ء، ایک اہم دینی تحریک از سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۱۴۱ ، ۱۴۲۔

کاندھلہ کے سفر کے لئے تیار ہوئی اور رفتہ رفتہ فوائد و نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف جماعتیں دین سیکھنے اور تبلیغ کرنے کے لئے نکلنے لگیں۔ علماء کے سلسلے میں آپ کا خیال تھا کہ جب تک سلفِ اوّل کے طرز پر اشاعتِ دین کے لئے یہ لوگ نہ نکلیں گے، کام نہیں بنے گا۔ چنانچہ شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا مرحوم کو ایک خط میں لکھا:

"عرصے سے میرا اپنا خیال ہے کہ جب تک علمی طبقہ کے حضرات اشاعتِ دین کے لئے خود جا کر عوام کے دروازوں کو نہ کھٹکھٹائیں اور عوام کی طرح یہ بھی گاؤں گاؤں اور شہر شہر اس کام کے لئے گشت نہ کریں اس وقت تک یہ کام درجۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ عوام پر جو اثر اہلِ علم کے عمل و حرکت سے ہوگا، وہ ان کی دھواں دھار تقریروں سے نہیں ہو سکتا۔ اپنے اسلاف کی زندگی سے بھی یہی نمایاں ہے جو کہ آپ حضراتِ اہلِ علم پر بخوبی روشن ہے"[1]

طریقِ کار اور نظامِ کار

مولانا الیاسؒ نے دین کی دعوت اور تبلیغ کے لئے محنت اور جدّ و جہد، گشت اور سفر کا طریقہ اختیار کیا۔ لوگ عام طور سے دنیوی مشاغل میں پھنس کر دین سیکھنے اور حاصل کرنے کے لئے وقت نہیں نکال پاتے اس لئے آپ نے یہ پالیسی بنائی کہ انہیں عارضی ترک وطن اور "غربت" اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے تاکہ کچھ مدت کے لئے یکسو ہو کر دین کی بنیادی باتیں (کلمہ اور نماز) سیکھ سکیں اور اہلِ علم و دین کی صحبت سے فائدہ اٹھا سکیں[2]۔ اپنے ایک گرامی نامہ میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"ہم نے جماعتیں بنا کر دین کی باتوں کے لئے نکلنا چھوڑ دیا۔ حالانکہ یہی بنیادی اصل تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود پھرا کرتے تھے اور جس نے ہاتھ میں ہاتھ دیا وہ بھی مجنونانہ پھرا کرتا تھا...... غرض پھرنا اور دین کے لئے جدّ و جہد اور نقل و حرکت میں رہنا اصل تھا جب یہ چھوٹ گیا جب ہی خلافت ختم ہو گئی"[1]

---

[1] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت ص ۱۱۴، ۱۱۵،

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے: THE FAITH MOVEMENT OF MAULANA ILYAS. BY M. ANWARUL HAQ

نکلنے کے وقت حضور کی لائی ہوئی چیزوں میں سے جو چیز زیادہ سے زیادہ اہم ہے اس میں اسی کی حیثیت سے کوشش کرنا چاہیئے :

(۱) کلمہ کی تصحیح و تلقین - اس وقت بدقسمتی سے ہم کلمہ تک سے ناآشنا ہو رہے ہیں - اس لئے سب سے پہلے اسی کلمہ کی تبلیغ ہے جو کہ خدائی کا اقرارنامہ ہے یعنی اللہ کے حکم پر جان دینے کے علاوہ درحقیقت ہمارا کوئی بھی مشغلہ نہ ہوگا -

(۲) نماز کی تصحیح و ترقی - کلمہ کے لفظوں کی تصحیح کرنے کے بعد نماز کے اندر کی چیزوں کی تصحیح کرنے اور نمازوں کو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسی نماز بنانے کی کوشش میں لگے رہنا -

(۳) تحصیل علم و ذکر - تین وقتوں کو (صبح، شام اور کچھ حصہ شب کا) اپنی حیثیت کے مطابق تحصیل علم و ذکر میں مشغول رکھنا -

(۴) تفریغ وقت - ان چیزوں کو پھیلانے کے لئے اصل فریضۂ محمدی سمجھ کر نکلنا یعنی ملک بہ ملک رواج دینا -

(۵) خلق - اس پھرنے میں خلق کی مشقت کرنے کی نیت رکھنا - اپنے فرائض کی ادائیگی کی سرگرمی خواہ خالق کے ساتھ متعلق ہوں یا خلق کے ساتھ - کیونکہ ہر شخص سے اپنے ہی متعلق سوال ہوگا -

(۶) تصحیح نیت - ہر عمل کے بارے میں اللہ نے جو وعدے وعید فرمائے ہیں، ان کے موافق اس امر کی تعمیل کے ذریعہ اللہ کی رضا اور موت کے بعد والی زندگی کی درستی کی کوشش کرنا[1]

دین کی جڑ کی طرف توجہ

مولانا اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اصل اہمیت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہے اگر اس پر توجہ نہ دی جائے اور دین کی تبلیغ و اشاعت کو مرکزی اہمیت حاصل نہ ہو تو دین مضمحل ہو جائے گا - عبادتیں ناقابل قبول قرار پائیں گی اور دین کی شاخیں اور پتیاں مرجھا جائیں گی - چنانچہ فرماتے ہیں :

---

[1] ایک اہم دینی تحریک از سید ابوالحسن علی ندوی، ناشر مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ ص ۱۴، ۱۵

"میرے حضرت! یہ وظیفہ وظائف اور یہ اللہ کی بارگاہ میں دُعائیں اور دین کی لائن کی ہر چیز درحقیقت ایمان کی پگڈنڈیاں اور اس کے پھول پتے ہیں جونسا درخت اپنی جڑ سے سوکھ چکا ہو، اس کے پھول پتوں میں شادابی کہاں سے ہو سکتی ہے، اس واسطے اس بندۂ ناچیز کے نزدیک اس زمانہ میں نہ دُعا کارگر ہے نہ وظیفہ بار آور ہے اور نہ کسی کی طرف توجہ اور ہمت کار آمد ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس وقت دین کے فروغ کی کوشش ترک ہو چکی ہوگی جس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں اس وقت دُعاؤں میں راتیں رو کر گزارنے والوں کی دُعا مقبول نہیں ہونے کی۔ ابواب رحمت بند ہو چکے ہوں گے۔ ابواب رحمت کھلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ مسلم کا فروغ، اسلام کے فروغ کی کوشش میں لگنے کے اندر کے علاوہ ہرگز متصور نہیں، حق عزّ وجل نے مومن کے ساتھ رحمت کے ساتھ توجہ کرنے اور کرم و الطاف کے ساتھ برتاؤ کرنے کا ارادہ صرف اُسی وقت فرمار کھا ہے کہ جب وہ اسلام کے فروغ میں ہو، اسلام کے فروغ میں اپنی سعی مصروف کر رہا ہو۔"[1]

یہ تحریک صلوٰۃ نہ تھی

مولانا کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ قوم کے اندر پہلے دین کے لئے طلب اور رغبت پیدا کی جائے۔ کلمہ لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کا معنیٰ و مفہوم ان کے ذہنوں میں راسخ کیا جائے، دین کی بنیادی باتوں سے واقفیت بہم پہنچائی جائے پھر انہیں غلبۂ دین کے لئے اٹھا کھڑا کیا جائے۔ بغیر عقائد و مبادی کی درستی کے دین قائم و غالب نہیں ہو سکتا چنانچہ ایک گرامی نامہ میں فرماتے ہیں:

"جس قوم کی پستی کلمہ لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کے لفظوں سے بھی گر چکی ہو وہ ابتداء سے درستی کئے بغیر انتہائی کی درستی کے کب قابل ہو سکتی ہے۔ انتہا ابتداء کے درست ہوئے بغیر نہیں ہو سکتی اس لئے میں نے درمیانی اور انتہائی خیالات بالکل نکال دیئے، ابتداء درست ہو کر راستہ پر پڑ جائیں گے تو انتہاء پر خود بھی پہنچ جائیں گے اور ابتدا کے بگڑے ہوئے انتہائی درستی کا خیال ہوس اور

---

[1] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت ص ۲۹۱، ۲۹۲۔

بوالہوسی کے سوا کچھ نہیں[۱]"

مولانا کے اندر دین کے غلبہ و تمکن کی تڑپ اور اسلام کی بدحالی و کس مپرسی پر درد اور کسک کس بلا کی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ ایک بار کسی نے لال قلعہ کے پاس سے گزرتے ہوتے پوچھا کہ کبھی جناب نے لال قلعہ بھی دیکھا ہے تو فرمایا کہ میں لال قلعہ کی سیر کو بے حمیتی سمجھتا ہوں، ہاں میں نے بچپن میں اس وقت دیکھا ہے جب دکھانے والے رو رو کر دکھاتے تھے[۲]

مولانا پر یہ بہت گراں تھا کہ عربی زبان اور دینی علوم میں بھی مسلمان غیروں کے دست نگر اور ان کے ماتحت ہوں غالباً مولانا نے حافظ عبداللطیف صاحب کو ایک خط میں لکھا کہ:

"حافظ صاحب مجھے بڑی غیرت آتی ہے کہ مسلمانوں کی عربیت کے جانچ کرنے والے کفار ہوں[۳]"

انہی کے نام ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"زیادہ زور اس امر پر دیا جاتے کہ قوم اپنی پنچایتیں اور اپنے سب کاروبار اور سب فیصلے شریعت کے موافق کرنے ہی کو اسلام سمجھے ورنہ اسلام نہایت ناقص ہے بلکہ بسا اوقات احکام شرعیہ کی بے وقعتی اور بے رخی اور توہین کی بدولت اسلام جاتا رہتا ہے اور یقیناً کفر ہو جاتا ہے[۴]"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے سامنے اسلام کے مکمّل نظام کا تصور موجود تھا اور غیر اسلامی اور طاغوتی عدالتوں میں فیصلہ کرانے کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اپنے سارے معاملات اسلام کی روشنی میں طے کرنے کو محبوب رکھتے تھے۔ البتّہ اسلام کی اقامت کو نماز کی اقامت سے شروع کیا کہ نماز کے بغیر اسلام کی اقامت بے معنی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مولانا کے پیش نظر صرف تحریک اقامت صلوٰۃ برپا کرنا تھی بلکہ آپ پورے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوتے تھے جس کی ابتدا، کلمہ کی تلقین اور نماز کی اقامت سے ہوتی تھی — چنانچہ ایک بار اپنے عزیز مولوی ظہیر الحسن صاحب (ایم اے علیگ)

۱؎ ۲؎ ۳؎ ۴؎ حوالہ بالا ص ۲۲۲، ۲۲۳

سے فرمایا :

"ظہیرالحسن میرا مدعا کوئی پاتا نہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تحریک صلوٰۃ ہے میں قسم سے کہتا ہوں کہ یہ ہرگز تحریک صلوٰۃ نہیں"

ایک روز بڑی حسرت سے فرمایا کہ :

"میاں ظہیرالحسن ایک نئی قوم پیدا کرنی ہے" [1]

مولانا کی یہی دینی حمیت، اسلام کے کامل نظام کے تصور کی حکمرانی اور شریعت اسلامیہ کو غالب دیکھنے کی تڑپ تھی کہ حکومت کی جبری تعلیم کی آپ نے سخت مخالفت کی تھی اور علماء کو اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ شدھی سنگٹھن کے زمانے میں تحریک ارتداد کا مقابلہ کیا اور اپنی بے پایاں کوششوں سے مسلمانوں میں اس کا رُخ موڑ دیا۔

قابل غور نکات

اس تحریک کی بے پایاں خدمات کے باوجود چند چیزیں قابل توجہ اور اصلاح طلب ہیں :

(۱) اس تحریک نے اسلام کا پیغام صرف انہی لوگوں تک پہنچایا جو نسلاً مسلمان تھے حالانکہ اسلام مسلمانوں کی میراث نہیں ہے بلکہ یہ ساری کائنات کے لئے ہے اور ہمیں اس پیغام کو مسلمان اور غیر مسلم سب کے پاس پہنچانا چاہیئے اور اس کی توسیع و اشاعت میں جو رکاوٹیں ہوں انہیں دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ خیرِ اُمّت تمام انسانوں کے لئے برپا کی گئی ہے اور پوری دنیا کی فلاح و بہبود کے لئے اسے اُٹھایا گیا ہے۔

(۲) اسلام صرف کلمہ اور نماز تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک مکمل نظام ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی دیتا ہے۔ عبادت و سیاست، معیشت و معاشرت، صلح و جنگ، عقائد و ارکان سب کچھ اس میں موجود ہیں۔ اس لئے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے سامنے ہمیں اسلام کی مکمل تصویر پیش کرنی چاہیئے۔ مولانا الیاسؒ کے نزدیک مقصود یہی تھا لیکن ابتداء آپ نے کلمہ اور نماز سے کی اب اسے مزید آگے بڑھنا چاہیئے۔

(۳) مسلمانوں کی مذہبی و اخلاقی حالت کی اصلاح وہ آخری منزل نہیں ہے جس پر پہنچ کر ہمارا کام ختم ہو جاتا ہے بلکہ اصل مقصود ان منتشر قوتوں کو مجتمع کر کے اور ان کی اسلامی تربیت کر کے دین کی اقامت کے لئے انہیں استعمال کرنا ہے تاکہ خدا اپنی خلافت سے انہیں سرفراز کرے اور وہ زمین کے صالح وارث بن سکیں۔

---

[1] حوالہ سابق ص ۲۲۶

ڈاکٹر اقبالؒ اور احیائے دین

ڈاکٹر اقبالؒ نے جس دور میں اُمتِ مُسلمہ کی خدمت کا بیڑہ اُٹھایا، اس وقت عالمِ اسلام ایک مخصوص صورت حال سے دوچار تھا۔ چالیس سے زائد ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہونے کے باوجود غلامی کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے، سیاسی و معاشی بدحالی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ بنیادی عقائد سے بے خبری اور اسلام کی اساسی تعلیمات سے ناواقفیت اور بیزاری عام تھی۔ مغربی تہذیب کی صنّاعی نے نظروں کو خیرہ کر دیا تھا اور علم، لباس، کردار، عمل اور اطوار، طرز فکر و نظر اور انداز بود و باش ہر چیز پر تہذیب نو کا غلبہ تھا، اقبال چونکہ ایک عظیم شاعر، بالغ نظر مفکر، بلند پایہ فلسفی، صاحب طرز ادیب، ماہر قانون اور اسلام کے سچے ترجمان تھے اس لئے اس ہمہ جہتی شخصیت نے بیسویں صدی کی اسلامی نشأۃ ثانیہ کے لئے معمار کی حیثیت سے کام کیا، شاعری کی دُنیا میں اسلام کی مکمل ترجمانی کی۔ احیائے اسلام کی بنیادیں رکھیں، فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں نمایاں حصہ لیا۔ مغربی تہذیب پر بھرپور وار کیا۔ غیر اسلامی افکار و نظریات کا بطلان نمایاں کیا اور اُمت کو اسلام سے جوڑنے کی انتھک کوشش کی۔

تہذیب نو پر کاری ضرب لگائی

علامہ اقبال کا اولین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تہذیب مغرب کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر اس کی تہ میں چھپی ہوئی آلائشیں لوگوں کے سامنے کر دیں اور ایک دنیا اس پر نفریں کرنے لگی۔ انہوں نے تہذیب نو کا طلسم توڑ دیا اور اس کی بے حیائی و بے قیدی، اباحیت و الحاد اور تشکیک و فحاشی کی ہنڈیا سر راہ پھوڑ دی اور اس کے نتیجے میں مسلمان مغرب کے تھپیڑے کھا کر اسلام کی حقانیت کے قائل ہوتے گئے۔

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

اس تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں — بھڑک اٹھا بھبھوکا بن کے مسلم کا تن خاکی
حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا — رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

تہذیب مغرب سے مرعوب نوجوانوں کو یوں للکارا ؂

ترا وجود سراپا تجلیِ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

ایک دوسری جگہ مغربی تہذیب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا :؂

فساد قلب ونظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیرِ پاک وخیالِ بلند وذوقِ لطیف

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

ایک دوسرے انداز میں اسی بات کو یوں کہتے ہیں ؂

شفق نہیں مغربی افق پر، یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ، کہ دوش و امروز ہے فسانہ
وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ
جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

مثنوی "پس چہ باید کرد" میں بڑی خوبصورتی سے کہتے ہیں ؂

زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ — آدمیت زار نالید از فرنگ

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق
باز روشن می شود ایام شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گزشت و آفتاب آمد پدید
یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد
زیر گردوں رسم لادینی نہاد
گرگ اندر پوستین برہ
ہر زماں اندر کمین برہ
مشکلات حضرت انساں از اوست
آدمیت راغم پنہاں از اوست
در نگاہش آدمی آب وگل است
کاروانِ زندگی بے منزل است
باخساں اندر جہانِ خیر و شر
در نسازد مستیٔ علم و ہنر
آہ از افرنگ و از آئینِ او
آہ از اندیشۂ لادینِ او

مغربی تعلیم نے مسلم نوجوانوں کا جو حال کر دیا ہے اس کا نقشہ ایک مقام پر یوں کھینچتے ہیں:

رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے
واجب ہے صحرا گرد پر تعمیلِ فرمان خضر
لیکن نگاہِ نکتہ بیں دیکھے زبوں حالی مری
رفتم کہ خار از پاکشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

اس تہذیب نے جہاں فطرت کے اسرار سربستہ کا انکشاف کیا اور جدید ایجادات و اختراعات سے انسانیت کو مالا مال کیا، وہیں الحاد و زندقہ، اباحیت و وسیع المشربی اور اخلاقی بے راہ روی بھی اس کے جلو میں آئی اور عالم انسانیت کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ دیکھئے اقبال کس طرح تبصرہ کرتے ہیں ؎

خوش تو ہم بھی ہیں جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

چنانچہ عظیم اسلامی مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اقبال کی ان خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"سب سے اہم کام جو اقبالؒ نے انجام دیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے مغربیت اور مغربی مادہ پرستی پر پوری قوت کے ساتھ ضرب لگائی۔ اگرچہ یہ کام اس وقت علمائے دین اور اہل مدارس اور خطیب حضرات بھی انجام دے رہے تھے مگر ان کی باتوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا اور کیا جا سکتا تھا کہ یہ لوگ مغربی فلسفہ اور مغربی تہذیب و تمدن سے واقفیت نہیں رکھتے۔ لوگ اُن اہل علم کی باتوں کو کچھ زیادہ وزن نہیں دیتے تھے جو اگرچہ دین سے تو واقف تھے مگر مغربی علوم، مغربی فلسفے، مغربی تہذیب اور مغربی زندگی سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ ان کے برعکس اقبال وہ شخص تھا جس کے متعلق کوئی بڑے سے بڑا جدید آدمی اُٹھ کر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس سے زیادہ مغرب کو جانتا ہے اور اس سے زیادہ مغربی فلسفے اور مغربی علوم سے واقف ہے اس لئے جب اقبال نے مغربیت مغربی مادہ پرستی، مغربی فلسفے اور مغربی افکار پر چوٹ لگائی تو مسلمانوں پر مغرب کی جو مرعوبیت طاری تھی وہ کافور ہونے لگی اور واقعہ یہ ہے کہ اس مرعوبیت کو توڑنے میں اکیلے اقبالؒ کا کارنامہ سب سے بڑھ کر ہے"[1]

وطن پرستی کے خلاف معرکہ آرائی

اس میں شبہ نہیں کہ اقبال اپنے ذہنی سفر کے آغاز میں وطنیت سے متاثر تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس دور میں ترانۂ ہندی، ہمالہ وغیرہ وطن دوستی کے جذبہ سے معمور نظمیں لکھیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۰۵ء کے وسط تک پہنچ کر یہ منزل ختم ہو گئی اور اب اس مخالف اسلام نظریہ کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

علامہ اقبال نے مسلمانوں کو اس ہلاکت خیز فتنہ اور تباہ کن قوم پرستی اور وطنیت سے ہوشیار کرتے ہوئے فرمایا:-

---

[1] تقریر پنجاب یونیورسٹی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، موضوع، "اقبال اور پاکستان"

ماخوذ: اقبال، دارالاسلام اور مودودی از اسعد گیلانی ص ۲۱، ۲۲

اپنی ملت کو قیاس اقوامِ مغرب پر نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

وطنیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

پھر آگے چل کر اس کے خلاف جہاد پر اکساتے ہوئے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہیں سہ

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ تہذیب نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اور وطنیت کی مخالفت اور اس سے بیزاری کی وجہ بھی صاف لفظوں میں بتا دی؛

"میں یوروپ کی وطنیت کا مخالف ہوں اس لئے نہیں کہ اگر اسے ہندوستان میں نشوونما پانے کا موقعہ ملے تو مسلمانوں کو مادّی فوائد کم پہنچیں گے، میری مخالفت تو اس بنا پر ہے کہ میں اس میں ملحدانہ مادہ پرستی کے بیج دیکھتا ہوں۔ جو میرے نزدیک انسانیت کے لئے ایک عظیم ترین خطرہ ہے۔ حبُّ الوطنی بالکل طبعی صفت ہے اور انسان کی اخلاقی زندگی میں اس کے لئے پوری گنجائش ہے لیکن اصل اہمیت اس کے ایمان، اس کی تہذیب اور اس کی روایات کو حاصل ہے اور

میری نظر میں یہی اقدار اس قابل ہیں کہ انسان ان کے لئے زندہ رہے اور ان ہی کے لئے مرے نہ کہ زمین کے اس ٹکڑے کے لئے جس سے اس کی رُوح کو کچھ عارضی ربط پیدا ہو گیا ہے۔[1]

مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام اپنے خط میں فرمایا:

"قدیم زمانے میں دین قومی تھا مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیوٹ ہے جس سے بدبخت یوروپ میں یہ بحث پیدا ہو گئی کہ چونکہ دین پرائیوٹ عقائد کا نام ہے لہٰذا انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف ریاست ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوعِ انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی نہ انفرادی نہ پرائیوٹ بلکہ خالص انسانی ہے اور اس کا مقصد تمام فطری امتیازات کے باوجود عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے، ایسا دستور العمل صرف معتقدات پر مبنی ہو سکتا ہے۔ یہی ایک طریق ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک اُمت کی تشکیل اور بقا کے لئے ضروری ہے۔ اس سے ہٹ کر جو راہ اختیار کی جائے گی وہ راہ لادینی کی راہ ہو گی اور شرف انسانی کے خلاف۔"

انھوں نے مزید کہا:

"اگر مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ تو لادینی ہو گا اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی مسلمانوں کی حقیقی اساس توحید اور ختم نبوت کے عقیدے پر ہے۔"[2]

اقبال کے نزدیک ایک مسلمان کو رنگ و نسل اور وطن و ملک کی جغرافیائی حدود میں پابند

---

[1] حرف اقبال ص ۶۰

[2] خط بنام مولانا حسین احمد مدنی مورخہ ۹/۳/۱۹۳۸ء، اقبال دارالاسلام اور مودودی ص ۵۸، ۵۹

نہیں کیا جا سکتا وہ زمان و مکان کی حدود سے متجاوز ہے۔ اس نے اس حقیقت کو شاعرانہ پیرائے میں یوں ادا کیا ہے ؎

اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور — اس کے سمندر کی موج دجلہ و دنیوب و نیل
اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب — عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل
ساقیٔ ارباب ذوق، فارس میدان شوق — بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل

اقبال کے نزدیک مسلمان کا کوئی محدود وطن نہیں ہے بلکہ سارا عالم اس کا ملک و وطن ہے ؎

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے — مومن کا مقام ہر کہیں ہے

جب طارق بن زیاد نے اندلس کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی کشتیوں کو جلانے کا حکم دیا تو فوج کے کچھ سرداروں کو یہ حرکت پسند نہ آئی۔ انہوں نے کہا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ ہمارا وطن یہاں سے بہت دور ہے اور آخر ہمیں واپس بھی ہونا ہے اس کے جواب میں طارق نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اب واپسی کا کیا سوال؟ ہر ملک ہمارا ہی ملک ہے اس لئے کہ یہ ساری کائنات خدا کی ہے اور ہم خدا کے ہیں۔ اقبال اپنی شاعرانہ جولانی کے ذریعہ اُمت کو یہی پیغام دیتے ہیں ؎

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت — گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطا است
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم — ترک سبب ز روئے شریعت کجا روا ست
خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت — ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

اشتراکیت سے بیزاری

آغاز میں ڈاکٹر اقبال کو روس نے بالشویک انقلاب میں ترقی کی کرن نظر آئی اور انہیں امید بندھی کہ شاید یہی انسانیت کو ظلم و جبر کے ماحول سے نکال کر آزادی و ترقی کی راہ پر گامزن کرے چنانچہ فرمایا ؎

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار

اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور

فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

پھر ابلیس کی مجلس شوریٰ میں تیسرے مشیر سے کہلوایا کہ

وہ کلیمِ بے تجلّی وہ مسیحِ بے صلیب

نیست پیغمبر ولیکن دربغل دارد کتاب

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد

توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

لیکن اقبال ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھنے والوں میں نہ تھے۔ چونکہ قرآن و سنّت کی تعلیمات آپ کے سامنے تھیں، عشق رسول سے سینہ منوّر تھا اور ایک دلِ دردمند رکھتے اور محبّتِ رسول میں وارفتہ اور دیوانہ تھے اس لئے اس نظریہ کو بھی جلد ہی گمراہ کُن قرار دے کر اس سے اپنا دامن جھٹک لیا اور مارکس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ؎

تری کتابوں میں اے حکیمِ معاش رکھا ہی کیا ہے آخر

خطوط خمدار کی نمائش، مریز کجدار کی نمائش

اور اس راز تک پہنچ گئے کہ ؎

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا

طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

جاوید نامہ میں جب زندہ رود (اسے اقبال ہی کا ایک قلمی نام سمجھنا چاہیئے۔) فلک عطارد میں جمال الدین افغانی کے سوال کے جواب میں اسے بتاتے ہیں کہ مشرق سلطانی مغرب سے تاراج ہو چکا ہے اور اشتراکیت نے دین و ملت سے تاب چھین لی ہے تو افغانی مارکس کو "پیغمبر بے جبرئیل" کے خطاب سے یاد کرتے ہیں اور اشتراکیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

زانکہ حق در باطل او مضمر است — قلب او مومن دماغش کافر است

غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را

رنگ و بو از تن نگیرد جان پاک — جز بہ تن کارے ندارد اشتراک

دین آں پیغمبر حق ناشناس — بر مساوات شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گل است

افغانی کا روسی انقلاب پر یہ تبصرہ دراصل اقبال ہی کے موقف کی تشریح ہے۔ ان کی زبان سے اقبال کی ترجمانی ان الفاظ میں ہوتی ہے ؎

روسیاں نقشِ نوی انداختند آب و ناں بردند و دیں در باختند

پھر افغانی ملت روسیہ کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اسلام کی طرف پلٹ آؤ ؎

کردۂ کارِ خداوندی تمام بگذر از لا جانب الا خرام

خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں لکھا کہ:

"سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا، جس کی تشریح میں نے اپنی تحریروں میں جا بجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے[1]"

قادیانیت کی مخالفت کی جزوی بنیاد اقبال کا یہ خوف تھا کہ:

"ہندوستان میں جدید آزاد خیالی کے زیر اثر، مذہبی مہم جوؤں کی حوصلہ افزائی سے لوگوں میں مذہب سے بے اعتنائی کا رجحان بڑھتا جائے گا اور بالآخر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستانی اقوام کی زندگی سے مذہب کا اہم عنصر یکسر خارج ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہندوستانی ذہن مذہب کا کوئی اور بدل تلاش کرلے گا اور یہ بدل منکر خدا مادیت کی اس صورت کے سوا اور کچھ نہ ہوگا

---

[1] اقبال نامہ جلد اول ص ۳۱۸، شیخ عطاء اللہ۔

جو روس میں نمودار ہوئی ہے۔[1]

اپنے ساتویں لیکچر "کیا مذہب ممکن ہے؟" میں بھی اقبال نے کھل کر لکھا ہے کہ:

"وطنیت اور منکر خدا سوشلزم دونوں ہی کے لئے کم از کم انسانی توانائی کی موجودہ صورت کے پیش نظر لازم ہے کہ وہ نفرت، بدگمانی اور غیظ و غضب کی ان نفسیاتی قوتوں کو بروئے کار لائیں جو انسانی روح کو مفلس کر دینے اور اس کی روحانی توانائی کے مخفی سوتوں کو بند کرنے کا میلان رکھتی ہیں۔ مایوسی زدہ انسانیت کے روگوں کا علاج نہ قرون وسطیٰ کے تصوف کی تکنیک کے پاس ہے اور نہ وطنیت یا منکر خدا سوشلزم کے پاس۔ یقیناً یہ لمحہ جدید ثقافت کی تاریخ میں ایک عظیم بحران کی نشاندہی کرتا ہے۔ عالم جدید کو حیاتیاتی تجدید کی ضرورت لاحق ہے اور مذہب

جو اپنے اعلیٰ مظاہر میں نہ اذعانی عقیدہ ہے نہ پیشوائیت نہ رسمی عبادت۔ وہ عامل ہے جو جدید انسان کو اخلاقی حیثیت سے اس عظیم ذمہ داری کا بار اٹھانے کے لئے تیار کر سکتا ہے جو جدید سائنس کی ترقی میں مضمر ہے اور اس کا وہی موقف ایمان و ایقان واپس لا سکتا ہے جو اسے یہاں ایک شخصیت کے حصول اور آخرت میں اس کے استحکام کے قابل بنا سکتا ہے۔"[2]

ایک خط میں جو پروفیسر آل احمد سرور کو ۱۹۳۷ء میں لکھا گیا، آپ نے اس موضوع پر اظہار رائے کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم، یا زمانہ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لئے ہر نقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے۔"[3]

قرآن پر محکم ایمان کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"معاشی مسئلہ کا حل اسلامی آئین کی تنفیذ ہے اس سے ہر ایک کا حق معیشت

---

[1] Thoughts and Reflections of Iqbal by S. A. Waheed, P.254

[2] The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam P.P. 188-89

[3] اقبال نامہ جلد سوم ص ۱۸۹، شیخ عطاء اللہ،

محفوظ ہو جاتا ہے ۔ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف ہے ۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآن نے تجویز کیا ہے[1]"

محمد علی جناح کے نام ایک خط میں جس پر ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کی تاریخ درج ہے، اقبال نے کچھ اہم تصریحات کی ہیں وہ لکھتے ہیں کہ :

"یہ غیر اغلب ہے کہ مسلمان جواہر لال کی منکر خدا سوشلزم پر لبیک کہہ سکیں لہٰذا سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کے مسئلہ کا حل کیا ہو سکتا ہے ؟ اور لیگ کا تمام مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ اس مسئلے سے نبٹنے کے لئے وہ کیا اقدام کرتی ہے ۔ اگر لیگ اس کی امید نہیں دلا سکتی تو مجھے یقین ہے کہ مسلم عوام اس سے پہلے کی طرح بے اعتنائی برتیں گے ۔ اسلامی قانون کے طویل اور بالاستیعاب مطالعے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس قانون کو کما حقہٗ سمجھ کر نافذ کیا جائے تو ہر ایک کے لئے کم از کم گزارے کا حق یقینی ہو جاتا ہے، لیکن اسلامی شرع کا نفاذ اور اس کا نشوونما اس ملک میں ایک یا ایک سے زیادہ آزاد مسلم ریاستوں کے قیام کے بغیر ناممکن ہے ۔ میرا مخلصانہ ایقان کئی برسوں سے یہی رہا ہے اور اب بھی مجھے یقین ہے کہ یہ وہ واحد طریقہ ہے جو مسلمانوں کے لئے روٹی کے مسئلے کے حل اور ہندوستان میں امن و امان کے قیام کا ضامن ہو سکتا ہے[2]"

دین و سیاست کی تفریق پر تنقید

اقبال نے جہاں سیاست بے دین کو مذموم قرار دیا اور برملا کہا کہ

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

وہیں دین بے سیاست کا نظریہ رکھنے والوں پر بھی تنقید کی اور کہا کہ اگر دین کے پاس اپنے عقیدے اور نظام کو نافذ کرنے کے لئے طاقت نہیں ہے تو طاقت جس

---

[1] روزنامہ زمیندار ۲۳ جون ۱۹۲۳ء

[2] Quaide Azam Jinnah's correspondence by Sharifuddin Peerzada, Guild Publishing House Karachi-1966. P.150

شخص یا گروہ یا نظام کے پاس ہے وہ دنیا کو اپنے راستے پر ہانک کرلے جاتے گا اور آپ کے لئے کلیم کرنے کا موقعہ باقی نہ رہے گا ؏

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

دین و سیاست کی دوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

ہوئی دین و دنیا میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی
دوئی چشمِ تہذیب کے لئے نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

ایک دوسرے مقام پر "لا دین سیاست" کے عنوان سے اپنا نقطۂ نظر یوں واضح کیا ہے ؎

جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی
خدا نے مجھ کو دیا ہے دلِ خبیر و بصیر
مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں
کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مُردہ ضمیر

تصوف یا جمودِ عمل

علامہ اقبال نے عجمی تصوف پر تنقید کی۔ صوفیانہ رموز و اشارات، حجرۂ صوفی کی پُرامن فضا، اس کے حلقہ میں چھایا ہوا جمود و اضمحلال اور اس کو تقدس کی سند عطا کرنا، ان سب پر آپ نے تیشے چلائے کیونکہ آج تصوف کے نام پر جہاد سے گریز کیا جا رہا ہے اور دعوت دین اور اقامت دین کی جد و جہد کی مخالفت کے سلسلے میں یہی حلقہ پیش پیش ہے، ساقی نامہ میں فرماتے ہیں ؎

تمدن، تصوف، شریعت، کلام | بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی | یہ اُمت روایات میں کھو گئی
وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد | محبت میں یکتا، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا | یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے | مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

یہ حکمت ملکوتی یہ علم لاہوتی | حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور | تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل | یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست | یہ مذہب مُلّا و جمادات و نباتات

تیری بیعت ہے اور تیرا زمانہ ہے اور | تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ

علامہ اقبال تصوف کے ناقد اس وجہ سے ہیں کہ اس نے مسلمانوں کی قوتوں کو مضمحل کر دیا ہے۔ اس نے انہیں زندگی سے گریز اور حقائق سے فرار سکھایا ہے اور یہ چیز مرنے والی اُمتوں کا عالمِ پیری ہوا کرتی ہے۔ یہ جمود و اضمحلال قوموں کو کچل دیتا اور انہیں فنا کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جب مسلمان شمشیر و سناں کھو بیٹھے تبھی تصوف اور ترک دُنیا کی تعلیم کو قبول عام حاصل ہوا۔ علامہ فرماتے ہیں:

"یہ حیرت کی بات نہیں کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی چاہیئے تھا۔ جس قوم میں طاقت اور توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو پھر اس اس قوم کا نقطۂ نظر بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی حسین و جمیل شے بن جاتی ہے اور ترک دُنیا موجب تسکین۔ اسی ترک دُنیا کے پردے میں قومیں اپنی سُستی اور کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کی ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔"[1]

---

[1] اقبال نامہ ص ۴۴، ۴۵

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے تصوف کے باطل نظریہ پر تنقید کی اور اسے خواب آور گولی قرار دیا۔

تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ

علامہ اقبال کی فراست مومنانہ دیکھئے۔ انہیں اس امر پر یقین تھا کہ مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر بند باندھنے کے لئے کچھ نئے ہتھیار اور جدید ذرائع و وسائل درکار ہیں۔ آپ کو احساس تھا کہ اسلام ایک انقلابی تحریک اور ہر زمان و مکان کے لئے قابل عمل نظام حیات ہے لیکن صدیوں کے جمود وانجماد نے اس کی حقیقی تصویر بگاڑ دی ہے ضرورت ہے کہ جدید انداز میں اسلام کو پیش کیا جائے اور عالم انسانیت کے دلوں اور دماغوں کو اس کی ضیا پاشی سے منور کیا جائے چنانچہ آپ کے وہ خطبات جو تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam (by Mohd. Iqbal.) کے نام سے موسوم ہیں، اسی مقصد کی تکمیل کی ایک کامیاب کوشش ہیں۔ خطبات مدراس میں اسی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے فرمایا کہ :

> "انفرادی اجتہاد کے مقابلے میں شورائی اجتہاد زیادہ بہتر ہے۔ دور جدید میں اجتماع کی یہی شکل سب سے زیادہ موزوں ہوگی۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم اپنے نظام قانون کو جمود و تعطل سے نجات دلاکر اس میں زندگی کا نیا خون دوڑا سکتے ہیں"[۱]

ایک بار فرمایا کہ :

> "اگر ہم اسلامی فکر میں کوئی صحت مند اضافہ نہیں کر سکتے تو کم سے کم صحت تنقید سے عالم اسلامی میں امنڈتے ہوئے تجدد پسندی کے سیلاب کو ضرور روک سکتے ہیں"[۲]

علامہ کی نظر میں سب سے ضروری کام رسول اکرمؐ کی سُنّت کا احیاء اور اسلامی قوانین کا نفاذ تھا اس کے لئے ان کی تدبیر یہ تھی کہ ایک مجلس قانون ساز بیٹھے اور اپنی فکری کاوشوں سے ایک جدید ریاست کی جدید ضروریات کے مطابق قانون اسلامی کو مُرتب و مدوّن کرے اور موجودہ حالات میں عدالتوں میں نفاذ کے قابل بنانے کے لئے دفعہ وار

---

۱ تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ ص ۲۷۴

۲ 〃 〃 〃 ص ۱۵۲

ترتیب دے۔ فرمایا:

"موجودہ دور میں اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی تدوین جدید ہے تاکہ زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا جائے جن کو موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی ارتقاء نے پیدا کیا ہے[۱]"

انہوں نے اپنے خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ لاہور میں یہ تجویز پیش کی کہ:

"علماء کی ایک جماعت قائم کی جائے جس میں ایسے مسلمان قانون داں بھی شامل ہوں جنہوں نے جدید علم قانون کی تعلیم حاصل کی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ جدید حالات کی روشنی میں اسلام کے قانون کی حفاظت کی جائے اس کو پھیلا دیا جائے اور بشرط ضرورت اس کی از سر نو تشریح کی جائے اس طرح سے کہ اس کے بنیادی اصولوں کی تہ میں جو روح کارفرما ہے وہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے[۲]"

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام اپنے خط میں اسلام کی علمی تنفیذ کے لئے اپنی تڑپ کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نظر سے زمانۂ حال کے اصول قانون (JURISPRUDENCE) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم وہی شخص ہوگا۔ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا[۳]"

سید سلیمان ندوی کے نام ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ:

۱۔ حیات انور ص ۱۶۰

۲۔ خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء، ماخوذ اقبال وادارالاسلام اور مودودی ص ۴۳

۳۔ اقبال نامہ ص ۵۰

"اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ حالات میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا۔ ندوہ کے دیگر ارکان اور فارغ التحصیل طلبہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیجئے تاکہ اقوام اسلامیہ کو فقہ اسلامی کی حقیقت معلوم ہو۔[۱]"

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لئے ایک تعلیمی اسکیم پیش کرتے ہوئے تدوین فقہ جدید کی ضرورت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"ہمیں دیوبند اور لکھنؤ سے ایسے ذہین اور طباع لوگ منتخب کرنے چاہئیں جو قانون کا خاص ذوق رکھتے ہوں۔ چونکہ قانون محمدی سراسر تعمیری تشکیل کا محتاج ہے، ہمیں چاہیئے کہ ہم انہیں اصول فقہ وقانون سازی کی تعلیم دیں اور شاید اقتصادیات اور اجتماعیات کی جامع تعلیم دین دینے کی بھی ضرورت پیش آئے اگر آپ چاہیں تو ان کو ایل ایل بی بنائیں اور پھر ان سے کہا جائے کہ سیاسی نظریۂ اسلامی اور اسلامی فقہ کا ارتقاء وغیرہ مضامین کے لیکچروں میں شریک ہوں بعض کو وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کی بھی اجازت دی جاتے۔ کچھ اپنے آپ کو قانونی ریسرچ کے لئے وقف کر دیں۔ اس ملک میں قانون محمدی جس طریق سے عمل میں لایا جاتا ہے وہ نہایت تاسف انگیز ہے اور بعض دشواریاں ایسی ہیں جو صرف مجلس قانون سازی کے قیام سے ہی دور ہو سکتی ہیں۔[۲]"

علامہ موصوف نے فقہ اسلامی کی تشکیل وتدوین جدید کے سلسلے میں اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ علماء کی مجلسوں [illegible] اس تجویز کو مدلل انداز میں رکھا۔ جدید حلقوں میں بھی اس تجویز کو [illegible] انے کی کوشش کی اور انفرادی طور سے بھی مختلف افراد کو اپنے پاس آنے اور اس عظیم کام میں تعاون کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ ڈاکٹر سید عبداللطیف کہتے ہیں کہ علامہ [illegible] نے مجھ سے خواہش ظاہر کی [illegible] میں ایک معتدبہ مدت [illegible] کے [illegible] لاہور

۱۔ مکتوب بنام سید سلیمان ندوی، اقبال نامہ جلد اول، ص ۱۴۴

۲۔ اسکیم برائے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، اقبال نامہ جلد دوم ص ۲۲۰

میں سکونت اختیار کر دوں تاکہ ایک طرف اسلامیہ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ان کی کچھ خدمت کر سکوں اور دوسری طرف ان کے ایک منصوبہ میں ان کی مدد کر سکوں — وہ منصوبہ یہ تھا کہ:

"انہوں نے اسلامی اصول فقہ کی تجدید کے مسئلہ پر اپنی فکر کے نتائج کو نوٹس کی شکل میں قلم بند کیا تھا۔ یہ نوٹس انگریزی میں تھے لیکن وہ محسوس کر رہے تھے کہ اپنی گرتی ہوئی صحت کے زمانے میں ان نوٹس کی ترتیب و تہذیب اور انہیں قطعی شکل دینا اور شائع کرنا ان کے لئے دقت سے خالی نہ تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤں"[1]

خالص اسلام کا مبلغ

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال خالص اسلام کے مبلّغ اور اسلامی نظام کی اقامت کے علمبردار تھے۔ انہوں نے جاہلی افکار پر زبردست تنقید کی اور دلیل و برہان سے ان کا باطل ہونا ثابت کیا اور ذہنی و فکری میدان میں اسلام کی حقانیت ثابت کی۔ توحید کی تعلیمات کو نکھارا، نبوت کے مقام کی اہمیت واضح کی اور ملت میں کتاب و سنت کے حتمی مقام کا تعین اور تشریح کی خود اپنے بارے میں فرمایا:

"میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلام اور شریعت، اس کی سیاست مُدن، اس کی ثقافت، اس کی تاریخ اور اس کی ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس رُوح اسلامی کے ساتھ مستقل وابستگی نے مجھے ایک ایسی فراست عطا کر دی ہے جس کی روشنی میں میں اس عظیم الشان اہمیت کا اندازہ کر سکتا ہوں جو اسلام کو ایک عالم گیر حقیقت ثابتہ کی حیثیت سے حاصل ہے"

اسلام کو ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے کہا:

"اسلام وحدت انسانی کو رُوح اور مادے کے دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، رُوح اور مادے، مذہب اور

---

[1] اوراق گم گشتہ ص ۲۰۱

سیاست میں ناخن اور گوشت کا سا باہمی تعلق ہے۔[1]

دین اور سیاست کے باہمی رشتے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

" اصول توحید کو نوع انسانی کی ذہنی اور جذباتی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا واحد عملی طریقہ اسلام بحیثیت ایک سیاسی نظام ہے۔ یہ خدا کی وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے نہ کہ تخت و تاج کی وفاداری کا اور چونکہ خدا زندگی کی حتمی روحانی بنیاد ہے اس لئے خدا سے اس کی وفاداری درحقیقت خود انسان کی مثالی فطرت سے وفاداری کے مترادف ہے"[2]

مسلمانوں کی ترقی اسلام سے وابستہ ہے اس پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ

"مسلمانوں کی تاریخ کے نازک لمحات میں یہ اسلام ہی تھا جس نے مسلمانوں کو بچایا ہے نہ کہ اس کے برعکس۔ آج اگر آپ اپنی نگاہیں اسلام پر مرتکز کر دیں اور اس میں جو دائمی قوت آفریں تخیل مضمر ہے اس سے تحریک حاصل کریں تو آپ اپنی پراگندہ قوتوں کی شیرازہ بندی کر لیں گے۔ اپنے کھوئے ہوئے عروج کو دوبارہ حاصل کر سکیں گے اور اپنے آپ کو مکمل بربادی سے بچا لے جائیں گے"[3]

علامہ مرحوم کے نزدیک مسلمان کا کردار ہی اس کی حقیقی قوت ہے اور یہ چیز توحید پر ایمان اور عمل صالح سے پیدا ہوتی ہے۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے فقط اک مسئلہ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

سلطان قطب الدین ایبک کی تعمیر کردہ مسجد قوت الاسلام کو اقبال دیکھتے ہیں تو اس

---

[1] خطبات اقبال، ص ۹۹

[2] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۴۰

[3] اقبال، دار الاسلام اور مودودی ص ۹۶

کھنڈر اور ویرانہ میں بھی انہیں عزم و اخلاص کی جھلکیاں نظر آ جاتی ہیں اور اپنی شاعری کے ذریعہ مسلمانوں کو جھنجھوڑ دیتے ہیں ؎

ہے میرے سینۂ بے نور میں اب کیا باقی — لاالٰہ مردہ و افسردہ و بے ذوق نمود
چشم فطرت بھی نہ پہچان سکے گی مجھ کو — کہ ایازی سے دگرگوں ہے مقام محمود
کیوں مسلماں نہ خجل ہو تیری سنگینی سے — کہ غلامی سے ہوا مثل زجاج اسکا وجود
ہے تری شان کی شایاں اسی مومن کی نماز — جس کی تکبیر میں ہو معرکۂ بود و نبود
اب کہاں میرے نفس میں وہ حرارت وہ گداز — بے تب و تاب دروں میری صلوٰۃ اور درود
ہے مری بانگ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ — کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلماں کا سجود

اپنی فارسی غزل میں مومن سے خطاب کر کے کہتے ہیں کہ تم پر مجھے کمال حیرت ہے کہ آفاق تو تم سے روشن ہیں لیکن تمہاری ذات درمیان سے غائب ہے۔ تم کب تک غفلت و گمنامی کی زندگی گزارتے رہو گے؟ تمہارا وجود ماضی کی تاریک رات کے لئے منارۂ نور تھا آج تم گھروندوں میں گھوم رہے ہو لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ تم انہیں پھلانگ بھی سکتے ہو۔ اے مردِ جاوداں! تو موت سے ڈرتا ہے حالانکہ موت کو تجھ سے ڈرنا چاہیئے۔ موت نہیں بلکہ تو اس کی گھات میں ہے۔ تجھے جاننا چاہیئے کہ آدمی کی موت رُوح کی جُدائی سے نہیں بلکہ ایمان کی کمی اور یقین سے محرومی سے ہوتی ہے:

بینی جہاں را خود نہ بینی — تا چند ناداں غافل نشینی
نور قدیمی شب را برافروز — دست کلیمی در آستینی
بیروں قدم نہ از دور آفاق — تو پیش از بینی تو پیش از بینی
از مرگ ترسی اے زندہ جاوید — مرگ است صیدے تو در کمینی
جانے کہ بخشند دیگر نگیرند — آدم بمیرد از بے یقینی
صورت گری را از من بیاموز — شاید کہ خود را باز آفرینی

اپنی ایک اُردو غزل میں جو رقت و حلاوت میں اپنی مثال آپ ہے، مردِ مومن کو یوں آواز دیتے ہیں ؎

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی — کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے — جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

مرے حلقۂ سخن میں ابھی زیر تربیت ہیں ۔۔۔ وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسمِ کج کلاہی
تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری ۔۔۔ نہیں مصلحت سے خالی یہ جہان مرغ و ماہی
تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لاَ اِلٰہَ اِلاَّ ۔۔۔ لغت غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

ایک دوسری نظم میں مرد مسلماں کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کائنات کے تمام مناظر و مظاہر، تمام اجرام فلکی اور اجسام ارضی فنا پذیر ہیں لیکن تو ان کے درمیان جاوداں ہے۔ تمہارے ارد گرد کی ہر شے تمہاری تابع اور ماتحت ہے۔ تم یا تو دنیا کو ٹھکرا دو یا اسے اپنے آگے جھکا دو، درمیان کی کوئی راہ نہیں ہے ؎

ہر شے مسافر ہر چیز راہی ۔۔۔ کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی
تو مرد میداں تو میر لشکر ۔۔۔ نوری حضوری تیرے سپاہی
کچھ قدر تو نے اپنی نہ جانی ۔۔۔ یہ بے سوادی یہ کم نگاہی
دنیائے دوں کی کب تک غلامی ۔۔۔ یا راہبی کر یا پادشاہی

عالمِ اسلام پر اقبال کے اثرات

یہ حقیقت ہے کہ بیسویں صدی میں اسلام کے احیاء کے لئے ڈاکٹر اقبال کی کاوشیں ناقابل فراموش اور اپنے پیش روؤں کے مقابلہ میں سب پر بھاری ہیں۔ بیسویں صدی کی تمام اسلامی تحریکات نے یہاں سے غذا حاصل کیا ہے چاہے وہ ہند و پاک کی جماعت اسلامی ہو یا افغانستان کا خالص اسلامی جہاد ہو یا ایران کا اسلامی انقلاب ہر جگہ ہمیں علامہ اقبال کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔

ایران میں مرحوم سعید نفیسی، مرحوم مجتبیٰ مینوی، علی اصغر حکمت، محیط طباطبائی، سید حسین نقی زادہ، سید ضیاء الدین طباطبائی، علی اکبر دہ خدا، ادیب السلطنت سمیعی، ڈاکٹر لطف علی صورت گر، ڈاکٹر محمد معین اور محمد حجازی، ذبیح اللہ صفا، ڈاکٹر حسین خطیبی، حبیب یغمائی جعفر محجوب، اور ڈاکٹر یوسفی وغیرہ وہ نامور ادباء ہیں، جنہوں نے نسلی تعصب کو بالائے طاق رکھ کر کلام اقبال کا مطالعہ کیا اور اپنے اپنے مطالعے کا نچوڑ نثر پاروں کی شکل میں پیش کیا ہے۔

ان تمام حضرات کی کاوشوں سے ایران میں اقبال شناسی عام ہوئی اور اقبال ایرانیوں میں غیر معروف نہ رہے۔ البتہ ان حضرات نے اقبال کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس میں اقبال کی شاعری اور ان کے فن کا تعارف یا تجزیہ تھا اور ان کی ہمہ جہتی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش

نہیں کی گئی تھی اس کا آغاز مرحوم ڈاکٹر علی شریعتی نے کیا جن کو ایران کے اسلامی انقلاب کا فکری رہنما کہنا بیجا نہ ہوگا۔ ایران کے اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لئے ڈاکٹر علی شریعتی نے فکر اقبال کو اپنا راہبر و رہنما بنایا ہے اور فکر اقبال ہی کی روشنی میں وہ حیات و کائنات، نظام حکومت، فرد و معاشرہ کا ربط باہمی، انسانی حریت و آزادی استعمار کی مخالفت اور اسلام فہمی کی تشریح و تعبیر اور توضیح کرنے میں زندگی بھر مصروف رہے۔ مذہبی طور پر ایران کے اسلامی انقلاب کی رہنمائی امام خمینی نے کی ہے مگر فکری اور دانشورانہ سطح پر اس انقلاب کے رہنما و رہبر ڈاکٹر علی شریعتی رہے ہیں[1]

علی شریعتی کے نزدیک اقبال کی شخصیت امام غزالی، محی الدین ابن عربی اور مولانا روم سے مختلف ہے۔ وہ ابو مسلم خراسانی، حسن صباح اور صلاح الدین ایوبی سے بھی جدا ہیں۔ تیسری طرف سرسید اور ان جیسے دیگر مصلحین سے بھی وہ ممتاز ہیں۔ ان کے نزدیک "اقبال کی وہ شخصیت ہے جو نہ تو اہل مغرب کے اس خیال کی مؤید ہے کہ علم ہی انسانیت کی نجات، ارتقاء اور تمام دکھ درد کا مداوا ہے اور نہ ہی ان فلسفیوں کے ہم خیال ہیں جو انسان کی معاش اور معاشی ضرورتوں کو اس کی تمام ضرورتوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی اپنے ہم وطنوں یعنی بدھوں اور ہندوؤں کے بڑے بڑے مفکروں کی طرح اس بات کے قائل ہیں کہ انسانی روح کا اس سنسارک جیون اور کرم کے اس چکر سے نکل کر نروان حاصل کر لینا ہی بشریت کی معراج ہے وہ اپنے ہم وطنوں کے اس خیال کے بھی قائل نہیں کہ ایک ایسے ماحول میں جہاں بھوک، غلامی، ذلت و پستی موجود ہے، وہاں پاک و منزہ روحیں سعادت مند اور تربیت شدہ انسان اور پاکیزہ اخلاقیات کو جنم دیا جا سکتا ہے"[2]

چنانچہ آج ایران میں اقبال کو اسلامی انقلاب کا بانی سمجھا جاتا ہے اور آج کل ان کا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے ؎

می رسد مردی کہ زنجیر غلاماں بشکند
دیدہ ام از روزنِ دیوار زندانِ شما

افغانستان کو علامہ اقبال ابتداء ہی سے اہمیت دے رہے تھے وہ سمجھتے تھے کہ

---

[1] اسلام اور عصر جدید جلد ۱۴ شمارہ ۲، عصر حاضر کے ایران میں اقبال کی معنویت، کبیر احمد جائسی

[2] علامہ اقبال، مصلح قرن آخر، ترجمہ کبیر احمد جائسی ص: ۴

مغربی سامراج کو اس کی بے پناہ مادی قوت کے پیش نظر اگر شکست دی جا سکتی ہے تو ایک کوہستانی علاقے ہی میں اور ان جفاکش لوگوں کے ذریعہ ہی جن کی پرورش ایک آزاد فضا میں محنت و مشقت اور غیرت و خودداری کے ساتھ ہوتی ہے چنانچہ انہوں نے شاہین کو جو ایک مثالی جوانمرد کی علامت بنایا وہ افغانستان اور سرحد کے علاقے ہی کا ایک مشہور و معروف پرندہ ہے۔

"ارمغان حجاز" میں "بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو" ایک نہایت ولولہ انگیز نظم ہے جس میں افغانیوں کو ابھارا گیا ہے:

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا ۔۔۔ اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفت سیل رواں چل ۔۔۔ وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں ۔۔۔ پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا
حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر ۔۔۔ کہتے ہیں کہ شیشہ کو بنا سکتے ہیں خارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ۔۔۔ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
محروم رہا دولت دریا سے وہ غواص ۔۔۔ کرتا نہیں جو صحبت ساحل سے کنارا
دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت ۔۔۔ ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا
دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش ۔۔۔ تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردی مومن پہ بھروسہ ۔۔۔ ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

آج افغانستان کے غیور رجیالوں نے دنیا کی ایک بڑی طاقت کو چیلنج کیا ہے اور اسے ناکوں چنے چبوا رہے ہیں اس خالص اسلامی جہاد میں اقبال کے اثرات فکر صاف محسوس کئے جا سکتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی

ڈاکٹر اقبال جس مرد مومن کی تلاش میں تھے اور جس امام برحق کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار ہو اور جو مندرجہ ذیل صفات کا حامل ہو ـــ

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے — حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق — جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست — زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے — فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

وہ انہیں برسوں کی جستجو کے بعد سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی شکل میں نظر آ گیا۔ اورنگ آباد کا یہ نوجوان اسلام پر غیر متزلزل یقین کے ساتھ میدانِ عمل میں آتا ہے اور اپنے عزم و ثبات کے بل بوتے پر حالات کا رُخ موڑ دیتا ہے، اس نے دیکھا کہ تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد مسلمان مایوس اور شکستہ خاطر ہو چکے ہیں اور شدھی کی تحریک انہیں ہڑپ کرتی جا رہی ہے۔ جب کہ مسلمان ایک مشنری قوم کا نام ہے۔ یہ قوم دنیا میں ایک مشن رکھتی ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ نہ صرف خود مسلمان ہو بلکہ اپنے قول سے، اپنے عمل سے، اپنے کردار سے غرض اپنی ہر چیز سے اسلام کی تبلیغ کرے۔ جب تک مسلمانوں میں ایک مشنری قوم ہونے کی حیثیت اور کیفیت برقرار رہی انہوں نے تلوار کے بغیر محض اپنی تبلیغ سے ملک کے ملک فتح کر ڈالے۔ یہی ذوق تبلیغ اسلام کی قوت کا اصلی سرچشمہ تھا[1] چنانچہ اس نے مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید صاحب

---

[1] مولانا مودودی کے یہ مضامین "اسلام کا سرچشمۂ قوت" کے نام سے مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے چھپ چکے ہیں۔

کی نگرانی میں اخبار "مسلم" کی ادارت شروع کی۔ پھر جب ۱۹۲۵ء میں "الجمعیۃ" کی ابتداء ہوئی تو اس کے ذریعہ اپنے خیالات سے مسلمانوں کو دعوتِ فکر و نظر دیتا رہا۔ پھر ۱۹۳۲ء میں اس نے ترجمان القرآن کے نام سے ایک رسالہ خود جاری کیا۔

۱۹۲۶ء میں سوامی شردھانند کو ایک غیرت مند مسلمان نے قتل کر دیا اور پورے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف حملوں کا ایک زبردست سلسلہ شروع ہو گیا۔ غیر مسلم مسلمانوں کے فریضۂ جہاد پر پھبتیاں کسنے لگے یہاں تک کہ گاندھی جی جیسے شخص نے یہ کہہ دیا کہ:

"اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے جس کی فیصلہ کُن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔"

اس صورت حال سے سراسیمہ ہو کر مولانا محمد علی جوہر نے جامع مسجد میں خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ کاش کوئی مسلمان عالم مسئلہ جہاد کی حقیقت کی پوری طرح وضاحت کرے تاکہ اسلام کے خلاف جو غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں وہ دُور ہو سکیں۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر کی اس پکار پر سید ابوالاعلیٰ مودودی۔۔ نے لبیک کہا اور "الجہاد فی الاسلام" جیسی معرکۃ الآراء کتاب لکھی۔

اس کتاب کی تصنیف کے درمیان مولانا پر یہ بات کھلی کہ اسلام اس دنیا میں کفر کی حکومت کے سایہ تلے زندگی گزارنے نہیں آیا بلکہ وہ خود حکمرانی کے لئے آیا ہے۔ اور اس کا مقصد فتنہ و فساد کا استیصال ہے۔" اسلام نے بدی کے استیصال اور بدکاری کے دفع و انسداد کے لئے یہ کارگر تدبیر بتلائی کہ منظم جدوجہد (جہاد) سے اور اگر ضرورت پڑے اور ممکن ہو تو جنگ (قتال) کے ذریعہ سے ایسی تمام حکومتوں کو مٹا دیا جائے اور ان کی جگہ وہ عادلانہ و منصفانہ نظام حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد خدا کے خوف پر اور خدا کے مقرر کئے ہوئے مستقل ضابطوں پر رکھی جائے جو شخصی یا قومی یا طبقاتی اغراض کے بجائے خالص انسانیت کے مفاد کی خدمت کرے جس کے قیام کا مقصد نیکی کو پروان چڑھانا اور بدی کو مٹانا ہو اور جس کے کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین سمجھتے ہوں اور بڑائی کے لئے نہیں بلکہ انسانیت کی بہتری اور خدا کی خوشنودی کے لئے عنان حکومت

ہاتھ میں لیں[1]

مولانا کو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی طرح اسلامی حکومت بھی ایک تبلیغی حکومت ہوتی ہے جو اپنے طرزِ عمل، حکمت عملی، عدل و انصاف اور مساوات کے ذریعہ اسلامی نظام حیات کی زندہ تصویر پیش کرتی ہے۔ چنانچہ مولانا نے لکھا کہ جب زمین کا مالک اور انسانوں کا بادشاہ صرف اللہ تعالیٰ ہے تو اسی کی اطاعت اور بندگی ہونی چاہیئے اور اسی کی شریعت پر انسانی زندگی کے سارے معاملات چلنے چاہئیں[2]۔

"یہ اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا عقیدہ جو اسلام پیش کرتا ہے یہ بھی اسی غرض کے لئے ہے کہ زمین میں صرف اللہ کا حکم چلے، عدالت میں فیصلہ صرف اسی کی شریعت پر ہو، پولیس اسی کے احکام جاری کرے، لین دین اسی کے ضابطے کی پیروی میں ہو، ٹیکس اسی کی مرضی سے لگائے جائیں اور انہی مصارف میں صرف ہوں جو اس نے مقرر کئے ہیں، سول سروس اور فوج اسی کے زیر حکم ہو، لوگوں کی قوتیں اور قابلیتیں، محنتیں اور کوششیں اسی کی راہ میں صرف ہوں، تقویٰ اور خوف اسی سے کیا جائے، رعیت اسی کی مطیع ہو اور فی الجملہ انسان اس کے سوا کسی کے بندے بن کر نہ رہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ غرض پوری نہیں ہو سکتی جب تک کہ اقتدار اسلام کے ہاتھ میں نہ ہو۔ کسی دوسرے دین کے ساتھ یہ دین شرکت نہیں قبول کر سکتا ہے اور کونسا دین ہے جو کسی دین کی شرکت قبول کرتا ہو۔ ہر دین کی طرح یہ دین بھی یہی کہتا ہے کہ اقتدار خالصًا اور مخلصًا میرا ہونا چاہیئے اور ہر دوسرا دین میرے مقابلے میں مغلوب ہونا چاہیئے، ورنہ میری پیروی نہیں ہو سکتی۔ میں ہوں گا تو دین جمہوری نہ ہوگا۔ دین بادشاہی نہ ہوگا۔ دین اشتراکی نہ ہوگا۔ کوئی بھی دوسرا دین نہ ہوگا اور کوئی دوسرا دین ہوگا تو میں نہ ہوں گا اور اس صورت میں مجھے حق مان لینے کا کوئی نتیجہ نہیں ہے[3]۔"

مولانا نے اس کتاب میں بقرہ آیت ۱۴۳، اور حج آیت ۸، کی تشریح میں لکھا کہ مسلمان ایک

---

[1] الجہاد فی الاسلام ص ۱۱۷، ۱۱۸، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، نومبر ۱۹۷۹ء

[2] تاریخ جماعت اسلامی، ص ۱۱۹، اسعد گیلانی (پاکستان)

[3] خطبات، ص ۳۶۱، ۳۶۲،

بہترین گروہ ہیں جسے افراط وتفریط سے ہٹا کر عدل وتوسط کی راہ پر قائم کیا گیا ہے۔ اسے اللہ نے خاص اس کام کے لئے منتخب فرمایا ہے کہ اپنے قول اور عمل سے حق کی شہادت دے اور دنیا میں صداقت کی گواہ بن کر رہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ "تمہارے اس دین میں کوئی تنگی نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ اتنا وسیع رکھا گیا ہے کہ نسل، رنگ، زبان، قومیت اور وطنیت کی قیود اس کی برکتوں کو عام ہونے سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ اس میں کوئی چھوت چھات یا ورن آشرم کی قید نہیں ہے نہ اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں یا اسماعیل کے بھٹکے ہوئے اونٹوں کی کوئی تخصیص ہے۔ ہر وہ انسان جو اصول اسلام کو قبول کرے، خواہ کسی نسل اور کسی قوم کا ہو اور کسی ملک کا باشندہ ہو تمہارے اس دین میں برابری کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے اور اس طرح وہ خدمت جو تمہارے سپرد کی گئی اس کا دائرہ بھی کسی ایک ملک یا قوم تک محدود نہیں ہے بلکہ تمہیں ساری انسانیت کے لئے گواہ حق بن کر رہنا ہے"[۱]

تطہیر افکار

مولانا مودودی نے ترجمان القرآن کے ذریعہ ان تمام گمراہیوں اور بے راہ رویوں پر سخت تنقید کی جو مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں پیدا ہو گئی تھیں اور انہیں اسلام سے قریب لانے کی سخت کوشش کی۔ چنانچہ قرآن کے مطالعہ کے بعد توحید کا قرآنی تصور آپ کے فکر وخیال پر چھا گیا، تفریق دین ودنیا کا نظریہ آپ کی نگاہ میں باطل ٹھہرا ایک خدا، ایک انسان، ایک نظام کا فلسفہ مقصد زندگی بن گیا۔ چنانچہ توحید کے اس جامع تصور کی زبردست اشاعت کی اور اقتدار وقوت سے بے پرواہ ہو کر لکھا کہ:

> "توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں۔ اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام، جو انسان کی خود مختاری یا غیر اللہ کی حاکمیت و الوہیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپ کے مؤذنوں کو اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لئے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں، نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنیٰ اور کوئی مقصد

---

[۱] الجہاد فی الاسلام، ص ۹۱

نظر آتا ہے، لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ ——— میرا کوئی بادشاہ اور فرماں روا نہیں ہے، کوئی حکومت ہی تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون ہی کو نہیں مانتا کسی عدالت کے حدود اختیار مجھ تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لئے حکم نہیں ہے کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں، کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی اور سب سے منحرف ہوں۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس "صدا" کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں دُنیا خود بخود آپ سے لڑنے آ جائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لئے سانپ بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔ یہی صورت اس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا اور سُننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے اس لئے جس پر جس پہلو سے بھی پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس کو دبانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کو اپنی برہمنیت اور پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق (RACIAL SUPERIORITY) کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا، غرض ہر بُت کے پرستار کو اپنے بُت کے ٹوٹنے کا خطرہ اس ایک آواز میں محسوس ہوا اس لئے اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ، وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اس نئی تحریک سے لڑنے کے لئے ایک ہو گئے۔[1]

مسلمانوں کو ان کا فریضۂ منصبی یاد دلاتے ہوئے فرمایا کہ ان کا کام محض اپنی نجات کی فکر کرنا اور دُنیا کو شیطانوں کے حوالہ کر کے کسی گوشہ میں بیٹھ جانا نہیں ہے بلکہ جہاں ان کا فریضہ

---

[1] اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۱۱۴۵

یہ ہے کہ وہ خود مسلمان بنیں اور اپنے کو اللہ کی عبادت و اطاعت میں دے دیں، اپنی زندگی سے منافقت اور تناقض کو خارج کر دیں اور اسلام کے رنگ میں رنگ جائیں وہیں ان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ کفر و طاغوت کے نظام کو بدل ڈالنے کی جدوجہد کریں تاکہ امامت و رہنمائی مومنینِ صالحین کے ہاتھوں میں آئے۔ چنانچہ شریعت کی حقیقت واضح کرتے ہوئے فرمایا:

”یہ شریعت بزدلوں اور نامردوں کے لئے نہیں اتری ہے۔ نفس کے بندوں اور دُنیا کے غلاموں کے لئے نہیں اتری ہے، ہوا کے رُخ پر اڑنے والوں خس و خاشاک اور پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشرات الارض اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے بے رنگوں کے لئے نہیں اتری ہے یہ ان بہادر شیروں کے لئے اُتری ہے جو ہوا کا رخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہوں، جو دریا کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمت رکھتے ہوں، جو صبغۃ اللہ کو دنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں اور اسی رنگ میں تمام دنیا کو رنگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لئے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستہ پر رواں کر دے جو اس کے ایمان و اعتقاد میں راہ راست ہے، صراطِ مستقیم ہے۔ اگر دریا نے رخ اس راستہ سے پھیر دیا ہے تو اسلام کے دعوےٰ میں وہ شخص جھوٹا ہے جو اس بدلے ہوئے رخ پر بہنے کے لئے راضی ہو جائے۔ حقیقت میں جو سچا مسلمان ہے وہ اس غلط رو دریا کی رفتار سے لڑے گا۔ اس کا رُخ پھیرنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کر دے گا۔ کامیابی و ناکامی کی اس کو قطعاً پرواہ نہ ہوگی وہ ہر اُس نقصان کو گوارا کرے گا جو اس لڑائی میں پہنچے یا پہنچ سکتا ہو حتیٰ کہ اگر دریا کی روانی سے لڑتے لڑتے اس کے بازو ٹوٹ جائیں، اس کے جوڑ بند ڈھیلے ہو جائیں اور پانی کی موجیں اسے نیم جان کر کے کسی کنارے پر پھینک دیں تب بھی اس کی رُوح ہرگز شکست نہ کھائے گی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے دل میں اپنی اس ظاہری نامرادی پر افسوس یا دریا کے رو پر بہنے والے کافروں یا منافقوں کی کامرانیوں پر رشک کا جذبہ راہ

نہ پلٹے گا۔[۱]

"اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" میں مولانا نے اسلام کا نصب العین اس کے اساسی افکار و عقائد، اسلامی تہذیب کے عناصر ترکیبی اور زندگی بعد موت پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور تہذیب مغرب کا کھوکھلا پن ثابت کر کے اسلامی تہذیب کی فوقیت ثابت کی یہ مضامین کی شکل میں ۱۹۳۲-۳۳ء میں ترجمان القرآن میں شائع ہوئے۔

مولانا نے محسوس کیا کہ مسلمان مغرب کی مرعوبیت اور اس کی نقالی میں اتنا آگے بڑھتے جا رہے ہیں کہ قومی شعائر اب ان کی نگاہ میں بے وقعت ہو چکے ہیں، یورپی لباس کو اختیار کرتے جا رہے ہیں، عربی رسم الخط کو ترک کر کے رومن طرز تحریر کو اپنا لیا ہے اور اب ہمارے ملک کے رہنماؤں نے بھی اس کی وکالت شروع کر دی ہے چنانچہ مولانا نے اس ذہنیت کے دوررس اور نقصان دہ اثرات و نتائج پر غور کیا اور یہ محسوس کیا کہ یہ معمولی تبدیلیاں بھی مسلمانوں کو ان کے تہذیبی سرمایہ سے بہت دور پھینک دیں گی۔ چنانچہ لباس کے مسئلہ پر ایک مدلل مضمون لکھا جو ۱۹۲۹ء میں "معارف" نامی رسالے میں شائع ہوا۔

تقریباً اسی دور میں مولانا نے اپنی مشہور کتاب "پردہ" تصنیف کی جس میں مغربی طرز فکر اور اس کی بے قید زندگی پر سخت تنقید کی اور واضح کیا کہ اسلامی شریعت کی بقا کے لئے پردہ کے احکام جو شریعت نے دیئے ہیں از حد ضروری ہیں۔ اگر اسے ختم کر دیا گیا تو اسلامی سماج اسلامی سماج نہ رہے گا بلکہ اگر مغربی تہذیب سے متاثر افراد بھی اس کی حقیقت و فوائد سے واقف ہو جائیں تو اسے قبول کئے بغیر ان کے لئے کوئی چارہ نہ ہو گا کیونکہ اسلام سے زیادہ معتدل اور صحیح نظام تمدن نہ دنیا میں موجود ہے اور نہ کبھی ہو گا۔

مولانا نے تعلیم کے مسئلہ پر بھی قلم اٹھایا اور بتایا کہ مغربی نظامِ تعلیم میں بنیادی نقائص موجود ہیں اور وہی ہم نے آنکھ بند کر کے اپنی درس گاہوں میں جاری و ساری کر دیا ہے جس کی وجہ سے اس نظام تعلیم سے مطلوبہ فوائد حاصل نہیں ہو پا رہے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو انہوں نے یہ پیغام دیا کہ اب مسلمان طلبہ کو اندھی تقلید سے باز آنا چاہیئے اور انتظامیہ کو دعوت دی کہ تعلیم کی کوئی ایسی محکم پالیسی بنائیں جس سے ہمارے طلبہ اسلام کے

۱۔ تنقیحات از سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

نقیب اور داعی بن کر اُٹھیں مولانا نے کھل کر لکھا کہ جدید تعلیم و تہذیب کا مزاج اسلام سے میل نہیں کھاتا کیونکہ

"آپ ان کو وہ فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو بغیر خدا کے حل کرنا چاہتا ہے۔ آپ ان کو وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے، آپ ان کو تاریخ، سیاسیات، معاشیات، قانون اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو اپنے اُصول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصول عمران سے یکسر مختلف ہیں۔ آپ ان کی تربیت تمام تر ایسی تہذیب کے زیر اثر کرتے ہیں جو اپنی روح اور مقاصد اور اپنے مناہج کے اعتبار سے کلیتہً اسلامی تہذیب کی ضد واقع ہوئی ہے اس کے بعد کس بنا پر آپ یہ اُمید رکھتے ہیں کہ ان کی نظر اسلامی نظر ہوگی، ان کی سیرت اسلامی سیرت ہوگی، ان کی زندگی اسلامی زندگی ہوگی؟"

"اگر فی الواقع علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو مسلم یونیورسٹی بنانا ہے تو سب سے پہلے مغربی علوم و فنون کی تعلیم پر نظر ثانی کیجئے۔ ان علوم کو جوں کا توں لے لینا درست نہیں ہے۔ طالب علموں کی لوحِ سادہ پر ان کا نقش اس طرح مرتسم ہوتا ہے کہ وہ ہر مغربی چیز پر ایمان لاتے چلے جاتے ہیں۔ تنقید کی صلاحیت ان میں پیدا ہی نہیں ہوتی اور اگر پیدا ہوتی بھی ہے تو فی ہزار ایک طالب علم میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد سالہا سال کے گہرے مطالعہ سے، جبکہ وہ زندگی کے آخری مراحل میں پہنچ جاتا ہے اور کسی عملی کام کے قابل نہیں رہ جاتا، اس طرز تعلیم کو بدلنا چاہیئے تمام مغربی علوم کو طلبہ کے سامنے تنقید کے ساتھ پیش کیجئے اور یہ تنقید خالص اسلامی نظر سے ہو تاکہ ہر ہر قدم پر اس کے ناقص اجزاء کو چھوڑتے جائیں اور صرف کارآمد حصوں کو لیتے جائیں[1]"

پھر مولانا نے مسلم یونیورسٹی کورٹ کے سامنے مطلوبہ مقصد کے حصول کے لئے نصاب تعلیم کا ایک خاکہ پیش کیا جسے افسوس ہے نظر انداز کر دیا گیا۔ مولانا کے یہ مضامین رسالہ

---

[1] تعلیمات ص ۱۹، ۲۰، مکتبہ جماعت اسلامی رامپور ایڈیشن سوم ۱۹۵۷ء

"تعلیمات" میں یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

باطل نظریات سے کشمکش

مولانا تعمیر و تطہیر افکار کی مہم میں مصروف تھے کہ یکایک ۱۹۳۷ء میں یہ خطرہ سامنے آیا کہ ہندوستانی مسلمان کہیں اس وطنی قومیت کی تحریک کے شکار نہ ہو جائیں جو آندھی اور طوفان کی طرح ملک پر چھائی چلی جا رہی تھی۔ ہوا یہ کہ ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک نے رابطۂ عوام (MASS CONTACT[1]) کی مہم چلائی اور اپنی وار دھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کے ذریعہ مسلمانوں کو ہندوستانی قومی دھارے میں ضم کر لینے کی منظم کوشش شروع کر دی۔ غضب یہ ہوا کہ ان اسکیموں کو چلانے کے لیے اکثریت کو مسلمان قوم پرست لیڈروں اور مذہبی رہنماؤں کی ایک ٹیم مل گئی جس نے انگریز دشمنی کے اندھے جوش میں اس چیز کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیں کہ اس تحریک کا فروغ اسلام کے مستقبل پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔

سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی تقریر مدراس میں فرمایا:

"اس وقت تین ہی صورتیں ہیں یا تو مسلمان اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہیں اور جب آزادی کی جنگ ختم ہو جائے تو اپنے دروازے کھول کر باہر نکلیں اور گلیوں میں آزادی کی بھیک مانگتے پھریں یا یہ کہ اپنا کیمپ الگ لگائیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ آزادی کی فوج اپنی قوتِ بازو سے کب میدان جیتتی ہے اور مالِ غنیمت پر قبضہ کرتی ہے اس وقت وہ آگے بڑھیں اور فاتح فوج سے مالِ غنیمت میں جھگڑا کریں یا یہ کہ وہ آزادی کی فوج میں شامل ہو کر آزادی کے دوش بدوش کھڑے ہو کر جنگ کریں اور اپنے لئے اپنی عظیم الشان قومیت کی پوزیشن کے مطابق اپنی کوششوں سے اپنی جگہ حاصل کریں۔"[2]

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کے اقتباسات آپ پیچھے ملاحظہ فرما چکے

---

[1] مولانا مودودی نے اس کا ترجمہ "اجتماعی ماہی گیری" سے اور INDIVIDUAL CONTACT کا ترجمہ "انفرادی صید افگنی" سے کیا ہے۔ [2] اخبار "انصاری" مورخہ ۴ رمضان ۱۳۵۶ھ بحوالہ تحریک آزادی ہند اور مسلمان ص ۱۷۲

ہیں، بدقسمتی سے مشہور مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی آزادی کی اس لڑائی کو اسی عینک سے دیکھا۔ انہوں نے اپنے لمبے مضمون میں فرمایا:

"تمہارے سامنے بھی ہمت آزمائی اور عمل کا ایک میدان (یعنی یہی "آزادی کی جنگ") ہے جس میں اگر داخل ہو جاؤ تو فتمندی تمہارے ہی لئے ہے۔ لیکن اکثریت کے خوف اور اس کے سامان اور روپیہ کی کثرت نے تم کو سراسیمہ کر دیا ہے۔ اس لئے عزم و ہمت سے محروم ہو کر تم پست ہمتی کی خاک مذلّت پر لوٹ رہے ہو۔"[1]

غرضیکہ علماء، اور اہل قلم مسلمان دانشور مسلمانوں کے مقدمے کی غلط ترجمانی کر رہے تھے اور جس عینک سے ہندو لیڈر مسلمانوں کے معاملات و مسائل کو دیکھ رہے تھے ٹھیک وہی عینک خود ہمارے ترجمانوں نے لگالی تھی۔ تجدد پسند طبقہ روٹی کے مسئلہ کو سب سے اہم قرار دے کر اشتراکیت کی تبلیغ کھلے بندوں کر رہا تھا ان حالات میں مولانا مودودی نے محسوس کیا کہ ملت اسلامیہ کی کشتی ڈانواڈول ہو رہی ہے اور اگر حالات کو بدلنے کی فوری کوشش نہ کی گئی تو اس کشتی کو بچانا ممکن نہ رہے گا۔

چنانچہ ترجمان القرآن میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ یہ مضامین مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اوّل و دوم نامی کتاب کی شکل میں یکجا شائع ہوئے۔

مولانا نے اس نازک موقعہ پر اسلام اور ملت کا درد رکھنے والوں کو جھنجھوڑا اور فرمایا کہ جو لوگ مسلمان ہیں، مسلمان رہنا چاہتے، مسلمان مرنا چاہتے ہیں اور یہ تمنا رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب رہے اور ہماری آئندہ نسلیں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی راہ راست پر قائم رہیں:

"ان لوگوں کے لئے یہ وقت رواروی سے گزار دینے کا نہیں بلکہ گہری سوچ اور غایت درجہ کے غور و فکر کا ہے۔ وہ اگر اس نازک وقت میں غفلت اور بے پرواہی سے کام لیں گے تو ایک جرم عظیم کا ارتکاب کریں گے اور اس جرم کی

---

[1] ماہنامہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ، شمارہ جولائی ۱۹۳۶ء

سزا صرف آخرت ہی میں نہ ملے گی بلکہ اسی دُنیا کی زندگی میں ان پر چھا جائے گی۔ زمانہ کا بے درد ہاتھ اُن کی آنکھوں کے سامنے تہذیب اسلامی کے ایک ایک نشان کو مٹائے گا اور وہ بے بسی کے ساتھ اس کو دیکھا کریں گے ....
ان کی آنکھیں خود اپنے گھروں میں اپنی نوخیز نسلوں کو خدا پرستی سے دور، اسلامی تہذیب سے بیگانہ اور اسلامی اخلاق سے عاری دیکھیں گی اور آنسو تک نہ بہا سکیں گی۔ ان کی اپنی اولاد اس فوج کی سپاہی بن کر اُٹھے گی جسے اسلام اور اس کی تہذیب کے خلاف صف آرا کیا جائے گا۔ وہ اپنے جگر گوشوں کے ہاتھ سے تیر کھائیں گے اور جواب میں کوئی تیر نہ چلا سکیں گے[1]

ہندوستان میں جس نوعیت کا انقلاب آ رہا تھا، اس کی زہرناکی اور خوفناکی نگاہوں کے سامنے تھی انقلابی لیڈروں کا طرزِ عمل، ان کی صورتیں اور سیرتیں، ان کے افکار و خیالات سب سامنے تھے چنانچہ آپ نے بڑے درد سے فرمایا:

"ہم ابھی دیکھ رہے ہیں کہ مسٹروں کے بجائے شری پت اور مسوں کے بجائے شریمتیاں ہمارے ہاں پیدا ہونے لگی ہیں۔ گڈ مارننگ کی جگہ ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا جانے لگا ہے۔ ہیٹ کی جگہ گاندھی کیپ لے رہی ہے اور بعض علمائے دین فتویٰ دے رہے ہیں کہ یہ تَشَبُّہ کی تعریف سے خارج ہے۔ غرض دماغ اور دل وجسم سب اپنا رنگ بدل رہے ہیں[2]

مولانا نے بتایا کہ اس ملک میں ہماری دو حیثیتیں ہیں ایک ہندوستانی ہونے کی اور دوسری مسلمان ہونے کی۔ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہمارے بھی وہی سیاسی اور معاشی مسائل ہیں جو دوسری قوموں کے ہیں مگر مسلمان ہونے کی حیثیت میں ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ آنے والے دنوں میں ہم حکومت کے اثر کے اندر رہی اندر غیر مسلم نہ بن جائیں اور ایسا نہ ہو کہ ہم خود اپنی تہذیب اپنی معاشرت اور اپنے پرسنل لا کا گلا گھونٹ دیں۔ اس لئے مجرد جمہوری آزادی ہمارے کام کی چیز نہیں ہے بلکہ ہمیں ایسی آزادی چاہیئے جس

---

[1] تحریک آزادی ہند اور مسلمان حصہ اوّل، ص ۵۰
[2] " " " ص ۵۱

میں کسی باشندہ ہند کے ہندوستانی ہونے کی حیثیت میں اور اس کے مسلم، ہندو، سکھ یا عیسائی ہونے کی حیثیت میں کوئی ٹکراؤ نہ ہو۔

مولانا نے رسول اکرمؐ کی زندگی اور آپ کا اسوۂ حسنہ مسلمانوں کے سامنے رکھا اور فرمایا کہ آپؐ نے سوراج کی کوئی قومی تحریک نہیں چلائی تھی بلکہ حق کی دعوت دی تھی، حق پرستوں کی جمعیت بنائی تھی اور باطل کے غلبہ کو توڑنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ آج بھی واحد راہ عمل یہی ہے کہ پہلے ہم حق پرست بنیں پھر لوگوں کو حق کی دعوت دیں پھر حق پسندوں کی تنظیم کر کے حق کو نظامِ حیات کی صورت میں قائم کرنے کی جد و جہد کریں۔

مولانا نے ہندوستان کی قومی تحریک آزادی پر سخت تبصرہ کیا اور اسے شدھی کی تحریک قرار دیا:

> "میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ یہ تحریک قطعی طور پر "شدھی" کی تحریک ہے۔ اس میں اور شردھانند والی شدھی میں حقیقت اور نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ مسلمان جب اسلام سے منحرف اور اسلامی جماعت سے خارج ہو گیا تو خواہ وہ ہندو مت میں جائے یا بے مت ہو جائے دونوں صورتیں یکساں ہیں البتہ دونوں شدھیوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ایک کھلی ہوئی شدھی تھی، اور دوسری دامِ ہمرنگ زمین کا حکم رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی مسلمان تعاون کا نام بھی نہ لے سکتا تھا اور اس کی فوج میں فقیہ اور محدث اور مفسر تک سرگرم عمل نظر آ رہے ہیں اس لحاظ سے یہ تحریک اپنی پیش رو تحریک سے ہزار درجہ زیادہ خطرناک ہے۔"[1]

مولانا نے قومیت اور قوم پرستی جیسی اصطلاحوں پر بھی تنقید کی اور ان کے سلسلے میں اسلام کا نقطۂ نظر واضح کیا۔ متحدہ قومیت کے پُر فریب نعرے کی قلعی کھولی اور بتایا کہ ہندوستان کی نجات نیشنلزم میں نہیں ہے۔ آپ نے کھل کر لکھا کہ پورے قرآن میں کہیں ایک لفظ بھی نسلیت یا وطنیت کی تائید میں نہ ملے گا۔ اس کی دعوت کا خطاب

---

[1] تحریک آزادی ہند اور مسلمان اوّل ص ۲۵۱

پوری نوع انسانی سے ہے۔ تمام رُوئے زمین کی انسانی مخلوق کو وہ خیر و اصلاح کی طرف بُلاتا ہے اس میں نہ کسی قوم کی تخصیص ہے اور نہ کسی سرزمین کی۔ یہاں قومیت کی بنیاد بس ایک کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے اسی پر دوستی بھی ہے اور اسی پر دشمنی بھی۔ اسی کا اقرار جمع کرتا ہے اور اسی کا انکار جدا کرتا ہے۔ جن کو اس نے جُدا کر دیا ہے ان کو نہ خون کا رشتہ جمع کر سکتا ہے نہ خاک کا، نہ زبان کا، نہ رنگ کا، نہ روٹی کا، نہ حکومت کا ـــــ اور جن کو اس نے جمع کر دیا ہے انہیں کوئی چیز جدا نہیں کر سکتی۔ کسی دریا، کسی پہاڑ، کسی سمندر، کسی زبان، کسی نسل، کسی رنگ اور کسی زمین کے فقیہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اسلام کے دائرے میں امتیازی خطوط کھینچ کر مسلمان اور مسلمان کے درمیان فرق کرے:

> "پس یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ مسلمانوں میں ہندیت، ترکیت، افغانیت، عربیت اور ایرانیت کے احساسات کا پیدا ہونا اسلامی قومیت کا احساس مٹنے اور اسلامی وحدت کے پارہ پارہ ہونے کو مستلزم ہے .... لہٰذا وطنیت کے داعیوں کو اگر یہ کام کرنا ہے تو بہتر ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور دُنیا کو دھوکہ نہ دیں بلکہ جو کچھ کریں یہ جان کر کریں کہ وطنی قومیت کی دعوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی عین ضد ہے [۱]

مولانا نے "اسلام اور نیشنلزم" پر ایک مضمون لکھا اور اس میں "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کے نظریہ کو دلائل و شواہد سے باطل اور خلافِ اسلام قرار دیا۔ مولانا نے بتایا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں ان میں کسی قسم کا تعاون ممکن نہیں ہے۔ آپ نے یورپین نیشنلزم کی قلعی کھولی اور یہ ثابت کر دیا کہ ؏

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

مولانا نے اس باطل نظریہ پر اپنا قلم اس لئے چلایا تاکہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ نیشنلسٹ نہیں بلکہ انٹرنیشنلسٹ پارٹی ہیں جو ایک کلی نظریہ اور جہانی تصور لے کر اُٹھتی ہے [۲]

---

[۱] ترجمان القرآن نومبر، دسمبر ۱۹۳۳ء

[۲] ان مضامین کا مجموعہ مسئلہ قومیت کے نام سے مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶ سے چھپ چکا ہے۔

اس لئے مسلمانوں کو شہادت حق کا فریضہ انجام دینے کے لئے زندہ رہنا چاہیئے۔ اور انہیں اپنے قول و عمل سے یہ باور کرانا چاہیئے کہ اسلام محض کچھ مخصوص عقیدوں اور رسموں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک طرز زندگی اور ایک نظام حیات ہے جس میں دُنیا کے سارے انسانوں کے مسائل کا حل موجود ہے اور صرف اس دین پر عمل کر کے ہی ساری انسانیت امن و آشتی سے ہمکنار ہو سکتی اور آخرت میں خدا کی پکڑ سے بچ سکتی ہے

مسلم قومیت پر نشتر زنی

مسلم لیگ کی تحریک اُٹھی اور پاکستان کے مطالبہ نے زور پکڑا تو مولانا نے محسوس کیا کہ یہاں بھی قوم پرستی کی نیو موجود ہے اور یہ کہ لیڈران اسلام کا احیا نہیں بلکہ مسلمانوں کا احیاء چاہتے ہیں چنانچہ آپ نے مسلمان قومیت پر بھی کاری ضرب لگائی اس لئے کہ وطنی تحریک کی مخالفت کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ "مسلم قوم پرستی" کو برگ و بار پانے کے لئے چھوڑ دیا جائے اور جس طرح مونجے اور ساورکر کے لئے اصل مسئلہ ہندو قوم کے عروج کا تھا، مسولینی اطالوی قوم کو اوپر اٹھانا چاہتا تھا اور ہٹلر جرمن قوم کی ترقی کے لئے پریشان تھا اسی طرح مسلمان بھی اپنی "قوم" کے فلاح و بہبود تک محدود ہو کر رہ جائیں۔ مولانا کی نظر میں یہ مسلم قوم پرستی بھی اتنی ہی مہلک تھی جتنی وطنی قومیت اس لئے آپ نے اس باطل تصور پر بھی نشتر زنی کی اور مسلمانوں کو اسلامی نصب العین کی طرف ڈھکیلنے میں لگے رہے مسلمانوں کی جماعتوں اور ان کے لیڈروں پر تنقید کی تاکہ حق نکھر کر سامنے آتے اور باطل کا بطلان ثابت ہو جاتے۔ مولانا نے مسلم لیگ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

> "جب میں مسلم لیگ کے رزولیوشن کو دیکھتا ہوں تو میری روح بے اختیار ماتم کرنے لگتی ہے۔ ان لوگوں کو ایک موقع اور نادر موقع ملا تھا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دُنیا کی ساری قوموں پر اپنے اخلاقی مرتبہ کی برتری کا سکہ جما دیتے۔ ان کو ایک بیش قیمت موقع ملا تھا اس حقیقت کے اظہار کا کہ ہم ایک اخلاقی اُصول کے پیروکار ہیں اور وہ اخلاقی اصول حق اور عدل کی پاک ترین رُوح کا حامل ہے اور دُنیا میں صرف ہماری جماعت ہی وہ ایک جماعت ہے جو شخصی یا قومی نفع و نقصان کے تصورات سے بالاتر ہو کر مجرد اخلاق کی بُنیاد پر کام کرتی ہے .... مگر افسوس کہ لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک فرد بھی ایسا نہیں جو

اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔[1]

"پھر وہ لوگ جو اس طائفہ کے سرخیل ہیں، ان کا حال کیا ہے؟ ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپ کو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمت قبلہ کدھر ہے اور اسباب عیش و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجئے تو شاید کوئی صاحب دو فی صدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں گے، اِلّا ماشاء اللہ۔"[2]

پھر مولانا نے بتایا کہ اسلام وہ نظریہ ہے جو ایک عالمی تصور رکھتا ہے اور ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس تصور اور نظریہ کو لے کر اٹھے اور دنیا کے سامنے عملاً اس کا نقشہ پیش کرے۔ وہ مختلف پارٹیوں میں سے ایک پارٹی بننے پر قانع نہیں ہے بلکہ اس کی فطرت کا اقتضاء یہ ہے کہ بس وہی ایک ہو۔ وہ مسائل کو اشخاص، قوموں یا طبقوں کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ کلی اور جہانی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے پیش نظر وقتی یا مقامی مقاصد نہیں ہوتے بلکہ ایک دائمی اور جہانی مقصد ہوتا ہے۔ وہ قومیت کے تنگ دائرے میں بند ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتا جو نسلی اور تاریخی روایات پر قائم ہو۔ وہ کسی خاص قوم کے موروثی کلچر اور روایتی رسوم عادات سے اپنا دامن نہیں باندھتا۔ اور وہ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کے اصولوں کو ایک تحریک کی بنیاد بنا دیا جائے اس پر ایمان رکھنے والے ایک تحریک کے زور سے ایک مجاہد جماعت بن کر اٹھیں اور بالآخر اس کے نظریات ایک اسٹیٹ کے لئے بنیادی قانون بن جائیں۔

تحریک اسلامی کا قیام

جب مولانا مودودی نے یہ محسوس کیا کہ اقامتِ دین کا اجتماعی کام شروع کیا جا سکتا ہے اور باطل نظریات و افکار پر تنقید کے بعد تعمیری کام کی بنیاد ڈالی جا سکتی ہے تو ترجمان القرآن

---

[1] اسلامی سیاست ص: ۲۹ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ع۱
[2] 〃 〃 ص: ۸۰ 〃

میں لکھا کہ:

"وہ وقت آگیا جو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے قسمت کے فیصلے کا آخری وقت ہے۔ دل کی آنکھوں نے صاف دیکھ لیا کہ اب اگر اس قوم نے کوئی غلط قدم اُٹھایا تو سیدھی ہلاکت کے گڑھے کی طرف جائے گی اور اس کے ساتھ چشمِ دل ہی نہیں چشمِ سر نے بھی دیکھا کہ جن کی تدبیر اور تدبر پر اس قوم کے مستقبل کا انحصار ہے وہ بھی اب حالات کو اس فراست کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں جسے فراستِ مومن کہا گیا ہے اور اس کوتاہی کی بنا پر ایسے نازک وقت میں مسلمانوں کو ان مختلف راستوں پر چلائے جا رہے ہیں جن میں کوئی بھی منزلِ نجات کی طرف نہیں جاتا اس مرحلے پر پہنچ کر ضمیر نے آواز دی کہ اب وقت خاموش بیٹھنے کا نہیں ہے اب دین و ملت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے عوام و خواص، علماء، وزعماء سب کو ان حقیقی خطرات کی طرف توجہ دلائی جائے جو مسلم قوم ہونے کی حیثیت سے ہمیں درپیش ہیں اور اس کے ساتھ انہیں یہ بھی یاد دلایا جائے کہ تمہارے لئے ہدایت کا اصل سرچشمہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی پاک سیرت میں ہے۔ جس کو چھوڑ کر محض اپنی تدابیر پر بھروسہ کر لینا ہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا"[1]

چنانچہ مولانا نے "دیوانوں کی ضرورت" کے عنوان سے مسلمانوں کو آواز دی کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم کو مسلمان رہنے یا نہ رہنے کا آخری فیصلہ کرنا ہے۔ اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ماحول کو اور پھر تمام دنیا کو دارالاسلام بنانے کا عزم لے کر اٹھنا چاہیئے اور اس کے لئے جان و تن کی بازی لگا دینی چاہیئے۔ جن لوگوں میں یہ دیوانگی موجود ہے اور جو اپنے مقصد کی راہ میں لڑتے ہوئے ناکام مر جانے کو دُنیا کی ساری کامرانیوں پر ترجیح دینے کے لئے تیار ہیں، صرف انہی کی ہم کو ضرورت ہے اور صرف وہی دارالاسلام کی تحریک بھی چلا سکتے ہیں۔

مولانا کے نزدیک احیائے دین کا یہ فریضہ ایک ایسی صالح جماعت ہی انجام دے سکتی

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۱۶، اور تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان حصہ اوّل کا مقدمہ ص: ۲۴

ہے جو ایک صالح نظریہ کی علمبردار ہو۔ وہ نظریہ مندرجہ ذیل خطوط پر مبنی ہونا چاہیئے۔:

(۱) جو انسان کو انسان قرار دے نہ کہ جانور، جو اپنی ذات کے متعلق انسان کی رائے کو بہتر بنائے جس کا تصور انسانیت مغربی سائنس کے "تصور حیوانی" اور مسیحیت کے "پیدائشی گنہگار" اور ہندو مت کے "مجبور تناسخ"، سے بلند تر ہو۔

(۲) جو انسان کو مختار مطلق اور شتر بے مہار نہ بنائے بلکہ اسے سلطانِ کائنات کے اقتدار اعلیٰ کا تابع قرار دے اور اس کے آگے ذمہ دار و جواب دہ ٹھہرائے۔

(۳) جو اخلاق کے ایک ایسے قابل عمل ضابطے کا انسان کو پابند بنائے جس میں اپنی خواہشات کے مطابق ردو بدل کرنے کا حق اس کو نہ ہو۔

(۴) جو مادی بنیادوں پر انسانیت کو تقسیم کرنے کے بجائے ایک ایسی اخلاقی و رُوحانی بنیاد فراہم کرے جس پر انسانیت متحد ہو سکتی ہو۔

(۵) جو اجتماعی زندگی کے لئے ایسے اصول انسان کو دے جن پر افراد اور جماعتوں اور قوموں کے درمیان صحیح اور متوازن عدل قائم ہو سکے۔

(۶) جو زندگی کے نفس پرستانہ مقاصد سے بلند تر مقاصد اور قدر و قیمت کے مادہ پرستانہ معیاروں سے بہتر معیار انسان کو دے۔

(۷) اور ان سب خصوصیات کے ساتھ جو علمی و عقلی اور تمدنی ارتقاء میں انسان کی صرف مدد ہی نہ کرے بلکہ صحیح رہنمائی بھی کرے اور مادی و اخلاقی ہر دو حیثیتوں سے اسے ترقی کی طرف لے جائے[1]

ظاہر ہے کہ ایسا نظریہ اسلام کے سوا اور کوئی نہیں۔ اسی سے انسان فلاح کی توقعات وابستہ کر سکتا ہے اور اسی کی پیروی کر کے انسان کی تباہی ٹل سکتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا اسلام کے لئے مفتوح ہونے کو تیار بیٹھی ہے۔ اس کے لئے زبردست تنقیدی اور تعمیری تحریک کی ضرورت ہے جو ایک طرف علم و فکر کی طاقت سے پُرانی تہذیب کی جڑیں اُکھاڑ دے اور دوسری طرف علوم و فنون و آداب کو اپنی مخصوص فکری بنیادوں پر از سر نو مدون کرے اور اس کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ ایک

---

[1] اسلامی سیاست ص: ۲۰۰

صالح نظریہ موجود ہے صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے جو اس مقصد کی خاطر منظم جدّ وجہد کر سکے۔ چنانچہ فرمایا:

"اس کے لئے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریہ پر سچّا ایمان رکھتے ہوں۔ ان کو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہوگا اور وہ صرف اسی صورت سے دیا جا سکتا ہے کہ وہ جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اس کے خود مطیع بنیں، جس ضابطے پر ایمان لاتے ہیں اس کے خود پابند ہوں، جس اخلاق کو صحیح کہتے ہیں اس کا خود نمونہ بنیں، جس چیز کو فرض کہتے ہیں اس کا خود التزام کریں اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اسے خود چھوڑ دیں اس کے بغیر تو ان کی صداقت آپ ہی مشتبہ ہوگی کجا کہ کوئی ان کے آگے سرِ تسلیم خم کرے پھر ان کو اس فاسد نظامِ تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہوگی، اس سے اور اس کے پیرؤوں سے تعلق توڑنا ہوگا، ان تمام فائدوں، لذتوں، آسائشوں اور امیدوں کو چھوڑنا ہوگا جو اس نظام سے وابستہ ہوں، اور رفتہ رفتہ ان تمام نقصانات تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا جو نظامِ غالب کے خلاف بغاوت کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر انہیں وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس انقلاب کی جدّوجہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہوگا، اپنے اوقاتِ عزیز بھی قربان کرنے پڑیں گے، اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑے گا اور قید اور جلاوطنی اور ضبطِ اموال اور تباہیٔ اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی ہوں گی۔ ان راہوں سے گزرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب ہوا ہے نہ اب ہو سکتا ہے۔ ایک صحیح نظریہ کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو، محض نظریہ خواہ کتنا ہی بلند پایہ ہو، کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو کر ٹھوس زمین میں کبھی جڑ نہیں پھیلا سکتا — نظریہ کی کامیابی کے لئے خود اس کے اصولوں کی طاقت جس قدر ضروری ہے اسی قدر انسانوں کی سیرت، ان کے عمل اور ان کی قربانی و سرفروشی کی طاقت بھی ضروری ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہوں"[۱]

---

[۱] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۲۰۲، ۲۰۳

چنانچہ ان امور کو سامنے رکھ کر مولانا مودودی نے اقامت دین کے لئے ایک پکار لگائی جس پر ملک کے پچہتر افراد ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور کے محلہ اسلامیہ پارک میں جمع ہوئے اور جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی۔ باہمی مشورے سے مولانا ہی کو امیر جماعت منتخب کیا گیا۔ امارت کیا تھی، مقتل کی طرف قدم بڑھانا تھا۔ اس موقعہ پر مولانا نے فرمایا:

"میں آپ کے درمیان نہ سب سے زیادہ علم رکھنے والا تھا نہ سب سے زیادہ متقی نہ کسی خصوصیت میں مجھے فضیلت حاصل تھی۔ بہرحال جب آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے اس کارِ عظیم کا بار میرے اوپر ہی رکھ دیا ہے تو میں اللہ سے دُعا کرتا ہوں اور آپ لوگ بھی دُعا کریں کہ مجھے اس بار کو نبھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور آپ کے اس اعتماد کو مایوسی میں تبدیل نہ ہونے دے۔"[1]

پھر جماعت اسلامی کے عظیم نصب العین کا ذکر کرنے کے بعد اپنے جذبوں اور ولولوں کو اس طرح بیان کیا:

"میرے لئے یہ تحریک نہیں مقصدِ زندگی ہے۔ میرا مرنا اور جینا اسی کے لئے ہے کوئی اس راہ پر چلنے کے لئے تیار ہو یا نہ ہو، بہرحال مجھے تو اس راہ پر چلنا ہے اور اسی راہ میں جان دینا ہے۔ کوئی آگے نہ بڑھے گا تو میں بڑھوں گا۔ کوئی ساتھ نہ دے گا تو میں اکیلا چلوں گا۔ ساری دُنیا متحد ہو کر مخالفت کرے گی تو مجھے تنِ تنہا اس سے لڑنے میں باک نہیں ہے۔"[2]

تحریک اسلامی کا نصب العین

جس وقت جماعت کی تشکیل ہوئی، اس کا نصب العین یہ قرار دیا گیا:

"جماعتِ اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جہد کا مقصود دُنیا میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔"

اس نصب العین کی تشریح کرتے ہوئے کہا گیا کہ:

"حکومتِ الٰہیہ کے قیام سے مراد اللہ کی تکوینی حکومت کا قیام نہیں ہے

---

[1] روداد جماعت اسلامی حصہ اوّل، ص: ۲۲

[2] " " " " ص: ۲۳

بلکہ دراصل اس سے مراد اللہ کی شرعی حکومت کا قیام ہے جس کا تعلق صرف انسان سے، اور انسان کی زندگی کے بھی صرف اس حصے سے ہے جس میں اللہ نے انسان کو اختیار عطا فرمایا ہے ۔۔۔۔۔۔ انسان کی زندگی کے اختیاری حصے میں اللہ کے جس قانون کی اطاعت مطلوب ہے وہ اس کا قانون تکوینی نہیں بلکہ اس کا وہ قانون شرعی ہے جو رسولوں کے واسطے سے آتا ہے اور اس قانون کا تعلق عقائد، اخلاق، معاشرت، تمدن اور سیاست وغیرہ سے ہے۔ محض تکوینی حیثیت سے اللہ کو خالق اور مدبر کائنات اور مالک ارض و سماء مان لینا کافی نہیں بلکہ سیاسی حیثیت سے اسی کو بادشاہ اور حاکم اور قانون ساز ماننا بھی ضروری ہے ۔۔۔۔۔۔ مومن کی زندگی کا مشن یہ ہے کہ جس طرح خدا کا قانونِ تکوینی تمام کائنات میں نافذ ہے اسی طرح خدا کا قانونِ شرعی بھی عالم انسانی میں نافذ ہو، مومن کی تمام مساعی کا ہدف مقصود یہ ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو خدا کے سوا ہر ایک بندگی سے نکالے اور صرف خدا کا بندہ بنائے۔ یہ کام فی الاصل تو نصیحت، فہمائش، ترغیب اور تبلیغ ہی سے کرنے کا ہے، لیکن جو لوگ ملکِ خدا کے ناجائز مالک بن بیٹھے ہیں اور خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنا لیتے ہیں وہ عموماً اپنی خداوندی سے محض نصیحتوں کی بنا پر دست بردار نہیں ہو جایا کرتے اور نہ وہ اس کو گوارا کرتے ہیں کہ عامۃ الناس میں حقیقت کا علم پھیلے کیونکہ اس سے ان کو خطرہ ہوتا ہے کہ ان کی خداوندی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اس لئے مومن کو مجبوراً جنگ کرنی پڑتی ہے تاکہ حکومتِ الٰہیہ کے قیام میں جو چیز سدِ راہ ہو اُسے راستے سے ہٹا دے[1]"

چونکہ دستور میں مستعمل حکومت الٰہیہ کا لفظ قرآنی اصطلاح نہ تھا اس لئے بعد میں اسے "اقامت دین" کے جامع و مانع اور قرآنی اصطلاح سے بدل دیا گیا۔

مولانا نے اولین مرحلہ میں یہ واضح کر دیا تھا کہ ہمارا تعلق اس تحریک سے ہے جس کے لیڈر انبیاء علیہم السلام تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص نظام فکر اور ایک خاص طریق فکر

---

[1] سب سے پہلا دستور جماعت اسلامی مطبوعہ ۱۹۴۱ء ص ۱۲ تا ۲۵ سے۔

ہوتا ہے۔ اسلام کا طریق کار اور طریق فکر وہ ہے جو ہم کو انبیاء کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ ہمارے لئے مقصد و نصب العین وہی ہے جو انبیاء کا تھا اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے جس پر انبیاء ہر زمانے میں چلتے رہے۔ اس لئے ہمارا نکتہ نظر اور معیار قدر وہی ہونا چاہیئے اور ہماری اجتماعی پالیسی انہی خطوط پر قائم ہونی چاہیئے جن پر انہوں نے قائم کی تھی:۔

"یہ تعداد کی بنا پر قومی حکومت کے مطالبے، یہ اکثریت و اقلیت کے نوحے، یہ تحفظات اور حقوق کی چیخ پکار، یہ انگریز سلطنت اور والیانِ ریاست کے ظلِ عاطفت میں قومی مفاد کے تحفظ کی تدبیریں اور دوسری طرف یہ آزادیٔ وطن کے نعرے اور پنڈت نہرو کے سُروں میں امپریلزم کی مخالفت یہ سب ہمارے لئے بکری کی بولیاں ہیں۔ یہ بولیاں بول کر ہم خود ایک غلط پوزیشن اختیار کرتے ہیں اور اپنی پوزیشن اس قدر غلط طور پر دُنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ دُنیا ہمیں بکری ہی سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ خدا نے ہمیں اس سے بہت اونچا منصب دیا ہے ہمارا منصب یہ ہے کہ ہم کھڑے ہو کر تمام دُنیا سے غیر اللہ کی حاکمیت مٹا دیں اور خدا کے بندوں پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت باقی نہ رہنے دیں یہ شیر کا منصب ہے اور اس منصب کو ادا کرنے کے لئے کسی قسم کی خارجی شرائط درکار نہیں ہیں بلکہ صرف شیر کا دل درکار ہے۔ وہ شیر شیر نہیں ہے جو اگر پنجرے میں بند ہو تو بکری کی طرح ممیانے لگے، اور شیر وہ بھی نہیں جو بکریوں کی کثرتِ تعداد کو دیکھ کر یا بھیڑیوں کی چیرہ دستی دیکھ کر اپنی شیریت بھول جائے"[1]

چنانچہ جماعت اسلامی نے اپنی جہد و سعی کا آخری مقصود انقلاب امامت کو قرار دیا یعنی دنیا میں فساق و فجار کی امامت ختم ہو کر امامت صالحہ کا نظام قائم ہو تا کہ آخرت میں اللہ کی رضا حاصل ہو سکے اور ہم فلاح اخروی سے ہمکنار ہو سکیں۔

---

[1] اسلامی سیاست، ص ۱۰۲

دعوت اسلامی

مولانا نے اپنی دعوت تین نکات میں بیان کی ہے جو دراصل تحریک اسلامی کی جامع و مانع دعوت ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

"اگر ہم اپنی دعوت کو مختصر طور پر صاف اور سیدھے الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یہ تین نکات پر مشتمل ہوگی:

(۱) یہ کہ ہم بندگانِ خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں ان کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔

(۲) یہ کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرنے یا اس کو ماننے کا دعویٰ یا اظہار کرے، اس کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے منافقت اور تناقض کو خارج کرے، اور جب وہ مسلمان ہے یا بنا ہے تو مخلص مسلمان بنے اور اسلام کے رنگ میں رنگ کر یک رنگ ہو جائے۔

(۳) یہ کہ زندگی کا نظام جو باطل پرستوں اور فساق و فجار کی رہنمائی اور قیادت و فرماں روائی میں چل رہا ہے اور معاملاتِ دنیا کے انتظام کی زمام کار جو خدا کے باغیوں کے ہاتھ میں آگئی ہے، ہم یہ دعوت دیتے ہیں کہ اسے بدلا جائے اور رہنمائی و امامت نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے مومنین صالحین کے ہاتھ میں منتقل ہو۔"[۱]

پھر مولانا نے تفصیل سے اس کی وضاحت کی ہے کہ اللہ کی بندگی کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء جس بندگیٔ رب کی دعوت لے کر آئے تھے اس کا مفہوم یہ تھا کہ انسان خدا کو پورے معنیٰ میں الٰہ اور رب، معبود اور حاکم، آقا اور مالک، رہنما اور قانون ساز، محاسب اور مجازی تسلیم کرے اور اپنی پوری زندگی کو خواہ وہ شخصی ہو یا اجتماعی، اخلاقی ہو یا مذہبی، تمدنی و سیاسی اور معاشی ہو یا علمی و نظری، اسی ایک خدا کی بندگی میں سپرد کر دے۔ بندگی کا یہی وہ مفہوم ہے جس کی تبلیغ جماعت نے کی اور جسے قبول کرنے کی سب لوگوں کو، مسلمانوں اور غیر مسلموں کو دعوت دی چنانچہ جماعت اسلامی کا بنیادی عقیدہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

---

[۱] روداد جماعت اسلامی حصہ سوم، ص ۵۰ بار اول اکتوبر ۱۹۶۶ء

کی تشریح میں ان سب باتوں کو سمیٹ لیا گیا دستور میں لکھا گیا کہ خدا کو الٰہ تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ :

(۱) انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی و کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا، فریاد رس اور حامی و ناصر نہ سمجھے کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہی نہیں ہے۔

(۲) اللہ کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقویٰ اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی سے امیدیں وابستہ نہ کرے کیونکہ تمام اختیارات کا مالک وہی اکیلا ہے۔

(۳) اللہ کے سوا کسی سے دُعا نہ مانگے، کسی کی پناہ نہ ڈھونڈھے، کسی کو مدد کے لئے نہ پکارے، کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخیل اور زور آور بھی نہ سمجھے کہ اس کی سفارش سے قضائے الٰہی ٹل سکتی ہو۔

(۴) اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جُھکائے، کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر نہ دے اور کسی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

(۵) اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک، مقتدر اعلیٰ نہ تسلیم کرے، کسی کو بااختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے، کسی کو شارع اور قانون ساز نہ مانے اور ان تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے جو ایک اللہ کی اطاعت کے ماتحت اور اس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں، کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے، اللہ کے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچا۔

پھر اس عقیدے کو تسلیم کرنے سے جو چیزیں لازم آتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ "اپنے لئے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، معیشت اور سیاست میں غرض زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت اور صرف اس کے مقرر کئے ہوئے ضابطے کو ضابطہ تسلیم کرے اور ہر اس طریقے کو رد کر دے جس کا اللہ کی طرف سے ہونا ثابت نہ ہو"[1]

---

[1] دیکھئے دستور جماعت اسلامی محرم ۱۳۶۹ھ : بنیادی عقیدہ اور اس کی تشریح اور تقاضے

دوسری چیز جس کی جماعت نے دعوت دی، کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے فرمایا کہ اسلام کی پیروی کرنے والے یا اسلام قبول کرنے والے منافقانہ رویے چھوڑیں اور اپنی زندگی کو نفاق اور تناقض سے پاک کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس دین کا دعویٰ کرے اس کے بالکل برخلاف نظامِ زندگی کو اپنے اوپر حاوی و مسلط پاکر مطمئن رہے اس کو بدل کر اپنے دین کو اس کی جگہ قائم کرنے کی کوئی کوشش نہ کرے بلکہ اس کے برعکس اسی فاسقانہ وباغیانہ نظامِ زندگی کو اپنے لئے ساز گار بنانے اور اس میں اپنے لئے آرام کی جگہ پیدا کرنے کی فکر کرتا ہے۔ یہ عمل سراسر منافقانہ ہے اور مخلصانہ ایمان کا تقاضا ہے کہ اس سے باز آئے اور اپنی زندگی کو تضاد، تناقض اور نفاق سے پاک کرے۔

مولانا نے تیسرے نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں اس نظامِ زندگی میں انقلاب لانا ہے جو کفر، دہریت، شرک، فسق و فجور اور بد اخلاقی کی بنیادوں پر چل رہا ہے اور جس کے نقشے بنانے والے مفکرین، اور جس کا عملی انتظام کرنے والے مدبرین، سب کے سب خدا سے پھرے ہوئے اور اس کی شرائع کے قیود سے بپھرے ہوتے لوگ ہیں جب تک زمامِ کار ان لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی اور جب تک علوم و فنون، آرٹ اور ادب، تعلیم و تدریس، نشر و اشاعت، قانون سازی اور تنفیذ قانون، مالیات، صنعت و حرفت و تجارت، انتظام ملکی اور تعلقات بین الاقوامی ہر چیز کی باگ ڈور یہ لوگ سنبھالے ہوئے رہیں گے، کسی شخص کے لئے دنیا میں مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا اور خدائی بندگی کو اپنا ضابطۂ حیات بنا کر رہنا نہ صرف عملاً محال ہے بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کو اعتقاداً بھی اسلام کا پیرو چھوڑ جانا غیر ممکن ہے۔ اس لئے ہمارا مسلم ہونا خود اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم دنیا کے ائمہ ضلالت کی پیشوائی ختم کرنے اور غلبۂ کفر و شرک کو مٹا کر دین حق کو اس کی جگہ قائم کرنے کی سعی کریں۔

طریق کار اور لائحہ عمل

جماعت اسلامی نے اپنے نصب العین کے حصول کے لئے جو طریق کار اختیار کیا تھا وہ یہ تھا:

"جماعت کا مستقل طریق کار یہ ہو گا کہ وہ کسی امر کا فیصلہ کرنے یا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ دیکھے گی کہ خدا اور رسول کی ہدایت کیا ہے۔ دوسری ساری باتوں کو

ثانوی حیثیت سے صرف اس حد تک پیش نظر رکھے گی جہاں تک اسلام میں اس کی گنجائش ہوگی۔[1]

اس نصب العین اور طریق کار کو طے کرنے کے بعد جماعت اسلامی نے اپنے لئے جو لائحہ عمل طے کیا، وہ چار اجزاء پر مشتمل ہے اور اس کے مستقبل کے لائحہ عمل میں بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ:

(۱) "ہمارے لائحہ عمل کا پہلا جز تطہیر افکار و تعمیر افکار ہے۔ ہم کئی سال سے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور ہماری اس کوشش کا سلسلہ برابر جاری ہے کہ ایک طرف غیر اسلامی قدامت کے جنگل کو صاف کر کے حقیقی اور اصلی اسلام کی شاہراہ مستقیم کو نمایاں کیا جائے۔ دوسری طرف مغربی علوم و فنون اور نظام تہذیب و تمدن پر تنقید کر کے بتایا جائے کہ اس میں کیا کچھ غلط اور قابل ترک ہے اور کیا کچھ صحیح اور قابل اخذ ہے۔ اور تیسری طرف وضاحت کے ساتھ یہ دکھایا جائے کہ اسلام کے اصولوں کو زمانہ حال کے مسائل و معاملات پر منطبق کر کے ایک صالح تمدن کی تعمیر کس طرح ہو سکتی ہے اور اس میں ایک ایک شعبۂ زندگی کا نقشہ کیا ہوگا۔ اس طریقۂ کار سے ہم خیالات کو بدلنے اور ان کی تبدیلی سے زندگیوں کا رخ پھیرنے اور ذہنوں کو تعمیر نو کے لئے فکری غذا بہم پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کوشش کے نتائج ہمارے لٹریچر اور شائع شدہ تقریروں کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ہر شخص انہیں دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ ہم کس رخ پر جا رہے ہیں اور کدھر اپنی قوم کو لیجانا چاہتے ہیں۔

(۲) ہمارے لائحہ عمل کا دوسرا جز صالح افراد کی تلاش، تنظیم اور تربیت ہے۔ ہم ان آبادیوں میں ان مردوں اور عورتوں کو ڈھونڈھ رہے ہیں جو پرانی اور نئی تہذیبوں سے پاک ہوں یا اب پاک ہونے کے لئے تیار ہوں، جن کے اندر اصلاح کا جذبہ موجود ہو، جو حق کو حق مان کر اس کے لئے وقت، مال اور محنت کی کچھ قربانی کرنے پر بھی آمادہ ہوں، خواہ وہ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے، خواہ وہ عوام میں سے ہوں یا خواص میں سے، خواہ وہ غریب ہوں یا امیر یا متوسط، ایسے لوگ جہاں کہیں بھی ہیں، ہم انہیں گوشۂ عافیت سے

---

[1] دستور جماعت اسلامی دفعہ ۵

نکال کر میدان سعی و عمل میں لانا چاہتے ہیں۔ اگر وہ ہمارے مقصد، طریق کار اور نظام جماعت کو قبول کرلیں تو انہیں اپنی جماعت کا رُکن بنا لیتے ہیں اور اگر وہ رُکنیت کی شرائط پوری کئے بغیر صرف تائید اور اتفاق پر اکتفا کریں تو ان کو اپنے حلقۂ متفقین میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں جو ایک صالح عنصر بچا کھچا موجود ہے مگر منتشر ہونے کی وجہ سے، یا جزوی اصلاح کی پراگندہ کوششیں کرنے کی وجہ سے کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر رہا ہے، اسے چھانٹ چھانٹ کر ایک مرکز پر جمع کیا جائے اور ایک حکیمانہ پروگرام کے مطابق اس کو اصلاح و تعمیر کی منظم سعی میں لگایا جائے۔

ہم صرف اس تنظیم ہی پر قناعت نہیں کر رہے ہیں بلکہ ساتھ ساتھ ان منظم ہونے والوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا بھی انتظام کر رہے ہیں تاکہ ان کی فکر زیادہ سے زیادہ سُلجھی ہوئی اور ان کی سیرت زیادہ سے زیادہ پاکیزہ، مضبوط اور قابل اعتماد ہو، ہمارے پیش نظر ابتدا سے یہ حقیقت ہے کہ اسلامی نظام محض کاغذی نقشوں اور زبانی دعوؤں کے بل پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے قیام اور نفاذ کا سارا انحصار اس پر ہے کہ آیا اس کی پشت پر تعمیری صلاحیتیں اور انفرادی سیرتیں موجود ہیں یا نہیں۔ کاغذی نقشوں کی خامی تو اللہ کی توفیق سے علم اور تجربہ ہر وقت رفع کر سکتا ہے، لیکن صلاحیت اور صالحیت کا فقدان سرے سے کوئی عمارت اٹھا ہی نہیں سکتا اور اٹھا بھی لے تو سہار نہیں سکتا۔

(۳) ہمارے لائحہ عمل کا تیسرا جزو ہے اجتماعی اصلاح کی سعی، اس میں سوسائٹی کے ہر طبقہ کی اس کے حالات کے لحاظ سے اصلاح شامل ہے اور اس کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہو سکتا ہے، جتنے ہمارے ذرائع وسیع ہوں۔ ہم اپنے ارکان اور کارکن متفقین کو ان کی صلاحیتوں کے لحاظ سے مختلف حلقوں میں تقسیم کرتے ہیں اور ہر ایک کے سپرد وہ کام کرتے ہیں جس کے لئے وہ اہل تر ہوں۔ ان میں سے کوئی شہری عوام میں کام کر رہا ہے اور کوئی دیہاتی عوام میں، کوئی کسانوں کی طرف متوجہ ہے اور کوئی مزدوروں کی طرف۔ کوئی متوسط طبقے کو خطاب کر رہا ہے اور کوئی اونچے طبقے کو۔ کوئی سرکاری ملازمین کی اصلاح کے لئے کوشاں ہے اور کوئی تجارت پیشہ اور صنعت پیشہ لوگوں کی اصلاح کے لئے۔ کسی کی توجہ پُرانی درس گاہوں کی طرف ہے اور کسی کی نئے کالجوں کی طرف۔ کوئی جمود کے قلعوں کو توڑنے میں لگا ہوا ہے اور کوئی الحاد و فسق کے سیلاب کو روکنے میں۔ کوئی شعر و ادب کے میدان میں

کام کر رہا ہے اور کوئی علم و تحقیق کے میدان میں۔ یہ سب اگرچہ اپنے الگ حلقہ ہائے کار رکھتے ہیں مگر سب کے سامنے ایک مقصد اور ایک اسکیم ہے جس کی طرف وہ قوم کے سارے حلقوں کو گھیر کر لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا متعین نصب العین یہ ہے کہ اس ذہنی، اخلاقی اور عملی انارکی کو ختم کیا جائے جو پرانے جمودی اور نئے انفعالی رجحانات کی وجہ سے ساری قوم میں پھیلی ہوئی ہے اور عوام سے لے کر خواص تک، سب میں صحیح اسلامی فکر، اسلامی سیرت اور سچے مسلمانوں کی سی عملی زندگی پیدا کی جائے۔

یہ کام صرف وعظ و تلقین اور نشر و اشاعت اور شخصی ربط و مکالمہ ہی سے نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ مختلف سمتوں میں باقاعدہ تعمیری پروگرام بنا کر پیش قدمی کی جا رہی ہے۔ مثلاً ہمارے کارکن جہاں کہیں اپنی تبلیغ سے چند آدمیوں کو متفق بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہاں انہیں ملا کر ایک حلقۂ متفقین منظم کرتے ہیں اور پھر ان کی مدد سے ایک پروگرام کو عمل میں لانے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں جس پروگرام کے چند اجزا درج ذیل ہیں:

"بستی کی مسجدوں کی اصلاح حال، عام باشندوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے روشناس کرانا، تعلیم بالغان کا انتظام، کم از کم ایک دارالمطالعہ کا قیام، لوگوں کو ظلم و ستم سے بچانے کے لئے اجتماعی جدوجہد، باشندوں کے تعاون سے صفائی اور حفظانِ صحت کی کوشش، بستی کے یتیموں، بیواؤں، معذوروں اور غریب طالب علموں کی فہرستیں مرتب کرنا، اور جن جن طریقوں سے ممکن ہو ان کی مدد کا انتظام کرنا اور اگر ذرائع فراہم ہو جائیں تو کوئی پرائمری اسکول یا ہائی اسکول یا مذہبی تعلیم کا ایسا مدرسہ قائم کرنا جس میں تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت کا بھی انتظام ہو۔"

(۴) ہمارے لائحہ عمل کا چوتھا جزو نظامِ حکومت کی اصلاح ہے۔ اگر ہم فی الواقع اپنے ملک کے نظامِ زندگی کو فسق و ضلالت کی راہ سے ہٹا کر دینِ حق کی صراطِ مستقیم پر چلانا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ بگاڑ کو مسندِ اقتدار سے ہٹانے اور بناؤ کو اس کی جگہ متمکن کرنے کی براہِ راست کوشش کریں۔[1]"

---

[1] ملاحظہ ہو اقبال، دارالاسلام اور مودودی کا دسواں باب، "مولانا مودودی اور تحریک اسلامی": سید اسعد گیلانی، اسلامی اکادمی، اردو بازار لاہور

مندرجہ بالا لائحہ عمل کے مطابق کام کی عملی تشریحات جو طے کی گئیں وہ یہ تھیں:

(الف) "سب سے مقدم کام یہ ہے کہ اس قومی کشمکش کا خاتمہ کیا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اب تک برپا رہی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بات پہلے بھی غلط تھی کہ مسلمان اسلام کے لئے کام کرنے کے بجائے اپنے قومی اغراض اور مطالبوں کے لئے لڑتے رہے مگر اب تو اس لڑائی کو جاری رکھنا محض غلطی نہیں بلکہ مہلک غلطی اور احمقانہ خودکشی ہے اب یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلمان اپنے طرز عمل کو بالکل بدل دیں۔ یہ اسمبلیوں میں نمائندگی کے تناسب کا سوال، یہ انتخابات کی دوڑ دھوپ، یہ ملازمتوں کے لئے کشمکش اور یہ دوسرے حقوق اور مطالبوں کے لئے چیخ و پکار اس دور میں بالکل لاحاصل بلکہ نقصان دہ ہے۔ ان حقوق کے "استقرار" کی جتنی کوششیں بھی کی جائیں گی وہ ملک میں اس غیر معمولی تعصب کو اور زیادہ مشتعل کریں گی جو اس وقت غیر مسلم اکثریت کے اندر اسلام کے خلاف پیدا ہو گیا ہے۔

(ب) دوسرا اہم کام یہ ہے کہ مسلمانوں میں وسیع پیمانے پر اسلام کا علم پھیلایا جائے۔ ان میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا عام جذبہ پیدا کیا جائے اور ان کی اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی زندگی کی اس حد تک اصلاح کی جائے کہ ان کے ہمسایہ غیر مسلموں کو خود اپنی سوسائٹی کی بہ نسبت ان کی سوسائٹی صریحاً بہتر محسوس ہونے لگے۔ یہ کام برسوں کی انتھک اور لگاتار محنت چاہتا ہے مگر جب تک ہم مسلم سوسائٹی کے ایک بڑے حصے کو علمی و عملی اور تمدنی و معاشرتی حیثیت سے اسلام کا صحیح نمائندہ نہ بنا لیں، ہمارا یہ امید کرنا محض ایک بوالفضولی ہے کہ ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کی رائے کو اسلام کے حق میں ہموار کیا جا سکے۔

(ج) تیسرا ضروری کام یہ ہے کہ اس ملک کی ذہنی طاقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ تحریک دعوتِ اسلامی کے لئے فراہم کیا جائے اور اس سے باقاعدگی کے ساتھ کام لیا جائے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ اپنے ان مقاصد میں ناکام ہو چکا ہے۔ اس موقع پر اگر ان کے سامنے ایک روشن نصب العین، امیدوں اور بشارتوں کے ساتھ آئے تو ان کے ایک بڑے حصہ کی توجہات کو اس طرف کھینچا جا سکتا ہے۔

اس طرح جیسے جیسے اس دعوت کو یہ طاقت حاصل ہوتی جائے، اسے دعوت کی ان علمی، تبلیغی اور دوسرے نتیجہ خیز کاموں پر لگایا جاتا رہے جو اس ملک میں اسلامی دعوت کے کام کی تکمیل کو قریب تر لا سکیں۔

(د) چوتھا ضروری کام یہ ہے کہ اس دعوت کو اپنانے والے سب کارکن ہندوستان کی ان مقامی زبانوں کو سیکھیں اور ان میں تحریر و تقریر کی قابلیت بہم پہنچائیں جو اب تعلیم اور لٹریچر کی زبانیں بنتی جا رہی ہیں نیز اس امر کی انتہائی کوشش کریں کہ ان زبانوں میں جلد سے جلد اسلام کا ضروری لٹریچر منتقل کیا جائے[1]

تحریک اقامت دین اور جمہوری انتخابات

مولانا مودودی نے کام کا جو ابتدائی نقشہ بنایا تھا وہ یہ تھا کہ توسیع دعوت کے جتنے وسائل بھی بہم پہنچیں انہیں استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہم خیال بنایا جائے، پھر ان میں سے جو لوگ عملاً اس کام کے کرنے پر آمادہ ہوں انہیں جمع کر کے اور ترتیب دے کر ایک ایسا صالح گروہ منظم کیا جائے جو ایک متبادل قیادت کا بار اٹھانے کے لائق ہو سکے اور آگے اس امر کا انتظار کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ منزل مقصود کی طرف پیش قدمی کے لئے مزید مواقع بہم پہنچائے۔ لیکن اس سلسلے میں جو سوالات اور اعتراضات عوام کے ذہنوں میں پیدا ہو رہے تھے ان کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک بار مولانا نے لکھا تھا کہ:

> "اس دور میں سب سے زیادہ جو سوال سوچنے سمجھنے والے طبقہ کو پریشان کرتا تھا وہ یہ تھا کہ آخر ایک ایسے ملک میں جہاں ایک منظم غیر اسلامی ریاست۔ اور وہ بھی زمانہ جدید کی ریاست جس سے بڑھ کر زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی اور مسلط ہونے والی ریاستیں کسی سابق دور میں نہ پائی جاتی تھیں —— موجود ہے اور غالب آبادی غیر مسلم ہے، وہ انقلاب عملاً کیسے رونما ہو گا جو ہم برپا کرنا چاہتے ہیں؟ فرض کیجئے کہ ہم غالب حصہ آبادی کے خیالات، ذہنیتیں، اخلاقی معیارات، سب کچھ بدل دینے میں کامیاب ہو جائیں، تب بھی کفر کا اقتدار آپ سے آپ تو

---

[1] دستور جماعت اسلامی محرم ۱۳۶۹ھ، ص ۵۰ تا ۵۴
نیز تقریر مدراس اپریل ۱۹۴۷ء از مولانا مودودی۔

ختم نہیں ہو جائے گا اسے بدلنے کے لئے بہر حال کوئی عملی صورت ہی اختیار کرنی ہوگی۔ اب اگر ہم انتخابات کے ذریعہ سے انقلاب قیادت کا راستہ اختیار نہیں کر سکتے کیونکہ لادینی ریاست کے اندر انتخابات میں حصہ لینا ہمارے عقیدے کے خلاف ہے تو کیا ہم مسلح انقلاب کریں گے؟ یا کہیں ہجرت کر کے مدینہ طیبہ کے طرز کی کوئی ریاست قائم کریں گے اور پھر جہاد کر کے اس ملک کو دار الاسلام بنائیں گے؟ یا پھر کیا پیروانِ مسیح کی طرح ہم دو تین برس تک اس انتظار میں تبلیغ و اشاعت، اور تحمل مصائب و شدائد کا طویل دور گزاریں گے کہ کوئی قسطنطین مسلمان ہو کر خود ہی یہاں اسلامی حکومت قائم کر دے؟

یہ سوالات اس زمانے میں بار بار میرے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں میں نے ترجمان القرآن میں ایک دفعہ لکھا تھا :

اصولی طریق کار یہی ہے کہ پہلے ہم اپنی دعوت پیش کریں گے، پھر ان لوگوں کو جو ہماری دعوت قبول کریں، منظم کرتے جائیں گے، پھر اگر رائے عامہ کی موافقت سے یا حالات کی تبدیلی سے کسی مرحلے پر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجود الوقت دستوری طریقوں ہی سے نظام حکومت کا ہمارے ہاتھوں میں آ جانا ممکن ہو اور ہمیں توقع ہو کہ ہم سوسائٹی کے اخلاقی، تمدنی اور سیاسی و معاشی نظام کو اپنے اصولوں پر ڈھال سکیں گے تو ہمیں اس موقعہ سے فائدہ اُٹھانے میں کوئی تامل نہ ہو گا اس لئے کہ ہمیں جو کچھ بھی واسطہ ہے اپنے مقصد سے ہے نہ کہ کسی خاص طریقے (METHOD) سے۔ لیکن اگر پُرامن ذرائع سے جوہر اقتدار (SUBSTANCE OF POWER) ملنے کی توقع نہ ہو تو پھر ہم دعوت جاری رکھیں گے اور تمام جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔[1]

اسی سلسلہ میں ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے اسی زمانہ میں لکھا گیا تھا:

"الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لئے ہو کہ ایک غیر اسلامی

---

[1] رسائل و مسائل حصہ اول ص ۵۰۹۔ دراصل یہ مضمون ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۵ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا۔

دستور کے تحت ایک لادینی (SECULER) جمہوری (DEMOCRATIC) ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدۂ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عامہ کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور حکومت تبدیل کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس طریقے سے کام نہ لیں۔ جو چیز لڑے بغیر سیدھے طریقے سے حاصل ہو سکتی ہے اس کو خواہ مخواہ ٹیڑھی انگلیوں ہی سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے مگر خوب سمجھ لیجئے کہ یہ طریق کار ہم اس صورت میں اختیار کریں گے جبکہ

اولاً ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں کہ محض رائے عامہ کا کسی نظام کے لئے ہموار ہو جانا ہی عملاً اس نظام کے قائم ہونے کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔

ثانیاً ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگان ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں اور اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو۔

ثالثاً، انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت نہ ہوں بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے[1]

ان تحریروں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی نے ملکی سیاست کے متعلق جو رویہ اپنایا وہ کتنا درست تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اگر مسلمان سیاسی حریف بن کر سامنے آئیں تو یہاں کی اکثریت ان کی دعوت پر کان دھرنے کے لئے تیار نہ ہوگی اس لئے جماعت اسلامی نے فیصلہ کیا کہ بے لوث دعوت عوام کے سامنے آئے اس میں ہمارا کوئی قومی مفاد پیش نظر نہ ہو اور مخاطب گروہ کو یقین ہو جائے کہ یہ لوگ مَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ کے اصول پر عمل پیرا ہیں تو آج بھی اس ملک میں يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا کا منظر سامنے آسکتا ہے۔

مولانا مودودی نے جو تحریک برپا کی اور اسلامی نظام کی تشریح و توضیح کے لئے

---

[1] رسائل و مسائل حصہ اول ص ۳۶۲، ۳۶۴۔ یہ مضمون دسمبر ۱۹۴۵ء کے ترجمان القرآن شائع ہوا تھا۔

اور غیر اسلامی افکار و نظریات پر تنقید و تبصرہ کے لئے جو لٹریچر تیار کیا اور تفہیم القرآن کے ذریعہ قرآن سے اُمت کو جوڑنے اور اُسے زندہ و متحرک کتاب الٰہی کی حیثیت سے پیش کرنے کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے وہ رہتی دُنیا تک فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

آج ساری دُنیا میں اسلامی انقلاب کی آمد آمد ہے۔ روس اور امریکہ سے مسلمان آنکھیں ملا کر بات کر رہے ہیں، اشتراکیت اور سرمایہ داری اپنے ہی وطن میں اجنبی ہوتی جا رہی ہے اور اسلام ایک تیسری طاقت کی حیثیت سے ابھر رہا ہے ان سب میں مولانا مودودی اور ان کی برپا کی ہوئی تحریک کی کوششوں کا دخل ہے اور اس حقیقت سے کوئی مؤرخ انکار نہیں کر سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے انسانوں میں مولانا مودودی نے ایک متحرک زندگی بخش ابر و ذراری ہے جس سے ملت بیضا کے مستقبل کا دامن وابستہ ہے۔

جماعت اسلامی اور علماء

علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں اسی وجہ سے مسلمان معاشرے میں ان کا جو مقام ہے اس سے کوئی تحریک اور جماعت صرف نظر نہیں کر سکتی۔ اگر علماء کسی تحریک کا ساتھ دیں تو اس کی کامیابی نسبتاً آسان ہو جاتی ہے اور اس کی دعوت کے نفوذ کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ چنانچہ جماعت اسلامی نے جہاں اُمت کے روشن خیال اور دانشور طبقہ کو متاثر کیا وہیں علماء کی ایک بڑی تعداد کو بھی اس نے اپنا ہمنوا بنایا۔ چنانچہ تشکیلِ جماعت اسلامی کے وقت جن علماء نے اس اجتماع میں شرکت کی ان میں سے مندرجہ ذیل حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

(۱) مولانا محمد منظور نعمانی، مدیر الفرقان لکھنؤ
(۲) مولانا صبغت اللہ بختیاری فاضل دیوبند دار الارشاد مدراس
(۳) مولانا محمد جعفر پھلواروی خطیب جامع مسجد کپورتھلہ
(۴) مولانا نذیر الحق میرٹھی
(۵) مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی
(۶) مولانا سید عبد العزیز شرقی جالندھری
(۷) مولانا محمد علی کاندھلوی سیالکوٹی
(۸) مولانا مولوی عبد القادر عاجز قصوری

(۹) مولانا مولوی محمد عبد اللہ روڑی حصار

(۱۰) مولانا شیخ محمد عبد اللہ ولتنا کیم (مدراس)

(۱۱) مولانا محمد الیاس ندوی گوندلوی

(۱۲) مولانا الٰہی بخش ڈیرہ جاٹرہ سرگودھوی

پہلے ہی اجلاس میں اتنے حق پرست علماء کا جمع ہو جانا اس بات کی علامت تھی کہ دعوت خالص دینی اور اسلامی بھی ہے اور وقت کی اہم ترین ضرورت بھی ہے۔ بعد میں علماء نے جماعت کی دعوت اور اس کے نصب العین کی تشریح و توضیح میں مضامین لکھے اور علمی انداز میں جماعت کا دفاع کیا۔ مدرستہ الاصلاح سرائے میر تو جماعت اسلامی کا مرکز ثانی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور اور دوسرے دینی مدارس میں بھی جماعت کے باقاعدہ حلقے قائم ہوئے۔ اساتذہ اور طلبہ نے جماعت کا لٹریچر پڑھنا شروع کیا اور صالح عنصر جماعت میں شامل ہوتا گیا۔

جماعت نے ابتدائی ایام میں جب ملک کو چار حلقوں میں تقسیم کیا اور اپنے دعوتی کام کا آغاز کیا تو ایک حلقے کے نائب امیر مولانا محمد منظور نعمانی، مدیر الفرقان کو مقرر کیا گیا تھا — دوسرے حلقے کے نائب امیر مولانا امین احسن اصلاحی تھے۔ تیسرے حلقے کے نائب امیر مولانا سید صبغت اللہ بختیاری تھے اور چوتھے حلقے کے نائب امیر مولانا محمد جعفر پھلواروی تھے اس طرح پورے ملک کی تنظیم کے اولین نائب امراء تمام مشہور علمائے کرام تھے

اسی طرح اولین مجلس شوریٰ جس کے ارکان کی تعداد ۱۶ تھی اس میں بھی آٹھ علماء کرام تھے۔ شروع ہی میں جماعت کی دعوت پر لبیک کہنے والوں میں مولانا ابو اللیث ندوی، مولانا صدر الدین اصلاحی، مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا عبد الغفار حسن مالیر کوٹلوی، مولانا اختر احسن اصلاحی مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا مفتی محمد یوسف، مولانا عبد الرحیم اشرف، مولانا محمد چراغ، مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل، مولانا فتح محمد راولپنڈی اور مولانا وصی مظہر ندوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی نے بعد میں ہندوستان کی تحریک اسلامی کی قیادت کی اور نہایت نازک حالات میں تحریک اقامت دین کا کام آگے بڑھایا — مولانا جلیل احسن ندویؒ نے راہِ عمل، زادِ راہ، سفینۂ نجات وغیرہ احادیث کے تربیتی مجموعے اکٹھا کیے اور فہم قرآن میں سند سمجھے گئے۔ مولانا اختر احسن اصلاحی نے مدرستہ الاصلاح کو

تحریک اسلامی کا مرکز ثانی بنا دیا، مولانا مسعود عالم ندوی نے جماعت کے لٹریچر کا عربی میں ترجمہ کر کے عالم عرب کو اس تحریک سے روشناس کرایا۔ اور عالم عرب کے مختلف جرائد میں نہایت فصیح و بلیغ زبان میں جماعت کا تعارف کرایا، دار العروبہ کی بنیاد آپ ہی نے رکھی۔ آپ کے ذریعہ ندوۃ العلماء کا ایک بڑا طبقہ تحریک اسلامی سے قریب ہوا۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے تحریر و تقریر، دورہ، تنظیم، شوریٰ ہر سطح پر امیر جماعت کا ساتھ دیا اور مولانا مودودی کے دست و بازو ثابت ہوئے۔ اسی طرح ۱۹۴۵ء میں ۲۲۴ حضرات نے جماعت کی رکنیت کی درخواستیں دیں جن میں سے ۶۰ سے زائد عربی مدارس کے اساتذہ طلبہ اور فارغ التحصیل علماء تھے۔

بعد میں اس تحریک میں جن علماء نے نمایاں حصہ لیا ان میں چند قابل ذکر یہ ہیں:

مولانا عبد العلیم اصلاحی، مولانا سید حامد علی، اڈیٹر کانتی، مولانا سلمان ندوی اڈیٹر الدعوہ، مولانا سید جلال الدین عمری، مولانا مظہر الحق مظاہری، مولانا محمد عزیر مظاہری، مولانا نظام الدین اصلاحی، مولانا سید احمد عروج قادری، مولانا عبد الحسیب اصلاحی مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا سید امین عمری سابق ناظم جامعہ دار السلام عمر آباد، مولانا محمد زکریا قدوسی مظاہری، مولانا عبد الرحمٰن عمری (ابو البیان حماد) مولانا محمد رفیق قاسمی، مولانا محمد امین الاثری، مولانا حبیب اللہ راپخوی قاسمی، مولانا محمد سلیمان قاسمی فرخ آبادی، مولانا حبیب اللہ قاسمی، مولانا ابو المجاہد زاہد (فارغ التحصیل مدرسہ عالیہ رامپور) مولانا محمد خلیل رحمانی، مولانا محمد یوسف اصلاحی، مولانا مطیع اللہ کوثر یزدانی ندوی، وغیرہ۔

اس طرح مخلص اور صالح علماء جماعت سے قریب آتے گئے اور تحریک اسلامی کا جزو لاینفک بنتے گئے۔ اور تحریک کا قافلہ آگے بڑھتا گیا۔

اقبالؒ اور مودودیؒ میں ہم آہنگی

ڈاکٹر اقبال اور سید مودودی کی تحریروں اور اقتباسات سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ دونوں ایک ہی فکر کے علمبردار اور ایک ہی نصب العین کے داعی تھے۔ دونوں کے خیالات و نظریات میں بڑی یکسانیت تھی، دونوں اشتراکیت، مغربی جمہوریت، سرمایہ داری، وطنیت اور دوسرے غیر اسلامی افکار و تحریکات سے بیزار تھے، تصوف پر کڑی تنقید دونوں کے یہاں پائی جاتی ہے، اقامت دین کا واضح تصور دونوں کے ہاں موجود ہے،

مسلمانوں کی عملی خرابیوں پر دونوں نے تنقید کی ہے، دونوں اس دور میں اسلام کے غلبہ و نفاذ کے لئے کوشاں تھے دونوں میں فرق صرف یہ تھا کہ ایک " لاکھ حکیم سر بجیب " اور دوسرا " ایک کلیم سر بکف " تھا۔ آیئے دیکھیں کہ دونوں کے ہاں کس قدر مطابقت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

وطنیت ـــــــ اسلام دشمن نظریہ

مولانا مودودی لکھتے ہیں :

" جس مسلمان نے بھی نیشنلزم کے شیطان سے بیعت کی ہے، اسلام کے فرشتوں سے اس کا رخصتی مصافحہ ہوگیا ہے ابھی حال میں ہندوستان کے ایک مسلمان شاعر نے ترانۂ وطن کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس میں وہ اپنی بھارت ماتا کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے :

جس کا پانی ہے امرت وہ مخزن ہے تو — جس کے دانے میں بجلی وہ خرمن ہے تو

جس کے کنکر ہیں ہیرے وہ معدن ہے تو — جس سے جنت ہے دنیا وہ گلشن ہے تو۔

دیویوں دیوتاؤں کا مسکن ہے تو

تجھ کو سجدوں سے کعبہ بنا دیں گے ہم

آخری بیت پڑھ کر اس امر میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ نیشنلزم اور اسلام بالکل الگ دو قطعی متضاد ذہنیتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان دونوں کا ایک جگہ جمع ہو جانا محالات میں سے ہے۔ درحقیقت نیشنلزم خود ایک مذہب ہے جو شرائع الٰہیہ کا مخالف ہے بلکہ عملی حیثیت سے بھی انسان کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے جنہیں شرائع اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہیں۔[1]

ڈاکٹر اقبال نے اس پورے تصور کو ایک شعر میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے "

اس کے برعکس اسلامی قومیت کا مفہوم کیا ہے اسے مولانا مودودی کی زبانی سنئے

---

[1] مسئلہ قومیت ص ۱۲۳

"یہاں قومیت کی بنیاد نسل و وطن کے بجائے اعتقاد و عمل پر رکھی گئی ہے۔ تمام دُنیا کے مسلمان ہر جنسی امتیاز کے بغیر ایک دوسرے کے شریک حال اور معاون ہیں۔ ایک ہندی مسلمان مصر کا ویسا ہی وفادار شہری بن سکتا ہے جیسا کہ وہ خود ہندوستان کا ہے۔ ایک افغانی مسلمان شام کی حفاظت کے لئے اسی جانبازی کے ساتھ لڑ سکتا ہے جس کے ساتھ وہ خود افغانستان کے لئے لڑتا ہے۔ اس لئے ایک ملک کے مسلمان اور دوسرے ملک کے مسلمان میں جغرافی یا نسلی تفریق کی کوئی وجہ نہیں ہے اس معاملہ میں اسلام کے اصول اور مغرب کے اصول ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں جو وہاں سببِ قوت ہے وہ یہاں عین سبب ضعف ہے اور جو یہاں مایۂ حیات ہے وہ وہاں بعینہ سمِ قاتل ہے[1]

اقبال نے اسی حقیقت کو کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

اپنی ملّت کو قیاس اقوامِ مغرب پر نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

جمہوریت یا استبداد

مولانا مودودی مغربی جمہوریت کا پول کھولتے ہوئے لکھتے ہیں:

"موجودہ تہذیب میں جمہوریت کے معنیٰ ہیں جمہور کی حاکمیت یعنی ایک علاقہ کے لوگوں کی مجموعی خواہش کا اپنے علاقے میں مختار مطلق ہونا اور ان کا قانون کے تابع نہ ہونا بلکہ قانون کا ان کی خواہش کا تابع ہونا اور حکومت کی غرض صرف یہ ہو کہ اس کا نظم اور اس کی طاقت لوگوں کی اجتماعی خواہشات کو پورا کرنے کے کام آتے۔ اب غور کیجئے کہ پہلے تو لادینی نے ان لوگوں کو خدا کے خوف اور اخلاق کے مستقل اصولوں کی گرفت سے آزاد بے لگام اور غیر ذمہ دار اور بندہ نفس بنا دیا، پھر قوم پرستی نے ان کو شدید قسم کی قومی خود غرضی، اور اندھی عصبیت اور قومی غرور کے نشے سے بدمست کر دیا اور اب یہ جمہوریت ان ہی بے لگام بدمست

---

[1] مسئلہ قومیت ص ۴۰

بندگانِ نفس کی خواہشات کو قانون سازی کے مکمل اختیارات دیتی ہے اور حکومت کا واحد مقصد یہ قرار دیتی ہے کہ اس کی طاقت ہر اس چیز کے حصول میں صرف ہو جس کی یہ اجتماعی طور پر خواہش کریں۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح کی خود مختار صاحبِ حاکمیت قوم کا حال ایک طاقت ور اور آزاد بدمعاش کے حال سے کس بات میں مختلف ہے؟ جو کچھ ایک بدمعاش فرد خود مختار اور طاقت ور ہو کر چھوٹے پیمانہ پر کرے گا وہی تو اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر اسی طرح کی ایک قوم کرے گی پھر جب دنیا میں صرف ایک ہی قوم ایسی نہ ہو بلکہ ساری متمدن قومیں اسی ڈھنگ پر بے دینی قوم پرستی اور جمہوریت کے اصولوں پر منظم ہوں تو دنیا بھیڑیوں کا میدانِ جنگ نہ بنے گی تو اور کیا بنے گی۔"

اسی حقیقت کو ڈاکٹر اقبال نے اس طرح بیان کیا تھا ؎

تم نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری

اشتراکی مساوات یا فریبِ نظر

اشتراکیت کے نفاذ سے روسی عوام کو کیا ملا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں:

"اجتماعی نظم و نسق اور اجتماعی منصوبہ بندی کو رائج کرنے کے لئے جان و مال اور مذہب و اخلاق اور انسانیت کی جو کٹھن بربادی روس کو برداشت کرنی پڑی، وہ تو گویا اس تجربے کے آغاز کی لاگت تھی مگر اب روبعمل آجانے کے بعد روزمرہ کی زندگی میں وہ اہلِ روس کو کیا دے رہا ہے اور ان سے لے کیا رہا ہے؟ اس کا بھی موازنہ کر دیکھئے۔ وہ جو کچھ انہیں دیتا ہے وہ یہ ہے کہ،

ہر شخص کے لئے کم از کم اتنے روزگار کا انتظام ہو گیا ہے جس سے وہ دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو جگہ پا سکے اور

اجتماعی طور پر اس امر کا بھی انتظام ہو گیا ہے کہ بُرے وقت پر آدمی کو سہارا مل سکے

بس یہی دو اصل فائدے ہیں جو اس نئے نظام نے باشندگان ملک کو دیئے۔ اب دیکھئے کہ اس نے لیا کیا۔

انفرادی ملکیت کے بجائے اجتماعی ملکیت کا نظام قائم کرنے کے لئے ناگزیر تھا کہ یہ کام وہی پارٹی اپنے ہاتھ میں لے جو اس نظریہ کو لے کر اٹھی تھی یعنی کمیونسٹ پارٹی۔ اس پارٹی کا نظریہ خود بھی یہ تھا اور خود اس کام کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ایک زبردست ڈکٹیٹرشپ قائم ہو جو پورے زور کے ساتھ انفرادی ملکیت کے نظام کو توڑ دے اور سخت ہاتھوں میں نئے نظام کو رائج کر دے۔ چنانچہ یہ ڈکٹیٹرشپ قائم ہو گئی اور اس کو کارکنوں کی ڈکٹیٹرشپ کا نام دیا گیا، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ روس کے مزدوروں اور کاشتکاروں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کے کارکنوں کی ساری آبادی کمیونسٹ پارٹی میں شامل نہیں ہے شاید اس آبادی کے پانچ فیصدی لوگ بھی پارٹی کے ممبر نہ ہوں گے۔ پس ظاہر میں تو نام یہ ہے کہ یہ مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ ہے مگر حقیقت میں یہ مزدوروں پر کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ ہے۔ اور یہ ڈکٹیٹرشپ بھی کچھ ہلکی پھلکی سی نہیں ہے۔ اجتماعی ملکیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ ملک کے تمام زمیندار ختم کر دیئے گئے اور ایک وحدہٗ لاشریک زمیندار سارے ملک کی زمین کا مالک ہو گیا۔ سارے کارخانہ دار اور تجار اور مستاجر بھی ختم ہو گئے اور ان سب کی جگہ ایک ایسے سرمایہ دار نے لے لی جو ذرائع پیداوار کی ہر قسم اور ہر صورت پر قابض ہو گیا اور پھر اسی کے ہاتھ میں سارے ملک کی سیاسی طاقت بھی مرکوز ہو گئی یہ ہے کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ .....

اس نے جاسوسی کا ایک وسیع نظام قائم کر رکھا ہے جس کے بے شمار کارکن ہر ادارے ہر گھر اور ہر مجمع میں رجعت پسندوں کو سونگھتے پھرتے ہیں۔ اس جاسوسی کے پراسرار جال نے شوہروں اور بیویوں تک کے درمیان شک و شبہ کی دیوار حائل کر دی ہے۔ حتیٰ کہ ماں باپ کے خلاف خود ان کی اولاد تک سے جاسوسی کی خدمت لینے میں دریغ نہیں کیا گیا ہے۔ روس کی پولیس سی آئی ڈی کا محتاط نظریہ یہ ہے کہ اگر بھول چوک سے چند سو یا چند ہزار آدمی پکڑے اور مارڈالے جائیں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ چند گنہگار چھوٹ جائیں اور ان کے ہاتھوں سے جوابی انقلاب برپا ہو جائے۔ اسی لئے وہ ہر فیکٹری، ہر دوکان، ہر دفتر اور ہر ادارے میں دیکھتے رہتے ہیں کہ کون سا مزدور یا کارکن ملک کے یا خود اپنے ادارے کے انتظام پر ناک بھوں چڑھاتا ہے یا کسی قسم کی بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہے، اس طرح کا

کوئی فعل کرنا تو در کنار جس پر شبہ ہو جائے کہ وہ ایسے جراثیم رکھتا ہے وہ بھی اچانک گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ آئے دن کا معمول ہے اس لئے جب کوئی کارکن گھر نہیں پہنچتا تو اس کی بیوی خود ہی سمجھ جاتی ہے کہ پکڑا گیا۔ دوسرے دن وہ اس کی ضرورت کی چیزیں آپ ہی آپ پولیس کے دفتر میں پہنچانا شروع کر دیتی ہے اور ان کا قبول کر لیا جانا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ اس کا قیاس صحیح تھا۔ وہ کوئی سوال کرے تو اسے دفتر کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملتا ایک روز یکایک ایسا ہوتا ہے کہ اس کا بھیجا ہوا پارسل واپس آ جاتا ہے، بس یہی اس امر کی اطلاع ہے کہ اس کا خاوند لینن کو پیارا ہوا۔ اب اگر وہ نیک بخت خود بھی اس انجام سے دوچار ہونا نہ چاہتی ہو تو اس کا فرض ہے کہ ایک اچھی کامریڈنی کی طرح اس معاملہ کی بھاپ تک منہ سے نہ نکالے اور دوسرا کوئی ایسا خاوند ڈھونڈھ لے جو رجعت پسندی کے شبہ سے بالاتر ہو۔

یہ ہے وہ قیمت جو دو وقت کی روٹی اور بڑے وقت کی دستگیری کے لئے اشتراکی روس کے باشندوں کو ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ کیا واقعی اس قیمت پر یہ سودا سستا ہے؟ بلاشبہ ایک فاقہ کش آدمی بسا اوقات بھوک کی شدت سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ جیل کی زندگی کو اپنی مصیبت بھری آزادی پر ترجیح دینے لگتا ہے صرف اس لئے کہ وہاں کم از کم دو وقت کی روٹی، تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو جگہ تو نصیب ہوگی مگر کیا اب پوری نوع انسانی کے لئے فی الواقع یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ اسے روٹی اور آزادی دونوں ایک ساتھ نہیں مل سکتیں؟ کیا روٹی ملنے کی اب یہی ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ ساری روئے زمین ایک جیل خانہ ہو، اور چند کامریڈ اس کے جیلر اور وارڈر ہوں؟[1]

ڈاکٹر اقبال نے اس پورے تبصرہ کو ایک شعر میں سمیٹ دیا تھا ؎

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

ایک دوسری جگہ اس پورے نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ؎

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو تو کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

---

۱ سود حصہ دوم ص: ۱۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۷

تعلیم کی ترویج یا الحاد کی تبلیغ

مغربی نظام تعلیم اور اس کے اثرات و نتائج پر گفت گو کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

"ہماری قوم کے نوجوان انگریزی تعلیم اور فرنگی تہذیب سے استفادہ کرنے کے لئے مدرسوں اور کالجوں میں بھی بھیجے گئے۔ اسلامی تعلیم سے کورے، اسلامی تہذیب میں خام انگریزی حکومت سے مرعوب، فرنگی تہذیب کی شان و شوکت پر فریفتہ پہلے ہی سے تھے اب جو انہوں نے انگریزی مدرسے کی فضا میں قدم رکھا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ان کی ذہنیت کا سانچہ بدلا اور ان کی طبیعت کا رخ مذہب سے پھر گیا کیونکہ اس کی آب و ہوا کی اوّلین تاثیر یہ تھی کہ یورپ کے کسی مصنف یا محقق کے نام سے جو چیز پیش کی جائے اس پر وہ بے تامل آمنا و صدقنا کہیں اور قرآن و حدیث یا ائمہ دین کی طرف سے کوئی بات پیش ہو تو اس پر دلیل کا مطالبہ کریں۔ اس منقلب ذہنیت کے ساتھ انہوں نے جن مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی ان کے اصول و فروع اکثر و بیشتر اسلام کے اصول اور جزئیات احکام کے خلاف تھے۔ اسلام میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے اور مغرب میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ محض شخصی اعتقاد ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ ہے اور وہاں سرے سے اللہ کا وجود ہی مسلم نہیں۔ اسلام کا پورا نظام تہذیب وحی و رسالت کے اعتقاد پر قائم ہے اور وہاں وحی کی حقیقت ہی میں شک اور رسالت کے منجانب اللہ ہونے میں شبہ ہے۔ اسلام میں آخرت کا اعتقاد پورے نظام اخلاق کا سنگ بنیاد ہے اور وہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے۔ اسلام میں جو عبادات اور اعمال فرض ہیں وہاں وہ محض عہد جاہلیت کے رسوم ہیں جن کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح اسلام کے اصولِ تہذیب و تمدن بھی مغربی تہذیب و تمدن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں۔ قانون میں اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خود خدا واضع قانون ہے اور قوم لیجسلیچر کو منتخب کرنے والی ہے۔ سیاسیات میں اسلام کا مطمح نظر حکومت الٰہی ہے اور مغرب کا مطمح نظر حکومت قومی۔ اسلام کا رخ بین الاقوامیت (INTERNATIONALISM) کی طرف ہے اور مغرب کا کعبۂ مقصود قومیت (NATIONALISM) ہے معاشیات میں اسلام اکل حلال اور زکوٰۃ و صدقہ اور تحریم سود پر زور دیتا ہے اور مغرب کا سارا

نظام معاشی ہی سود اور منافع پر چل رہا ہے۔ اخلاقیات میں اسلام کے پیش نظر آخرت کی کامیابی ہے اور مغرب کے پیش نظر دنیا کا فائدہ، اجتماعی مسائل میں بھی اسلام کا راستہ قریب قریب ہر معاملہ میں مغرب کے راستہ سے مختلف ہے۔ ستر و حجاب، حُدود زن و مرد تعدد ازدواج، قوانین نکاح و طلاق، ضبطِ ولادت، حقوق ذوی الارحام، حقوق زوجین اور ایسے ہی دوسرے بہت سے معاملات ہیں جن میں ان دونوں کا اختلاف اتنا نمایاں ہے کہ بیان کی حاجت نہیں اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے اصول مختلف ہیں ہمارے نوجوانوں نے مرعوب بلکہ غلامانہ ذہنیت اور پھر غیر ملکی اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ جب ان مغربی علوم کی تحصیل کی اور مغربی تہذیب کے زیر اثر تربیت پائی تو نتیجہ جو کچھ ہونا چاہیئے تھا وہی ہوا۔ ان میں تنقید کی صلاحیت پیدا نہ ہو سکی۔ انہوں نے مغرب سے جو کچھ سیکھا اس کو صحت اور درستی کا معیار سمجھ لیا، پھر ناقص علم کے ساتھ اسلام کے اصول و قوانین کو اس معیار پر جانچ کر دیکھا اور جس مسئلہ میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا اس میں کبھی مغرب کی غلطی محسوس نہ کی بلکہ اسلام ہی کو بر سرِ غلط سمجھا اور اس کے اصول و قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

جدید تعلیم نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی فائدہ پہنچایا ہو مگر ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کسی فائدے سے نہیں ہو سکتی۔[1]

ایک دوسری جگہ اہل مغرب کی اس پالیسی پر یوں تنقید کی :

" انہوں نے اپنی تعلیم ہم پر مسلط کی اور اس طرح مسلط کی کہ رزق کی کنجیاں ہی لے کر اپنی تعلیم گاہوں کے دروازوں پر لٹکا دیں، جس کے معنی یہ تھے کہ اب یہاں رزق وہی پائے گا جو یہ تعلیم حاصل کرے گا۔ اس دباؤ میں آکر ہماری ہر نسل کے بعد دوسری نسل پہلے سے بڑھ چڑھ کر ان تعلیم گاہوں کی طرف گئی اور وہاں وہ سارے ہی نظریات اور عملیات سیکھے جن کی روح اور شکل بالکل ہماری تہذیب کی ضد تھی۔ اگرچہ کھلا کافر تو وہ ہم میں سے ایک فی لاکھ کو بھی نہ بنا سکے، مگر فکر و نظر اور ذوق و وجدان اور سیرت و کردار میں

---

[1] تنقیحات ص ۲۹ تا ۳۱

ٹھیٹھ مسلمان انہوں نے شاید دو فی صد کو بھی نہ رہنے دیا۔ یہ سب سے بڑا نقصان تھا جو انہوں نے ہم کو پہنچایا کیونکہ اس نے ہمارے دلوں اور دماغوں میں ہماری تہذیب کی جڑوں ہی کو خشک کر دیا اور ایک دوسری مخالف تہذیب کی جڑیں ان میں پیوست کر دیں[1]۔

ڈاکٹر اقبال نے اس پورے نظام تعلیم پر بڑا جامع تبصرہ کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں ؎

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں ؎

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

تصوف یا رہبانیت

مولانا مودودی نے عجمی تصوف پر بھرپور وار کیا اور اس کی خرابیاں طشت ازبام کیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جاہلیت راہبانہ نے علماء، مشائخ، زہاد اور پاکباز لوگوں پر حملہ کیا اور ان میں وہ خرابیاں پھیلانا شروع کیں جن کی طرف میں اس سے پہلے اشارہ کر آیا ہوں۔ اسی جاہلیت کے اثر سے اشراقی فلسفہ، راہبانہ اخلاقیات اور زندگی کے ہر مرحلہ میں مایوسانہ نقطۂ نظر مسلم سوسائٹی میں پھیلا اور اس نے نہ صرف یہ کہ ادبیات اور علوم کو متاثر کیا بلکہ فی الواقع سوسائٹی کے اچھے عناصر کو مارفیا کا انجکشن دے کر سست کر دیا۔ بادشاہی کے جاہلی نظام کو مضبوط کیا۔ اسلامی علوم و فنون میں جمود اور تنگ خیالی پیدا کی اور ساری دینداری کو چند خاص مذہبی اعمال میں محدود کر کے رکھ دیا[2]"

ایک دوسرے مقام پر متصوفین اور ارباب خانقاہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

---

[1] اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات۔ ص ۴۵۳، ۴۵۲

[2] تجدید و احیائے دین۔ ص: ۳۹

"جو لوگ اپنی آنکھوں سے خدا کے دین کو کفر سے مغلوب دیکھیں۔ جن کے سامنے حدود اللہ پامال ہی نہیں بلکہ کالعدم کر دی جائیں، خدا کا قانون عملاً ہی نہیں بلکہ باضابطہ منسوخ کر دیا جائے، خدا کی زمین پر خدا کا نہیں بلکہ اس کے باغیوں کا بول بالا ہو رہا ہو، نظام کفر کے تسلط سے نہ صرف عام انسانی سوسائٹی میں اخلاقی و تمدنی فساد برپا ہو بلکہ خود اُمتِ مُسلمہ بھی نہایت سُرعت کے ساتھ اخلاقی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو رہی ہو اور یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ان کے دلوں میں نہ کوئی بے چینی پیدا ہو، نہ اس حالت کو بدلنے کے لئے کوئی جذبہ بھڑکے بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے نفس کو اور عام مسلمانوں کو غیر اسلامی نظام کے غلبہ پر اصولاً و عملاً مطمئن کر دیں، ان کا شمار آخر محسنین میں کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس جرم عظیم کے ساتھ محض یہ بات انہیں احسان کے مقام عالی پر کیسے سرفراز کر سکتی ہے کہ وہ کیسے چاشت اور اشراق اور تہجد کے نوافل پڑھتے رہے، ذکر و شغل اور مراقبے کرتے رہے، حدیث و قرآن کے درس دیتے رہے، جزئیات فقہ کی پابندی اور چھوٹی چھوٹی سنتوں کے اتباع کا سخت اہتمام فرماتے رہے اور تزکیۂ نفس کی خانقاہوں میں دینداری کا وہ فن سکھاتے رہے جس میں حدیث و فقہ اور تصوف کی باریکیاں تو ساری موجود تھیں مگر ایک نہ تھی تو وہ حقیقی دینداری جو "سر داد نداد دست در دست یزید"، کی کیفیت پیدا کرے اور " بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا" کے مقام وفاداری پر پہنچا دے[۱]"

اقبال ان نکات کو دیکھئے کس طرح ادا کرتے ہیں ؎

یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور ۔ تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

—×—

مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

ابلیس کی زبان سے کہلواتے ہیں ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

---

[۱] اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات، ص ۳۰۲، ۳۰۳

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

گفتگو طویل ہوتی جا رہی ہے۔ ان اقتباسات اور اشعار سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ڈاکٹر اقبال کے یہاں مکمل فکری ہم آہنگی اور نظریاتی یکسانیت تھی اور دونوں ایک ہی پیغام کے علمبردار اور اقامتِ دین کے لئے کوشاں تھے، علامہ اقبالؒ نے فکری دنیا میں راہ ہموار کی اور مولانا مودودیؒ نے فکری محاذ کے ساتھ عملی محاذ کو بھی سنبھالا اور باقاعدہ وہ جماعت قائم کی اور ایسے افراد کی تنظیم و تربیت کی جو اقامت دین کے لئے جدوجہد کر سکیں۔ اب یہ فیصلہ تمام انسانوں کو کرنا ہے کہ انہیں شہادت حق اور اقامتِ دین کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے کیا کرنا چاہیئے تاکہ آخرت میں کامیابی حاصل کر سکیں اور اللہ کی رضا سے بہرہ مند ہو سکیں۔

کتابیات

BIBLOGRAPHY

اُردو

(الف)

(۱) آب کوثر، شیخ محمد اکرام، فیروز سنز لاہور ۱۹۵۲ء

(۲) احیائے اسلام کا بحران، نیا دور، اعجاز احمد فاروقی

(۳) افکار شاہ ولی اللہ، قاضی جاوید، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۰ء

(۴) الفرقان، مجدد الفِ ثانی نمبر، مولانا محمد منظور نعمانی

(۵) الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، مولانا محمد منظور نعمانی بریلی ۱۹۴۱ء

(۶) امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف، مولانا عبید اللہ سندھی، مکتبہ الفرقان، بریلی، یوپی۔

(۷) اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ، اُردو ترجمہ مولانا صدر الدین اصلاحی، مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رامپور ۱۹۵۲ء

(۸) آثار الصنادید، سر سید احمد خاں، چوتھا ایڈیشن ۱۹۶۵ء

(۹) ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، مفتی انتظام اللہ شہابی، مکتبہ ادب اُردو بازار دہلی

(۱۰) الجمعیۃ، روزنامہ دہلی

(۱۱) اسیر مالٹا، مولانا حسین احمد مدنی، راشد کمپنی دیوبند

(۱۲) اسلامی سیاست، مولانا مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، جنوری ۱۹۷۹ء

(۱۳) اسباب بغاوت ہند، سر سید احمد خاں، ایڈیشن دوم، مقدمہ فوق کریمی ۱۹۷۱ء

(۱۴) آثار جمال الدین افغانی، مولفہ محمد عبد الغفار، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۴۰ء

(۱۵) انقلابی دور کا تیسرا امیر، عبد الصمد رحمانی

(۱۶) اسلام اور عصر جدید، ضیاء الحسن فاروقی، جامعہ نگر نئی دہلی

(۱۷) ابو الکلام آزاد ـــــ فکر و فن، ملک زادہ منظور احمد، طبع دوم ۱۹۷۸ء

(۱۸) افکار آزاد، محمد عثمان فارقلیط، مکتبہ آزاد لاہور ۱۹۴۵ء

(۱۹) اشرف السوانح، خواجہ عزیز الحسن مجذوب، طبع اول، ثناء اللہ خاں اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۰ء

(۲۰) اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور

(۲۱) آثار رحمت، اشرف علی تھانوی

(۲۲) افادات اشرفیہ در رسائل سیاسیہ، اشرف علی تھانوی

(۲۳) ایک اہم دینی تحریک، سید ابوالحسن ندوی، مکتبہ اسلام گوئن روڈ، لکھنؤ

(۲۴) اقبال، دارالاسلام اور مودودی، سید اسعد گیلانی

(۲۵) اقبال نامہ، جلد اول و دوم، شیخ عطاء اللہ، شیخ محمد اشرف لاہور۔

(۲۶) اوراق گم گشتہ، رحیم بخش شاہین،

(۲۷) اسلام کا سرچشمۂ قوت، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۷۴ء

(۲۸) الجہاد فی الاسلام، سید ابوالاعلیٰ مودودی، نومبر ۱۹۷۹ء

(۲۹) اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۱ء

(۳۰) انتخاب الہلال، حمید برادرز بل روڈ، لاہور ۱۹۵۸ء

(۳۱) المنار، جمعیۃ الطلبہ جامعہ سلفیہ بنارس کا سالانہ میگزین

(۳۲) ارشادات و مکتوبات، مولانا محمد الیاس، مرتبہ افتخار زیدی، عرشی پبلی کیشنز دہلی ۱۹۸۰ء

(۳۳) ارمغان علی گڑھ، خلیق احمد نظامی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۴ء

(ب)

(۱) بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء

(۲) باغی ہندوستان، مولانا فضل حق خیرآبادی، ترجمہ عبدالشاہد خاں شیروانی، طبع اول ۱۹۴۷ء، مدینہ بک ڈپو بجنور

(۳) بیس بڑے مسلمان، عبدالرشید ارشد، مکتبہ رشیدیہ لاہور، بار اوّل ۱۹۶۹ء

(پ)

(۱) پیغام کلکتہ، مولانا شبیر احمد عثمانی، ہاشمی بک ڈپو لاہور

(۲) پیام ندوۃ العلماء، سید محمد حسنی

(۳) پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، سید سبط حسن

(ت)

(۱) تمدن ہند پر اسلامی اثرات، ڈاکٹر تاراچند، اردو ترجمہ محمد مسعود احمد

(۲) تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول و سوم، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ۔

(۳) ترجمان القرآن، ماہنامہ، سید ابوالاعلیٰ مودودی،

(۴) تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، سید احمد قادری، شاد بکڈپو پٹنہ ۶، ۱۳۷۰ھ

(۵) تاریخ مشائخ چشت، خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۳ء

(۶) تذکرہ مجدد الف ثانی، مولانا محمد منظور نعمانی، مکتبہ الفرقان، لکھنؤ، ۱۹۷۰ء

(۷) تجدید و احیائے دین، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، اگست ۱۹۷۴ء

(۸) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ڈاکٹر محمد اقبال، اردو ترجمہ سید نذیر نیازی، بزم اقبال لاہور، ۱۹۵۸ء

(۹) تذکرہ، ابوالکلام آزاد، مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی ۱۹۶۸ء

(۱۰) تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ، مولانا مناظر احسن گیلانی، طبع سوم، نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۵۹ء

(۱۱) تحریک مجاہدین کا انقلابی پہلو، سید اسعد گیلانی، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور ۱۹۵۷ء

(۱۲) تاریخ ہندوستان، مولوی ذکاء اللہ دہلوی

(۱۳) تذکرہ شیخ الہند، مفتی عزیز الرحمن بجنوری، مدنی دارالتالیف بجنور، اگست ۱۹۶۵ء۔

(۱۴) تحریک ریشمی رومال، مولانا عبدالرحمن صاحب، طبع دوم، لاہور، ۱۹۶۶ء

(۱۵) تحریک خلافت، قاضی عدیل عباسی، ترقی اردو بورڈ دہلی ۱۹۷۸ء

(۱۶) تذکرہ عنایت اللہ خاں مشرقی، اول و دوم، تذکرہ پبلی کیشنز المشرقی ہاؤس، اچھرہ لاہور، ۱۹۸۰ء

(۱۷) تراجم علمائے حدیث ہند، امام خاں ابو یحییٰ نوشہروی ۱۳۵۶ھ، جید برقی پریس دہلی۔

(۱۸) تاریخ التعلیم، جسٹس سید محمود

(۱۹) تہذیب الاخلاق، سرسید احمد خاں

(۲۰) تفسیر القرآن جلد اول، سرسید احمد خاں، رفاہ عام پریس لاہور

(۲۱) تدبر قرآن، جلد اول، مولانا امین احسن اصلاحی، دارالاشاعۃ الاسلامیہ لاہور، ستمبر ۱۹۶۷ء

(۲۲) تجویز دارالعلوم ندوۃ العلماء

(۲۳) تعلیمات، مولانا مودودیؒ، مکتبہ جماعت اسلامی رامپور، ایڈیشن سوم ۱۹۵۶ء

(۲۴) ترجمہ قرآن مجید کا مقدمہ، امین احسن اصلاحی، مکتبہ الحسنات رامپور، اگست ۱۹۶۷ء

(۲۵) تفسیر نظام القرآن، حمید الدین فراہی، اردو ترجمہ امین احسن اصلاحی، دائرہ حمیدیہ
سرائے میر اعظم گڑھ

(۲۶) تذکرہ، ابوالکلام آزاد، مرتبہ فضل الدین احمد، انارکلی کتاب گھر، لاہور

(۲۷) تحریک آزادئ ہند اور مسلمان، سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹیڈ لاہور ۱۹۶۹ء

(۲۸) تفہیمات جلد اول، بار دوم، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، جنوری ۱۹۷۹ء

(۲۹) تحریک اسلامی — شاہ ولی اللہ سے علامہ اقبال تک۔ پروفیسر خورشید احمد،
ادارہ مطبوعات طلبہ لاہور، طبع سوم اگست ۱۹۸۱ء

(۳۰) تجلیات عثمانی، انوار الحسن شیرکوٹی، ادارہ نشر المعارف چھلیک، ملتان دسمبر ۱۹۵۷ء

(۳۱) تاریخ جماعت اسلامی، اسعد گیلانی، اسلامی اکادمی اردو بازار لاہور،

(۳۲) تنقیحات، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، جنوری ۱۹۸۱ء

(۳۳) تحریک اسلامی ہند، مولانا صدر الدین اصلاحی، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی مئی ۱۹۷۰ء

(۳۴) تحریک شیخ الہند، انگریزی سرکار کی زبان، سید محمد میاں، الجمعیۃ بکڈپو دہلی ۱۹۷۵ء

(ج)

(۱) جدید ہندوستان کے معمار — سید احمد خاں، خلیق احمد نظامی، ترجمہ اصغر عباس، ۱۹۷۱ء
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن نئی دہلی

(۲) جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، خورشید مصطفیٰ رضوی، طبع اول مکتبہ برہان اردو بازار
جامع مسجد دہلی ۱۹۵۹ء

(۳) جماعت مجاہدین، غلام رسول مہر، کتاب منزل کشمیری بازار، لاہور، ۱۹۵۵ء

(۴) جدید دنیائے اسلام، ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ، اردو ترجمہ، جمیل الدین بدایونی علیگ
عثمانی پریس بدایوں۔

(۵) جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، محمد ایوب قادری، پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۷۶ء

(۶) جامعۃ الرشاد ماہنامہ، اعظم گڈھ، مولانا مجیب اللہ ندوی،

(چ)

(۱) چراغ راہ، کراچی کا نظریۂ پاکستان نمبر، اڈیٹر خورشید احمد، ۱۹۶۰ء

(۲) چند ہم عصر، مولوی عبدالحق، اردو اکیڈمی، سندھ کراچی۔ ۱۹۵۹ء

(ح)

(۱) حضرت مجدد الف ثانی کے سیاسی مکتوبات، آباد شاہ پوری، مکتبہ چراغ اسلام لاہور، ستمبر ۱۹۷۰ء

(۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۳ء

(۳) حضرت مجدد الف ثانی، مولانا سید زوّار حسین شاہ، طبع دوم ادارہ مجددیہ کراچی ۱۹۷۵ء

(۴) حیات ولی، مولانا رحیم بخش شاہین، المکتبۃ السلفیہ لاہور، ۱۹۵۵ء

(۵) حیات جاوید، الطاف حسین حالی، اکاڈمی پنجاب، ادبی دنیا منزل لاہور، فروری ۱۹۵۷ء

(۶) حیات امداد، انوار الحسن شیرکوٹی، طبع اوّل، مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی ۱۹۶۵ء

(۷) حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء

(۸) حیات اکبر الہ آبادی، ملا واحدی

(۹) حکیم الامت — نقوش و تاثرات، عبدالماجد دریابادی معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء

(۱۰) حرف اقبال، ڈاکٹر اقبال

(۱۱) حیات انور، سید محمد ازہر شاہ، قیصر شاہ منزل دیوبند ۱۹۵۵ء

(خ)

(۱) خطبات، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ۱۹۷۰ء مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

(۲) خطبات اقبال

(۳) خطبات آزاد، مرتبہ شورش کاشمیری، مکتبہ شعر و ادب لاہور ۱۹۴۴ء

(۴) خطبات آزاد، مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادیمی نئی دہلی

(۵) خاکسار تحریک — مذہب و سیاست کی روشنی میں، مولانا محمد منظور نعمانی

(۶) خطوط مشاہیر عبدالماجد دریابادی، نسیم بکڈپو لکھنؤ، طبع دوم ۱۹۶۹ء

(۷) خطبہ صدارت انڈین نیشنل کانگریس اجلاس جے پور، ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیہ

(۸) خواجہ غریب نواز، شبیر حسن چشتی نظامی، آستانہ بکڈپو دہلی

(د)

(۱) دین الٰہی اور اس کا پس منظر، پروفیسر محمد اسلم، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۹ء

(۲) دعوت اسلام، آرنلڈ، اُردو ترجمہ مولوی عنایت اللہ دہلوی، محکمہ اوقاف لاہور ۱۹۷۲ء

(ر)

(۱) رسالہ بُرہان دہلی

(۲) روزنامہ الجمعیۃ دہلی

(۳) رسالہ احکام طعام اہل کتاب، سرسید احمد خاں

(۴) روداد اجلاس ششم ندوۃ العلماء

(۵) روزنامہ زمیندار، ظفر علی خاں

(۶) روداد جماعت اسلامی حصہ اول، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی، جولائی ۱۹۶۷ء

(۷) روداد جماعت اسلامی حصہ سوم، بار اول اکتوبر ۱۹۶۶ء، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی

(۸) رسائل و مسائل حصہ اول، مولانا مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

(۹) رود کوثر، شیخ محمد اکرام، فیروز سنز لاہور، ۱۹۵۸ء

(۱۰) رباعیات سرمد، ابوالکلام آزاد،

(س)

(۱) سب سے پہلا دستور جماعت اسلامی ۱۹۴۱ء

(۲) سخنہائے گفتنی، کلیم الدین، فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۵ء

(۳) سیرت النبی جلد اول، شبلی نعمانی، طبع پنجم دار المصنفین اعظم گڈھ

(۴) سید مودودی کا عہد، سید نقی علی، مکتبہ ذکری رامپور

(۵) سیرت مولانا محمد علی مونگیری، سید محمد حسنی، مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۹۶۴ء

(۶) سوانح قاسمی، مولانا مناظر احسن گیلانی، طبع اول، دار العلوم دیوبند ۱۳۷۳ھ

(۷) سہ ماہی روشن، شمس بدایونی، روشن محل سوتھ بدایوں، یوپی، مارچ ۱۹۸۳ء

(۸) سیرت محمد علی اول و دوم، رئیس احمد جعفری

(۹) سرگزشت مجاہدین، غلام رسول مہر، کتاب منزل لاہور ۱۹۵۶ء

(۱۰) سید احمد شہید، غلام رسول مہر، اول و دوم ۱۹۵۲ء

(۱۱) سیرت سید احمد شہید، ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ ۱۹۶۸ء

(۱۲) سوانح خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، وحید احمد مسعود، سلمان اکیڈمی کراچی

(۱۳) سکھ مسلم تاریخ حقیقت کے آئینے میں، ابوالامان امرتسری، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۵۸ء

(۱۴) سلاطین دہلی کے مذہبی رُجحانات، خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۵۸ء

(۱۵) سن ستاون کے مجاہد، غلام رسول مہر، ۱۹۵۷ء کتاب منزل لاہور،

(ش)

(۱) شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفۂ عمرانیات و معاشیات، شیخ بشیر احمد بی، اے مکتبہ بیت الحکمۃ لاہور، ۱۹۴۵ء

(۲) شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات، خلیق احمد نظامی، طبع اول، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۵۰ء

(۳) شیخ الہند مولانا محمود حسن — حیات اور علمی کارنامے، اقبال حسین خاں، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۷۳ء

(۴) شیدائے قرآن مولانا اختر احسن اصلاحی، عنایت اللہ سُبحانی، مکتبہ ذکری رامپور

(ص)

(۱) صدق جدید لکھنؤ، اڈیٹر عبدالماجد دریابادی

(ع)

(۱) علم الکلام جلد اوّل، مولانا شبلی نعمانی

(۲) عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید، اُردو ترجمہ ساجد الرحمٰن صدیقی، قرآن محل کراچی، ۱۳۷۹ھ

(۳) عروج سلطنت انگلشیہ، منشی ذکاء اللہ

(۴) علمائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں، مفتی انتظام اللہ شہابی، اُردو بازار دہلی

(۵) علی برادران، رئیس احمد جعفری، محمد علی اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۳ء

(۶) علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، سید محمد میاں، کتب خانہ فخریہ امروہہ گیٹ، مراد آباد،

(۷) علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز، نسیم قریشی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۰ء
(۸) علامہ حمید الدین فراہی — ایک عظیم محقق، عنایت اللہ سبحانی، مکتبۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۷۰ء
(۹) علامہ اقبال — مصلح قرآن آخر، علی شریعتی، اردو ترجمہ کبیر احمد جائسی
(۱۰) عزیزان ندوہ کے نام، رشید احمد صدیقی

(غ)

(۱) غدر کے چند علماء، مفتی انتظام اللہ شہابی، مکتبہ ادب دہلی
(۲) غدر کی صبح و شام، روزنامچہ منشی جیون لال، ترجمہ ضیاء الدین برنی، مارچ ۱۹۲۶ء

(ف)

(۱) فرنگیوں کا جال، علامہ امداد صابری، امداد صابری پبلشرز، چوڑی والان دہلی، جنوری ۱۹۴۰ء
(۲) فتاوی رشیدیہ جلد اول، رشید احمد گنگوہی، قرآن محل کراچی

(ق)

(۱) قاموس القرآن، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مکتبہ علمیہ دفتر الحرام قاضی منزل میرٹھ، ۱۹۵۴ء
(۲) قرآن کریم بتفسیر عثمانی
(۳) قیصر التواریخ جلد دوم، سید کمال الدین حیدر، ۱۸۹۶ء
(۴) قومی تہذیب کا مسئلہ، سید عابد حسین

(ک)

(۱) کالا پانی، مولوی محمد جعفر تھانیسری، سنگ میل لاہور، ۱۹۶۱ء
(۲) کابل میں سات سال، مولانا عبید اللہ سندھی، سندھ ساگر اکاڈمی لاہور، اکتوبر ۱۹۵۵ء

(گ)

(۱) گفتار اقبال، (مرتبہ) محمد رفیق افضل لاہور ۱۹۶۹ء

(م)

(۱) مسلمانوں کا عروج و زوال، سعید احمد اکبر آبادی، ندوۃ المصنفین دہلی، طبع دوم ۱۹۴۷ء
(۲) موج کوثر، شیخ محمد اکرام، طبع دوم، فیروز سنز لاہور ۱۹۵۸ء

(۳) مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی۔ ترجمہ مولوی قاضی عالم الدین، اللجنۃ العلمیہ حیدر آباد

(۴) مکتوبات حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی، اردو ترجمہ قاضی احمد عبد الصمد، ادارہ معارف اسلامیہ، کراچی

(۵) مکاتیب شاہ اسماعیل شہید

(۶) مسلمانوں کا روشن مستقبل، مولوی سید طفیل احمد منگلوری۔ طبع سوم، نظامی پریس بدایوں، سنہ ۱۹۴۰ء

(۷) محمد علی —— ذاتی ڈائری کے چند ورق، عبد الماجد دریا بادی، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء

(۸) مولانا محمد علی —— شخصیت اور خدمات، نظر برنی

(۹) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۱۰) ماہنامہ فکر و نظر اسلام آباد

(۱۱) مجلہ الجامعۃ السلفیہ بنارس کا مؤتمر الدعوۃ والتعلیم نمبر، اکتوبر ۱۹۸۱ء

(۱۲) مقالات شیروانی، حبیب الرحمٰن شیروانی، ۱۹۴۶ء شیروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ

(۱۳) مضامین جمال الدین افغانی، ترجمہ عبد القدوس ہاشمی، ادارہ فروغ اردو لاہور

(۱۴) مجموعہ فتاویٰ مولانا عبد الحیٔ باب العلم والعلماء جلد سوم

(۱۵) مولانا عبید اللہ سندھی، پروفیسر محمد سرور، سندھ ساگر اکادمی لاہور

(۱۶) مولانا سندھی کے افکار و خیالات پر ایک نظر، مولانا مسعود عالم ندوی، مکتبہ دین و دانش بانکی پور پٹنہ

(۱۷) مضامین اربعہ، مولانا شبلی نعمانی

(۱۸) مسدس، مولانا حالی، طبع اول

(۱۹) مقدمہ شعر و شاعری، مولانا حالی

(۲۰) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، محمد عمران خاں ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ

(۲۱) مقالات الہلال، ادبستان لاہور ۱۹۵۵ء

(۲۲) مضامین ابو الکلام آزاد، مرتبہ ثناء اللہ خاں، لاہور

(۲۳) ملفوظات مولانا محمد الیاس، مولانا محمد منظور نعمانی، مکتبہ الفرقان، بریلی، یوپی

(۲۴) مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، سید ابوالحسن علی ندوی، کتب خانہ الفرقان لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۴ء

(۲۵) ماہنامہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۳۶ء

(۲۶) مسئلہ قومیت، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی دہلی، جنوری ۱۹۷۹ء

(۲۷) ماہنامہ الحسنات کا عظیم اسلامی تحریک نمبر، سالنامہ ۱۹۷۵ء

(۲۸) مسلم ثقافت ہندوستان میں، عبد المجید سالک، ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان ۱۹۵۷ء

(۲۹) مقالات شبلی، مولانا شبلی، دار المصنفین اعظم گڈھ

(ن)

(۱) نقش سیرت، مرتبہ نثار احمد ایم اے، ادارہ نقش تحریر کراچی، ستمبر ۱۹۶۸ء

(۲) نوائے آزادی بمبئی

(۳) نقش حیات، مولانا حسین احمد مدنی، الجمعیۃ بکڈپو، قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۹۵۴ء

(۴) نوائے مشرق، سعید احمد، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۸۳ء

(ہ)

(۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان، ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، اردو ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین، قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور ۱۹۵۵ء

(۲) ہندوستانی مسلمان، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۶۱ء

(۳) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، دار المصنفین اعظم گڑھ

(۴) ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء

(۵) ہندوستان کے عہد کے مسلمانوں کے تمدنی کارنامے، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۳ء

(۶) ہندوستان کے عہد کے مسلمانوں کے تمدنی جلوے، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، دار المصنفین اعظم گڈھ ۱۹۶۳ء

(۷) ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۴۴ء

(و)

(۱) وقائع سیر و سیاحت، ڈاکٹر برنیر جلد دوم

(ی)

(۱) یادِ ایام (تاریخ گجرات) سید عبدالحی حسنی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

فارسی

(۱) سیر الاولیاء، امیر خورد، مؤسسہ انتشارات اسلامی لاہور ۱۹۷۸ء

(۲) مآثر الکرام، غلام علی آزاد بلگرامی، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ۱۹۱۳ء

(۳) سیر الاقطاب، ھدیہ چشتی العثمانی، نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۳ء

(۴) سیر العارفین، حامد بن فضل اللہ جمالی، مطبع رضوی دہلی ۱۳۱۱ھ

(۵) فوائد الفواد، امیر حسن علاء سنجری لاہور ۱۹۶۶ء

(۶) تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی

(۷) المکاتیب والرسائل، شیخ عبدالحق، محدث دہلوی

(۸) مدارج النبوۃ جلد اول، عبدالحق محدث دہلوی، فخر المطابع دہلی ۱۹۶۹ء

(۹) مرج البحرین، عبدالحق محدث دہلوی

(۱۰) اشعۃ اللمعات جلد اول، عبدالحق محدث دہلوی

(۱۱) عجائب الاسفار، مولانا غلام علی سرور جلد دوم

(۱۲) ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، شاہ ولی اللہ دہلوی

(۱۳) مصفیٰ، شاہ ولی اللہ دہلوی

عربی

(۱) فتوح البلدان، ابو العباس احمد بن یحییٰ البلاذری، دار النشر للجامعیین ۱۹۵۷ء

(۲) الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند، عبدالحی حسنی، المجمع العلمی العربی، دمشق ۱۹۵۸ء

(۳) التفہیمات الالٰہیۃ جلد اول و دوم، شاہ ولی اللہ دہلوی، مدینہ برقی پریس بجنور، ۱۹۳۶ء

(۴) نزہۃ الخواطر، عبدالحی حسنی، الجزء السابع، مطبع مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۹۵۹ء

(۵) الامعان فی اقسام القرآن، المعلم حمید الدین الفراہی

(۶) حجۃ اللہ البالغۃ، شاہ ولی اللہ دہلوی، دار الکتب الحدیثہ القاہرہ

انگریزی

ENGLISH

1. Great Guru Nanak and the Muslims by N. D. Ahuja, Kirti Pubiishing House, Chandigarh.
2. Article Mahdi Movements, Encyclopedia of Religion and Ethics. Vol. VIII, 1964.
3. Articles, Khaksar & Fraidi, Encyclopedia of Islam New Edition Vol. 11 & IV by Lewis, C. H. Pettal and J. Schacht.
4. The Political Thought of Sir Sayyed Ahmad Khan By H. K. Sherwani, Islamic culture July 1944.
5. Islam in Bengal by J. N. Sarkar, Patna Prakashan Calcutta 1972.
6. British Policy and Muslims in Bengal 1757 – 1856 By Azizur Rehman Mallick, Asiatic Society of Pakistan Dacca Muslim Buildings, Dacca 1961.
7. Muslim Community in Bengal 1884-1912, Sufia Ahmad, Oxford University Press Bangladesh 1974.
8. Sir Sayyed—A Political Beography by Shan Mohammad, Meenakashi Prakashan Meerut 1969.
9. Saiyed Ahmad Shahid by Mohiuddin Ahmad, Islamic Research and Publications Lucknow 1975.
10. Weekly Radiance Vol. III No. 24. 24 Sep. 1963.
11. Studies in Islam Vol. VI No. 1, Jan. 1969.
12. The spirit of Khaksar Movement by Agha Saiyed Ghazanfar Ali Shah F. No. 74/4/1940.
13. Thoughts and Reflections of Iqbal by S. A. Waheed Sk. Mohd. Ashraf Lahore 1964.
14. The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam by Mohd. Iqbal. Sk. Mohammad Ashraf Lahore 1971.

15 Quaide Azam Jinnah's correspondence by Sharifuddin Peerzada, Guild Publishing House Karachi-1966.

16. Speeches and statements of Iqbal, Almanar Acedemy Lahore, 1944.

17. Kabir Beography and Philosophy, R. K. Verma Prints India New Delhi, 1977.

18. Kabir-The Apostle of Hindu-Muslim Unity by Mohammed Hidayetullah. MotiLal Banarsi Das Delhi-1977.

19. Khaksar Movement in India, Shan Mohammad, Meenakshi Prakashan Meerut 1973

انتساب

جبل پور (مدھیہ پردیش) کے اس گمنام کارکن کے نام جو دن میں ٹھیلے پر سبزی بیچتا پھرتا ہے اور رات میں واپس آکر تحریک اسلامی کا کام کرتا ہے، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

"نیک متقی اور چھپ کر رہنے والے لوگ جو غائب ہو جائیں تو ان کی تلاش نہ ہو اور اگر موجود ہوں تو پہچانے نہ جائیں۔"

عبید اللہ فہد فلاحی